اطہر پرویز کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقالہ

برائے پی ایچ-ڈی

مقالہ نگار

عشرت لطیف

نگراں

ڈاکٹر محمد خالد سیف اللہ

شعبۂ اُردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲ (انڈیا)

۲۰۲۲ء

مقدمہ

اردو زبان ہماری زندگی میں اس طرح شامل ہے جس طرح انسان کے جسم میں روح اور جس کے بغیر ہماری زندگی بے معنی ہے۔ روح نکل جائے تو انسان ختم ہو جاتا ہے۔ زمانہ حال میں ہمارے پاس روح تو ہے مگر بے چین ہے۔ کیوں کہ اردو کو اب ہم ضرورت اور خاص طور سے معاشی ضرورت کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے گزشتہ چند برسوں میں بعض نامور ادیب، شاعر، محقق اور نقاد ایسے ملے کہ جنہوں نے اردو زبان کو زندہ و تابندہ رکھنے میں اہم خدمات انجام دیں ہیں۔ چنانچہ ان نامور ادیبوں کی فہرست میں ایک نام ڈاکٹر اطہر پرویز کا بھی ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کی شخصیت کے کئی رنگ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف تو ان کی شناخت ایک ٹریڈ یونین لیڈر کی تھی اور وہ ایجوکیشن آفسر کے عہدے پر بھی فائز رہے اور دوسری طرف وہ ادب کی دنیا میں ادیب، نقاد، محقق، مدیر اور مترجم نگار کی حیثیت سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ انہوں نے بچوں کے ادب کو سائنٹفک طرز بیان سے روشناس کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اکثر و بیشتر اصناف ادب پر طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے، علمی، ادبی اور سائنسی مضامین بھی لکھے ہیں۔ سائنس کے اہم موضوعات پر بھی انہوں نے بعض قابل قدر کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن پر حکومت ہند کی طرف سے انہیں متعدد انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ مثلاً ''نجومی آپا'' ''گلیلی گلیلیو'' ''مصنوعی چاند'' ''خلا کا سفر'' ''ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے'' ''توانائی کا راز'' ''ادب کا مطالعہ'' ''انمول رتن'' ''ہمارا ہندوستان'' ''بچوں کی معلومات'' ''جانوروں اور پودوں کی دنیا'' ''توانائی کا راز'' ''چالس ڈارون'' ''اوڈیسی اور

فاطمہ کی بکری‘‘ وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن پر حکومت ہند کی طرف سے انہیں انعام ملا۔

اطہر پرویز نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ بچوں کے پر تجسس ذہن کے لیے انہوں نے طرح طرح کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ’’خوابوں کی حقیقت‘‘ ’’مرغی چور‘‘ ’’جیسے کو تیسا‘‘ ’’شیخ جی منت مانی‘‘ ’’بے گھڑی کا دن‘‘ ’’نیکی اور سچائی‘‘ ’’تین عالم ایک ملاح‘‘ ’’چالاک شہزادہ‘‘ ’’ایک تھے نجومی‘‘ ’’خالہ بلی‘‘ ایماندار لکڑ اہارا‘‘ ’’دو دوست‘‘ ’’تین کچھوے‘‘ ’’چینی بچوں کا تھیٹر‘‘ وغیرہ قابل ذکر کہانیاں ہیں جو ’’پیام تعلیم‘‘ کے مختلف شائع ہوتے رہے ہیں۔

بچوں کے بہتر اخلاق اور ان کی تربیت کی غرض سے اطہر پرویز نے اخلاقی، علمی، ادبی اور معلوماتی مضامین بھی لکھے جیسے ’’ہندوستان ریلوے کی کہانی‘‘ ’’کابل‘‘ ’’تبت کے رسم ورواج‘‘ ’’لکھنے پڑھنے کی کہانی‘‘ ’’اقوام متحدہ‘‘ ’’ہنگری کے بچے‘‘ ’’انڈونیشیا کی کچھ رسمیں‘‘ ’’فاہیان کا سفر‘‘ ’’چائے‘‘ ’’ننھے منے پودے‘‘ وغیرہ اہم معلوماتی مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً رسالہ پیام تعلیم مین شائع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کی تحریروں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے مزاج رجحانات طبع، دلچسپیٔ احساس اور جذبات کے بڑے نباض ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات میں بچوں کے ساتھ ہنستے ہنساتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھیلوں میں شریک نظر آتے ہیں اور بچوں کو اپنی تخلیقات کے ذریعے عجائبات عالم کی سیر کے ساتھ جدید سائنسی انکشافات کی تعلیم بھی فراہم کی ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے صرف صحت مند ادب ہی نہیں تخلیق کیا بلکہ بچوں کے ادب کے مسائل اور ضروریات پر بھی خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ اس سلسلے میں دو کتابیں لکھیں۔ ’’ادب کا مطالعہ‘‘ اور ’’ادب کسے کہتے ہیں‘‘ یہ دونوں ان کی ایسی اہم کتابیں ہیں۔ جن میں ادب کے بنیادی عناصر، اصناف، جیسے ڈرامہ، شاعری، نثر، افسانوی ادب، فنون لطیفہ وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ ’’نجومی آپا‘‘ ان کی منفرد کتاب ہے جس میں آسان زبان میں جغرافیہ کی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اور ’’پودوں اور جانوروں کی دنیا‘‘ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جو حیاتیات (Biology) سے عام فہم زبان میں متعارف کراتی ہے۔ ’’چارلس ڈارون‘‘ میں ڈارون اور اس کے نظریے سے متعارف

کرایا گیا ہے۔ ''جادو کے کھیل''، مصنوعی چاند'' ''خلا کا سفر'' اور ''گلیلی گلیلیو'' وغیرہ سائنسی موضوعات پر دلچسپ اور کار آمد کتابیں ہیں۔

دوسری زبانوں کے ادب سے اردو میں ترجمہ کا عام رواج ہے۔ اس سے ہمارے ذخیرۂ ادب میں اضافہ ہوتا ہے وہیں ہماری معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے بھی مختلف زبانوں سے کہانیاں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ ان میں ''دیس دیس کی کہانیوں'' سومناتھ درکی کہانیاں'' جیسی کرنی ویسی بھرنی'' اور درزی اور جن کی کہانی'' شیکسپیئر کا ڈرامہ'' وینس کا سوداگر'' ''فاطمہ کی بکری'' ''ہمارا ہندوستان'' ''شیر خوار بچہ'' جو کہ کوریا کی ایک لوک کتھا ہے اور ''پنچ تنتر کی کہانیاں'' وغیرہ قابل ذکر ترجمے ہیں۔

اطہر پرویز ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے بحیثیت ناقد، مدیر اور مرتب بھی اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ داستان اور حکایت گوئی کے موضوع سے بھی ان کو خاص دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف فسانہ عجائب سے متعلق ایک کتاب ''فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ'' لکھ کر اس کا اظہار کیا۔ بلکہ داستان کے فن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا۔ انہوں نے اردو فکشن کی مشہور شخصیات کرشن چندر، بیدی و منٹو کے نمائندہ افسانوں کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اور ان پر اپنی ناقدانہ صلاحیت و قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اور بحیثیت مرتب بھی انہوں نے اپنے نمایاں نقش ثبت کیے ہیں ان کے منتخب افسانوں کے ذریعہ زندگی کے حقائق کی تفہیم میں کافی مدد ملتی ہے اور ہم زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' کے عنوان سے پریم چند سے لے کر سلام بن رزاق تک بیس عظیم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب پیش کیا ہے اس کے علاوہ ''اردو کے تیرہ افسانے'' کے عنوان سے جو انتخاب ہے وہ بھی غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔

اطہر پرویز صاحب نے اپنی شخصیت کو یہیں تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ تادم حیات خاکے، انشائیہ اور یادوں پر مبنی تحریریں لکھتے رہے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر کی یادوں سے متعلق ایک مقبول ترین کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' اور ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' ان یادوں پر مبنی مضامین کا ایک اہم مجموعہ

ہے۔ جو علی گڑھ، موریشس اور ناگپور سے متعلق یادوں پر منحصر ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کے ان کارناموں کا اب تک کوئی معروضی مطالعہ سامنے نہیں آیا ہے۔ اسی کے پیش نظر تحقیقی مقالے کا موضوع ''ڈاکٹر اطہر پرویز کی ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' منتخب کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل: ان کی حالات زندگی پر مبنی ہے اس میں ڈاکٹر اطہر پرویز کی مکمل زندگی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ان کے خاندان اور پیدائش سے لیے کر تعلیم تربیت کیسے ہوئی کس طرح سیاست میں قدم رکھا، اور سیاست داں ہونے کی وجہ سے جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اور ادبی دنیا میں معلم اور ادیب کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی۔ چنانچہ ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

باب دوم: میں اطہر پرویز کی تعلیمی وتدریسی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں پرویز صاحب نے بحیثیت معلم جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ اور موریشس میں جو تدریسی خدمات انجام دیں ان خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ انہیں قوم کے نونہالوں سے بہت محبت تھی ان کی تعلیم وترتیب کے لیے اور اردو زبان کے فروغ کے لیے ہمیشہ فکرمند رہے۔ اسی لیے علی گڑھ میں ذاکر حسین ماڈل پبلک اسکول بنوایا۔ اور موریشس میں ''دی گاندھی انسٹی ٹیوٹ'' قائم کروایا۔ اور وہاں اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں کے لوگ انہیں بابائے اردو کے لقب سے آج بھی یاد کرتے ہیں۔

باب سوم: **کا موضوع** اطہر پرویز بحیثیت بچوں کے ادیب ہے جس کا آغاز بچوں کے ادب کی تعریف، چوں کہ بچوں کا ادب تحریر کرنے کے لیے بچوں کی عمر ونفسیات وغیرہ سے مکمل آگاہی لازمی ہے اسی لیے ماہر نفسیات نے بچوں کی عمر کو کتنے حصوں میں منقسم کیا ہے، اس پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں مختلف موضوعات سے متعلق ۲۵ کتابوں اور ان کے مشمولات پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ باب چھ ذیلی عنوانات کے تحت منقسم کیا گیا ہے جس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

ا۔ اطہر پرویز کی سائنسی طرز کی تحریریں: اس حصے میں پرویز صاحب کی سائنس سے متعلق آٹھ

کتابوں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔مثلاً ''نجومی آپا'' ''پودوں اور جانوروں کی دنیا'' ''ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے'''' خلا کا سفر'' ''ایورسٹ کی فتح'' ''چارلس ڈارون'' اور ''بچوں کی معلومات وغیرہ

۲۔تراجم: اس حصے میں ترجمہ کی اہمیت پر مدلل روشنی ڈالتے ہوئے اطہر پرویز کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔مثلاً ''دیس دیس کی کہانیاں'' ''ہمارے بن ہماری دولت'' ''فاطمہ کی بکری'' ''ہمارا ہندستان'' ''نیا تیرتھ'' ''ہمارا گھرانا'' ''ہمارا ذہن'' ''پنچ تنتر کی کہانیاں'' نیز ''پیام تعلیم'' میں جوان کی ترجمہ کی ہوئی کہانیاں وقتاً فوقتاً شائع ہوئی ہیں ان کا بھی مفصل بیان کیا گیا ہے۔جن میں شامل کہانیاں ''انوکھا تحفہ'' ''مفت کی روٹی'' ''آئینہ کی کہانی'' وغیرہ اہم کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۳۔داستانوی طرز کی تحریریں: سائنسی اور معلوماتی کتابوں کے علاوہ اطہر پرویز نے قدیم کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ قصوں پر مشتمل بعض کتابیں تحریر کیں ہیں۔جیسا کہ ''ایک دن کا باشاہ'' ''مشینی گھوڑا'' اور ''ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ'' وغیرہ کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کتابوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ داستانوی رنگ میں رچی ہونے کے باوجود یہ بچوں میں سائنسی فکر کو اجاگر کرتی ہیں۔

۴۔ڈرامے: اطہر پرویز نے کہانیاں ،مضامین اور سائنسی کتابوں کے علاوہ بچوں کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں ان ڈراموں میں بچوں کی افتاد طبع اور فطری رجحانات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔اور بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے مکالمے پیش کیے گے ہیں جو آسان اور عام فہم ہیں انہوں نے اپنے ڈراموں میں ماورائی اور تخیلی باتیں کرنے کے بجائے روزہ مرہ کے مسائل اور سائنسی دانوں کی کاوشوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔لیکن وہ اتنی خوبصورتی سے واقعات کا تابابانا بنتے ہیں کہ کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔اس حصے میں ان کے مشہور ڈرامے ''گلیلی گلیلیو'' شرابی'''' چراغ سے چراغ جلتا ہے'' اور ''محلے کی ہولی'' وغیرہ کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔

۵۔متفرق ادبی تحریریں: اطہر پرویز نے بچوں کی ہر نہج پر تربیت کی کوشش کی ہے۔ان کی تحریریں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور شگفتگی سے بھرپور ہوتی ہیں انہوں نے بچوں کی نفسیاتی ضرورت ،دلچسپی

اور ذہنی استعداد کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تخلیقات تحریر کیں ۔انھیں اپنے ماضی سے شدید محبت ہے خاص طور پر اس تہذیب سے جسے وہ اپنے اسلاف کا روشہ سمجھ کر نئی نسل تک پہنچانا چاہتے تھے اس حوالے سے انہوں نے سوانح عمریاں اور خاکے بھی بچوں کے لیے تخلیق کیے ہیں ۔اور اس میں انہوں نے اعتدال کو برقرار رکھا ہے بعض مذہبی عظیم شخصیتوں سے متعلق واقعات کو کہانی کی شکل میں بچوں کی سیرت سازی کی غرض سے پیش کی گئی ہیں ۔جن میں شامل حضرت علی کا انصاف ، باپو کے قدموں میں ،انمول رتن ،محمد شفیع الدین نیّر اور جونپور کا قاضی''اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کی بعض درسی کتابیں بھی تحریر کی ہیں ۔''استاد کی کتاب''(دوجلد)''اردو کی نئی کتاب'' اور''اردو کی پہلی کتاب'' اس میں بچوں کو حروف تہجی کی مختلف اشکال کے حوالے سے بچوں کو معلومات فراہم کی گئی ہے تاکہ وہ اردو زبان کی بنیادی تعلیم سے آگاہ ہوسکیں اس کے علاوہ اردو زبان کے صحیح تلفظ ،لفظوں کی ساخت ،لفظوں کو جوڑنا وغیرہ کے بارے میں بچوں کو مشق کروائی گئی ہے ۔ان کی ان تمام کاوشوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

۶۔انتخابات : اطہر پرویز نے اردو کے کلاسیکی سرمائے ادب کو بچوں کی ضرورت کے پیش نظر آسان و سہل اور عام فہم زبان میں ازسرنو ترتیب دیا ہے۔انہوں نے اردو کے نامور ادیبوں وشعراء کے سوانحی حالات اور ان کی نظموں ،کہانیوں سے بچوں کو واقف کروایا ہے اس ضمن میں ''بچوں کے اقبال'' ''بچوں کے حالی'' ''بچوں کے نظیر'' ''خلا کا سفر'' ''بچوں کی معلومات'' ''اکبراور بیربل کے لطیفے'' وغیرہ کتابیں شامل ہیں۔

باب چہارم : میں داستان کی تنقید کے حوالے سے بات کی گئی ہے ۔ پرویز صاحب کی کتاب'' داستان کا فن'' سے ماقبل داستان کی تنقید پر جو کتابیں لکھی گئیں ۔ان کا مختصر تذکرے کے بعد اطہر پرویز کی کتاب'' داستان کا فن'' کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ساتھ ہی پرویز صاحب کی دوسری مشہور ومعروف کتاب''ادب کا مطالعہ'' کو بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب کو سولہ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔جس میں ادب کی اکثر اصناف پر بات کی گئی ہے ۔ادب کے ادق مسئلے کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے ۔زیر نظر کتاب کے موضوع کو سہل اور آسان طریقے پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ۔ادق مسئلے کو آسان

مثال سے واضح کر دینا، اس کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں فنون لطیفہ، ادبیات، شاعری، نثر، داستان گوئی، ناول اور افسانے وانشائیہ پر زبردست کلام ہوا ہے۔ گویا ان ابواب کے تحت ادب کی تمام اصناف پر تنقیدی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان ابواب کے بعد ضمیمہ کے تحت چند ادبی نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ جس عنوان پر بھی بحث کی گئی ہے اس کے تحت ذیلی عنوان لگا کر متلاشی کے لیے آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ کتاب کا مطالعہ اردو ادب کے اصناف وتنوع کو عیاں کرتا ہے۔

باب پنجم: میں اطہر پرویز کو بحیثیت مدون، مرتب اور مدیر جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس باب کو بھی تین ضمنی عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے۔

۱۔ اطہر پرویز بحیثیت مدوّن: اس حصے میں اردو کی مشہور داستان ''فسانہ عجائب'' اور ''قصہ حاتم طائی'' کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ اطہر پرویز بحیثیت مرتب: اس حصے میں اطہر پرویز کی ترتیب دی ہوئی پانچ کتابوں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ جیسا کہ ''منٹو اور ان کے نمائندہ افسانے'' ''راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے'' اور ''کرشن چندر اور ان کے افسانے'' ''اردو کے تیرہ افسانے'' اور ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' وغیرہ کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ اطہر پرویز بحیثیت مدیر: اس حصے میں اطہر پرویز کو مدیر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جس کے تحت ''الفاظ'' اور ''پیام تعلیم'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ششم: میں ان کی دو معروف کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو ان کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہیں جن کا تعلق یادوں سے ہے۔ اس باب کے دو حصے ہیں ابتدائی حصے میں memoir ''یادیں'' کی تعریف میں اردو ادب کے بعض ادیبوں اور خاص کر انگریزی ادیبوں کی آراء کو پیش کیا گیا ہے چوں کہ اردو ادب میں اکثر نثری اصناف انگریزی ادب کے زیر اثر وجود میں آئی ہیں۔ اور اردو ادب میں اب تک جو بھی کتابیں صنفِ ''یادیں'' کے تحت شمار کی جاسکتیں ہیں۔ مثلاً ''آواز دوست'' ''حرف شوق'' ''یادوں کی برات'' ''جواب

دوست‘‘ ’’یادوں کے چراغ‘‘یادوں کے سائے‘‘ ’’یادوں کے جھروکے‘‘ ’’یادوں کے چراغ‘‘ ’’ جرمنی میں نصف صدی‘‘ ’’یادوں کی کہکشاں‘‘ ’’یادوں کے راہ گزر‘‘ ’’یادوں کا ردیچہ‘‘اور سرسید اولڈ بوائز خصوصی شمارہ وغیرہ کتب کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔اوراس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ’’یادیں‘‘ بطور صنف کی کیا شعریات ہوسکتی ہیں اس پر روشنی ڈالی جائے۔دوسرے حصے میں اطہر پرویز کی دو کتابوں کا ’’علی گڑھ سے علی گڑھ تک‘‘ جو کہ نام سے ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی یادوں پر مبنی ہے کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔نیز ان کی دوسری تصنیف ’’چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو بہ‘‘ کا بھی فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

آخر میں محاکمہ کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔جس میں اس پورے مقالے کا حاصل پیش کیا گیا ہے۔اس طرح اس مقالے کی تکمیل ہوتی ہے۔اس میں حتی الامکان اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔اطہر پرویز کا تخلیقی سفر بہت ثمر آفریں رہا۔انہوں نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزاری۔اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ ابواب کے سارے مباحث کا اجمالی خاکہ پیش کیا جائے۔جس سے اطہر پرویز کی ادبی خدمات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔پرویز صاحب کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد مقالے کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے،اور جن کے حوالے مقالے میں دیے گئے ہیں نیز ایسی کتابیں بھی جن کے حوالے شامل نہیں کیے گئے لیکن دوران تحقیق جن کا مطالعہ اس غرض سے کیا گیا ان کی فہرست آخر میں کتابیات کے تحت درج کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کی ذاتی زندگی سے متعلق ان کی چھوٹی بیٹی شیلاں پرویز سے فون کے ذریعہ معلومات اخذ کی گئی اور ان کی بڑی صاحبزادی پروفیسر سیما پرویز صاحبہ جو کہ فائن آرٹس ڈپارٹمنٹ کی صدر شعبہ بھی رہ چکی ہیں ان سے انٹرویوز بھی لیے گئے۔اس سلسلے میں کئی بار ان کے گھر جانا ہوا جو کہ سرسید نگر میں رہتی ہیں۔پہلا انٹرویو ۱۲ جولائی ۲۰۱۹ء کو لیا گیا۔بعض سوالات کا جواب انہوں نے لکھ کر بھی راقمہ کو دیا۔اس کے بعد ۱۰ نومبر ۲۰۱۹ء کو دوسرا انٹرویو لیا گیا۔سیما میم صورت وسیرت دونوں اعتبار سے بے حد نفیس خاتون ہیں میں جب بھی ان کے گھر گئی انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔اطہر پرویز کی زندگی کے کئی قصے انہوں نے مجھے سنائے جن میں

بعض کا ذکر میں نے اس مقالے میں بھی کیا ہے اور بعض کو حذف کر دیا کیوں کہ وہ دلچسپ تو تھے مگر معرض تحریر میں نہیں لائے جا سکتے تھے۔اس کے بعد چوں کہ (covid-19) جیسے وبائی مرض و مہاماری نے پورے عالمی سطح پر اپنے اثرات بکھیر نے شروع کیے تو اکثر ان سے فون سے ہی بات ہوتی تھی۔اس سلسلے میں ابوالکلام قاسمی صاحب مرحوم، صغیر افراہیم صاحب، راحت ابرار صاحب طارق چھتاری صاحب اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک اسد یار خاں صاحب وغیرہ حضرات سے مختلف اوقات میں انٹر یوز لیے گئے۔مذکورہ حضرات کا شمار ڈاکٹر اطہر پرویز کے شاگردوں میں ہوتا تھا۔نیز صابر گودڑوی صاحب سے بھی فون پر اکثر اس سلسلے میں بات ہوئی۔ان سے راقمہ کی پہلی ملاقات علی گڑھ مسلم یونورسٹی کے شعبہ اُردو میں ۲۰۱۸ء میں ہوئی۔دراصل وہ کسی پروگرام میں شرکت کے غرض سے اپنی شریک حیات کے ہمراہ علی گڑھ آئے ہوئے تھے انہوں موریشس میں اردو کی صورتحال پر گفتگو کے دوران موریشس کے بابائے اردو (ڈاکٹر اطہر پرویز کا) کے کارناموں کا ذکر کیا اور ان کا شاگرد ہونے کی حیثیت سے فخر کا اظہار کیا۔اسی پروگرام کے اختتام پر راقمہ کو ان سے ملاقات کا موقعہ میسر ہوا۔میں نے ان کو بتایا کہ میں ڈاکٹر اطہر پرویز پر ریسرچ کر رہی ہوں یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔پھر اکثر ان سے فون کے زریعے ہی بات ہوتی رہی۔جس کی وجہ سے مجھے اطہر پرویز کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوئی۔لہذا ان تمام حضرات کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ بالخصوص سابق شعبۂ صدرِ اردو پروفیسر صغیر افراہیم کا اور اسد یار خاں صاحب کا انہوں نے مجھے الفاظ کے بہت سے شمارے جو کہیں دستیاب نہیں تھے اپنے ذاتی کلکشن سے دیئے۔بالآخر ان تمام انٹر یوز سے اس مقالے میں استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اس کے لیے میں بارگاہِ رب العزت میں سر بہ سجود ہوں کہ اس نے اپنی بے پایاں رحمتوں سے اس مشکل کام کو میرے لیے ممکن بنا دیا۔جس نے بنی نوع میں ہر شے کا شعور پیدا کیا۔اور یہی شعور سینہ بہ سینہ اور قلم بہ قلم منتقل ہوتا رہتا ہے۔بالالفاظ دیگر انسان علمی ذخیرے میں اضافہ کرتا رہتا ہے اسی علم کی وجہ سے کاغذ اور قلم کی تقدیس ہوئی یہی بولے ہوئے لفظ آئیندہ آنے والی نسلوں کے لیے علم ودانش کے خزانے میں محفوظ ہوتے جاتے ہیں۔پس اپنے رب کریم کی ان تمام نوازشات وکرامات کی بے حد ممنوں ہوں۔

یہ تحقیقی کام شفیق استاد ڈاکٹر محمد خالد سیف اللہ کی نگرانی میں تکمیل پایا ہے۔ اپنے استاد محترم کے لیے میرا دل تشکر واحسان کے جذبات سے لبریز ہے کہ انہوں نے اول تا آخر قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ موضوع مواد سے لے کر زبان و بیان تک ہر چیز کو بہ غور دیکھا اور مفید مشوروں سے نوازا جزاء اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

میں مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے تمام مشفق ومکرم اساتذۂ کرام کی بھی دل کی عمیق گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ ان کے علمی فیوض کو میں نے اپنے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنایا ہے۔

اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میری آنکھیں اشکبار ہورہی ہیں۔ کیوں کہ کرونا وائرس (covid-19) جیسی وبائی مرض نے ہم سے نہ جانے کتنے قیمتی گوہر چھین لیے ہیں میں شعبہ اردو کے سابق صدر جناب پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب کی تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے لیکن آنکھیں اشکبار ہیں کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں اور میں بے حد مشکور ہوں شعبہ اردو کی ایک اور علمی شخصیت کی جو اپنے لاثانی علم ومرتبت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے لیکن افسوس کہ اب وہ بھی ہمارے بیچ نہیں ہیں جن کا نام پروفیسر ابوکلام قاسمی تھا ان کے مفید مشورے اور حوصلہ افزائی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور شعبہ اردو کی دوسری علمی شخصیت پروفیسر مولا بخش کا لیکن افسوس کہ اب وہ بھی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ میں شکریہ ادا کرتی ہوں پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب کا جنہوں نے وقتاً فوقتاً میری رہنمائی کی ہے اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ۔ پروفیسر طارق چھتاری صاحب اور پروفیسر صغیر افراہیم کا بھی بیحد شکریہ جنہوں نے مجھے مواد جمع کرنے میں مدد کی اور مفید مشورے دیے۔ میں صمیم قلب سے شعبہ اردو کے چیئر مین پروفیسر محمد علی جوہر کی ممنون ومشکر ہوں کہ انہوں نے مقالہ کی سپردگی کے ہر مرحلے میں میرے ساتھ شفقت کا سلوک کیا۔ مزید یہ کہ شعبہ کے تمام اساتذہ کرام بالخصوص پروفیسر شہاب الدین ثاقب، پروفیسر سراج اجملی ، پروفیسر قمر والہدیٰ فریدی کا شکریہ ڈپارٹمنٹ کے لائبرین جناب جاوید بھائی کی بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے کتابیں فراہم کرنے میں مدد کی اور سمینار انچارج عرفان بھائی ،عبدالرحمان بھائی اور مولانا آزاد لائبریری میں خاص طور پر مصوّر بی بی آپا کا اور ریحان بھائی، محسن بھائی، باقر بھائی، ان تمام حضرات کا شکریہ جن کی مدد سے مجھے

مواد کی فراہمی میں آسانی ہوئی۔

میں شکر گزر رہی ہوں اپنے مشفق والدین عبدالطیف ڈار صاحب اور والدہ سلیمہ بیگم کی جن کی محبتوں اور مشوروں نے مجھے کبھی ہارنے نہیں دیا۔ آج میں ان دونوں کے خواب کو پورا کر رہی ہوں جو ان کی ہی دعاؤں سے پائے تکمیل کو پہنچا۔ اپنے بڑے بھائی نصیر احمد ڈار کا جنہوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا میری رہنمائی کی اور مجھے حوصلہ دیا ہے۔ اور اپنے چھوٹے بھائی نجم الثاقب ڈار کا جس نے چھوٹے ہونے کے باوجود مجھے بہت محبت حوصلہ اور بے پناہ پیار دیا ہے۔ اور اپنی چھوٹی بہن زاہدہ لطیف کا جس نے ہمیشہ میری معاونت کی اور ہر مشکل گھڑی میں سائے کے مانند میرے ساتھ دیا ہے جس کی محبتوں اور دعاؤں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا ہے ۔ میں اللہ رب العزت کی تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے محبت سے بھرا گھر نوازا ہے جو کہ دنیا میں میرے لیے جنت کی مانند ہے۔ اور خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے ان کی توقعات پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کو سلامتی کی زندگی عطا فرمائے (آمین)

اس مقالے کی تکمیل کے دوران جن مخلصین نے میری حوصلہ افزائی کی یا کسی طرح کا علمی تعاون کیا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ تاہم ان میں میری سینئر ثناء عارف جن سے ایم۔اے کے دوران رابطہ ہوا اور تب سے ہی اپنے قیمتی آراء سے نوازتی رہیں ہیں اب وہ اے۔ ایم۔ یو ڈسٹنس ایجوکیشن میں بطور ریڈر درسی خدمات انجام دے رہی ہیں انہوں نے اس مقالے کے آخری باب میں مواد جمع کرنے میں میری بہت مدد کی ہے۔ ان کی تہ دل سے شکرادا کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ میری سنیئرس ثناء وارث، رقیہ احسن، نصرت محی الدین ،روبینہ محی الدین ، خالدہ وغیرہ کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا ہے۔ بعض عزیز دوستوں کا ساتھ بھی ملا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے وہ ابھی تک ساتھ ہیں صائمہ خانم بی۔اے سال اول میں میری روم میٹ تھی اور میرے دل کے سب سے قریب جس نے زندگی کی ہر مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دیا۔ اور اب تک ہمارا ساتھ قائم ہے میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے بہت ہی پیاری دوست عطا کی۔ اور صائمہ احمد کا جس کا حوصلہ اور محبت مجھے کبھی گرنے نہیں دیتا۔ صائمہ احمد سے میرا

رشتہ بہن کی طرح رہا ہے کبھی کھٹا کبھی میٹھا اس کے علاوہ شازیہ بانو، نگہت امین، اسماء خاتون، سنجیدہ پروین، صومی اسلام، نور افشاں، رفعت چودھری، ذکریٰ، نائلہ حسین، فردوس چودھری، ہما ملک، مریم جمیلہ، راضیہ رحمٰن، راحلہ پروین اثریٰ عتیق الرحمٰن، اختر النساء، عظمت، صباء الرحمان، مہر فاطمہ، عشرہ اپی، تزین فاطمہ، شفاء، شادماں، شاہینہ کمال، زریں قمر اور نکہت سراج ان کی بے پناہ محبتیں نے گھر والوں کی کمی کو کبھی محسوس نہیں ہونے دیا۔ اور از حد عزیزہ شفاء مریم کی جس کی محبتیں نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ اور اپنے ہم جماعت ساتھیوں میں سید محمد ظفر اقبال، عامل رحمانی اور وقار احمد صدیقی صاحب کا جنھوں نے مجھے وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے نوازا ہے اور میری رہنمائی کی ہے۔ اور دہلی یونیورسٹی کے اعجاز بھائی جنھوں نے رسائل بھیجنے میں میری مدد کی۔ میرے چچازاد بھائیوں میں حمید بھائی، امجد بھائی، شعبان بھائی اور محمد رفیع ڈار نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے۔ جوئنیرز میں انیسہ بشیر، سکینہ، لطیفہ، طیبہ بانو، شفیلہ بانو، اور خاص طور پر ریحانہ حسن کا ریحانہ کا ساتھ بچپن سے رہا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے آخری مرحلے میں بھی اس نے بہت ساتھ دیا۔ چوں کہ کورنا وائرس کی وجہ سے ہوسٹل بند ہونے کے سبب پراوئیٹ ہوسٹل میں کچھ عرصہ رہنا پڑا۔ جہاں کی زندگی بامقابل ہوسٹل کے بہت مشکل تھی ان مشکل لمحات میں ریحانہ حسن نے میرا بہت ساتھ دیا اللہ اجرِ خیر عطا کرے آمین۔ اور ہر اس ہستی کی شکر گزار ہوں جس کی دعائیں اس سفر میں میرے ہمراہ رہیں اور جن کے الفاظ مجھے روشنی دکھاتے رہے۔

عشرت لطیف ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، (یوپی)

تلخیص

ڈاکٹر اطہر پرویز اردو کے ممتاز ادیب، محقق، ناقد، مترجم، مرتب اور اعلیٰ پائے کے انشاء پرداز تھے۔ ان کے علاوہ ان کی شناخت ایک ماہر تعلیم اور فعال سیاست داں کے بطور بھی تھی۔ تصنیفی خدمات کے ساتھ ساتھ وہ بہترین مدرس بھی رہے ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے مگر اس دوران متعدد بار موری شس جا کر کہیں کہیں سال تک اردو زبان وادب کی تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ موری شس میں تقریباً دو سو سال سے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اس لیے وہاں ہندوستان کی متعدد زبانوں سے واقفیت اور ان کی تعلیم و تدریس کا نظام ہنوز قائم ہے۔ وہاں اردو کو ثانوی زبان کے طور پر بولنے اور اردو زبان وادب کو زندہ رکھنے والے افراد بھی بہت بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے وہاں ابتدائی اور ثانوی سطح پر تعلیم و تدریس کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ان کے زمانے میں ہی ایک لسانی تحریک کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا اور آج تک اطہر پرویز کو لوگ وہاں بابائے اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور تھا۔ اور غدر کے بعد ان کے آباء اجداد ہجرت کر کے الہ آباد آ گئے۔ اور یہیں ۱۹۲۵ء میں اطہر پرویز پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم الہ آباد میں ہی حاصل کی۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک ناگپور میں بھی رہے جہاں سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا اور پانچ سال تک ناگپور میں ہی ایک بے باک لیڈر کی طرح اپنی ذمہ داریاں سنبھالتے رہے۔ لیکن بعض وجوہ کی بناء پر سیاست سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ملازمت کی۔ نوکری کے ساتھ ساتھ وہاں بچوں کے مقبول رسالہ ''پیام تعلیم'' کے ایڈیٹر بھی رہے اور چھ سال تک بہت ہی خوش اسلوبی سے ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد میں علی گڑھ اور موریشس میں بھی

ملازمت کی۔اوراردو کے دوماہی رسالہ ''الفاظ'' کے بھی ایڈیٹر رہے یہ رسالہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے نکلتا تھا۔اس رسالہ کے لیےانہوں نے بہت محنت اورشوق سے کام کیااوراس کو بہت مقبول بنایا۔

ڈاکٹر اطہر پرویز نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ملازمت اور'' پیام تعلیم'' کی ادارت کے دوران ہی لکھنا شروع کیا۔انہوں نے ٦۵ کتابیں تحریریں کی ہیں جن میں بعض ان کی ذاتی تخلیق ہیں بعض ترتیب وتدوین کی ہوئی اور بعض ترجمہ کی ہوئی ہیں۔گرچہ انہوں نے اردو ادب کی اکثر وبیشتر اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا خاص میدان ادب اطفال ہی رہا ہے۔انہوں نے اردو کے ننھے قارئین کو دستوری ورسمی قصے کہانیوں سے آزاد کرکے ایک نئے طرز بیان سے روشناس کیا ہے۔ان کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے بچوں کو سائنس،ٹکنالوجی،اخلاقیات،حب الوطنی اورقومی یکجہتی جیسے موضوعات کو آسان اورعافہم انداز میں پیش کیا ہے تا کہ ہر طبقے کے گوں ان تحریروں کو سمجھ سکیں اوران سے مستفید ہوسکیں۔

اطہر پرویز بچوں کے محسن، ہمدرداورغمگسار تھے۔ان کے نزدیک ملک وقوم کا اصل سرمایہ بچے ہی تھے چوں کہ ملک وقوم کا روشن مستقبل بچوں سے ہی وابستہ ہوتا ہےاورادب ہی وہ اہم آلہ ہے جس سے ہم اس عظیم سرمایے کی بہترین تعلیم وتربیت اورصحیح نہج پرنگداشت کرسکتے ہیں۔ان کے نزدیک ادب ایک ایسا عنصر ہے جو بچوں میں بچپن سے ہی شجاعت پسندی ، جررت مندی،منصفانہ سلوک اورمجاہدانہ زندگی گزارنا سکھا تا ہے تا کہ بچے اپنے آنے والے مستقبل کے چیلنجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکیں۔انہوں نے سائنٹفک طریقہ کار اپناتے ہوئے بچوں کے ذہنی نشوونما کے لیے دلکش اسلوب اورسادہ وسلیس زبان میں کتابیں تخلیق کی ہیں۔

اطہر پرویز اپنی تحریروں کے ذریعے بچوں کواعتماد نفس،ہوشیاری،سلیقہ شعاری،حق وباطل میں فرق کرنا ،اخلاقیات،انسانی مساوات اور مذہبی رواداری کا درس دیتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ادب بچوں کو جہالت ،غفلت اورتوہم پرستی سے دوررکھ کران میں مستقل مزاجی اورقوت عمل پیدا کرسکتا ہے ساتھ ہی ماضی اورحال کے احوال سے واقف کرواتے ہوئے مستقبل کا عکس دکھاتا ہے جیسا کہ انہوں نے اپنی معروف تصنیف ''ادب کسے کہتے ہیں'' میں اپنے خیال کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے کہ:

> ''ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے
> کے حالات کو بہترین لفظوں میں ، بہترین ترتیب کے

ساتھ محفوظ کر لیتا ہے۔ اس میں سچ پوچھیے تو اپنے
زمانے کے نہ صرف بہترین خیالات، الفاظ، اور ترتیب
ہوتی ہے بلکہ اس میں اپنے زمانے کی سچی روح ہوتی
ہے''

یوں تو اطہر پرویز نے گونا گوں موضوعات پر کہانیاں، مضامین اور کتابیں تحریر کیں، لیکن ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ تمام اسکولوں خاص طور پر اردو میڈیم میں سائنسی فکر وشعور کو بیدار کیا جائے تا کہ لوگ شعر وادب اور زبان پر مبنی کتابوں کے ساتھ ساتھ سائنس، علم طب، علم نجوم اور سماجی علوم کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی اپنی مادری زبان میں کر سکیں۔ بچوں اور سائنس میں مماثلت تجسس ہے سائنسی نقطۂ نظر کسی اصول کو اسی شکل میں قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے پس پشت ان وجوہات کو جاننے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ واقعات رونما ہوئے ہیں ٹھیک اس طرح بچے بھی جب اپنے گرد ونواح کے مناظر کو دیکھتے ہیں تو کیا؟ کیسے؟ کیوں؟ جیسے سوالات ان کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ جب تک صحیح جواب معلوم نہ کر لیں وہ بے چین رہتے ہیں سائنسی علم ہی بچوں کو صحیح جواب دے کر ان کی بے چینی کو دور کرتا ہے۔ اور انہیں توہم پرستی کا شکار ہونے سے بچاتا ہے لہذا ضروری ہے کہ بچوں میں سائنسی فکر وشعور پیدا کیا جائے۔ اور انہیں معلوماتی کتب بھی مہیا کی جائیں لیکن اردو ادب اطفال میں معلوماتی اور سائنسی موضوعات کے حوالے سے کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انھیں اس کمی کا شدت سے احساس تھا۔ انہوں نے اپنی معروف کتاب ''بچوں کی معلومات'' میں اس بات کا شکوہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''ہماری زبان میں معلومات اور سائنس کی کتابوں پر
بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے لیے
قصے کہانیوں کی کتابیں تو کافی تعداد میں مل جاتی
ہیں لیکن ایسی کتابیں جس سے بچوں کی معلومات میں
اضافہ ہو بہت کم پائی جاتی ہیں۔ تعلیم کا مقصد لکھنا پڑھنا
ہی نہیں ہے بلکہ انسان کو زندہ رہنے کے آداب بھی سکھا

نا ہے۔ ہمارے ملک میں توہم پرستی عام ہے۔ اس کی
وجہ بھی یہی ہے کہ اول تو تعلیم ہی بہت تھوڑی ہے اور جو
لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے ہیں وہ بھی اپنی تعلیم کو صرف
زبان جاننے تک محدود رکھتے ہیں۔ اسی لیے ضروری
ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اس بات کا خیال رکھا جائے کی
زبان سکھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو دنیا کے بارے
میں بھی کچھ بتایا جائے۔''

اطہر پرویز نے اردو بچوں میں سائنسی رو جحان کو پیدا کرنے کے غرض سے اردو ادب اطفال میں سائنس کے مختلف النوع موضوعات پر کتابیں تحریر کیں ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے ''نجومی آپا'' ''پودوں اور جانوروں کی دنیا'' ''توانائی کا راز'' ''ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے'' ''گلیلی گلیلیو'' ''ایٹم کیا ہے'' ''خلا کا سفر'' ''مصنوعی چاند'' ''چارلس ڈارون'' ''جادو کے کھیل'' اور ''بچوں کی معلومات'' جیسی گراں قدر تصنیفات سے اردو قارئین کو نوازا جو نا قابل فراموش معلوماتی خزانہ ہیں۔ جسے اردو ادب اطفال میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہ کتابیں نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ نوجوانوں کی معلوماتی اضافے کے لیے بھی اہم ذریعہ ہیں انہیں مذکورہ بالا تمام تر تصنیفات پر حکومت ہند کی طرف سے انعامات سے نوازا گیا ہے۔

اطہر پرویز نے اردو ادب اطفال کو سائنٹفک اسلوب کے علاوہ قدیم کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ قصوں کہانیوں پر مشتمل بعض کتابیں بھی تخلیق کی ہیں جو مکمل داستانوی طرز تحریر میں رچی ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں ''ایک دن کا بادشاہ'' ''ایک نائی اور رنگساز کا قصہ'' اور ''مشینی گھوڑا'' اہم ہیں لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ داستانوی رنگ کے باوجود یہ کتابیں بچوں میں سائنسی فکر کو اجاگر کرتی ہیں۔ یہ کتابیں ترقی اردو بورڈ کے زیر اہتمام منظر عام پر آئیں۔ معلم پیشہ ہونے کے سبب موصوف کو بچوں کی نفسیات کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ روایتی لوک کتھاؤں اور قدیم داستانوں کے مطالعہ سے بچہ کس طرح محظوظ ہوتا ہے۔ اور وہ خود بھی اس قدیم سرمائے ادب کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اسی نظریے کے تحت وہ ''ایک دن کے بادشاہ'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''بہت سے ناسمجھ ماں باپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی
طرح اپنے دس سال کے بچوں کو سقراط اور ارسطو بنا دیں
انھیں علم وحکمت کی ساری باتیں سکھا دیں۔لیکن اصل
بات یہ ہے کہ وہ عمر تاریخ پڑھنے کی نہیں ہے زندگی کی
کھردری سچائیوں سے الجھنے کی نہیں ہوتی۔اس عمر میں
بچوں کو خواب دیکھنے دیجیے۔جنوں اور پریوں کے خواب
ہواؤں میں اڑتے ہوئے گھوڑوں اور بولتے ہوئے
پرندوں کے خواب ان کے تصور کو اس عمر میں جتنی اڑان
بھی مل سکے،اُڑنے دیجیے۔اس طرح آپ کو بچوں کو
بچہ رہنے میں مدد دیں گے۔بچوں سے ان کا بچپن چھیننا
بُری بات ہے''

ان قصوں کی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں ہندوستان،ایران،اعراق،عرب اور مصر ان تمام ممالکوں کی تہذیب وثقافت،رسم ورواج،موجود ہیں جن کو پڑھ کر بچے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان قصے کہانیوں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے ہیرو اکثر وبیشتر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں،ان کردوراں کی یہ مستقل مزاجی دیکھ کر بچے مایوسی اور ناکامی کا شکار ہونے سے بچتے ہیں،اور ان کو پڑھ کر زندگی میں جدوجہد کرنا سیکھتے ہیں۔اور جب یہ کردار اپنے مقصد کو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو بچے بھی ان کی کامیابی سے خوش ہوتے ہیں۔روایتی قصے کہانیوں کی اہمیت وافادیت پر ایک اور جگہ مختصر گفتگو کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ:

''ان قصوں میں خواب تو ملیں گے،لیکن ان میں زندگی
کی بڑی بڑی حقیقتیں بھی نظر آئیں گی۔ان کے ذریعہ ہم
زندگی میں جدوجہد کرنا سیکھتے ہیں۔یہ مایوسی اور ناکامی
کے برخلاف عمل پر زور دیتی ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اگر

انسان اپنی دُھن کا پکا ہوتو اس کے راستے کا ہر روڑا اپنے
آپ ہٹ جاتا ہے، ہوائیں اس کو اپنے کندھوں پر اٹھا
لیتی ہیں، سمندروں میں اس کے لیے راستے بن جاتے
ہیں اسی انسان کو جنگلی جانور تک راستہ دکھاتے ہیں اور
زمین اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتی ہے ۔ان
داستانوں کے ذریعے بچے سچائی سے آشنا ہوتے ہیں وہ
درد مندی سیکھتے ہیں ۔پریوں کا حسن 'اُن کے اندر
خوبصورتی کا اعلیٰ ترین معیار پیش کرتا ہے۔''

''مشینی گھوڑ'' اطہر پرویز کی تخیلاتی نوعیت کی کتاب ہے۔ مشینی گھوڑا میں بظاہر اردو کی قدیم داستانوں کی طرح ہی مافوق الفطرت واقعات اور تخیل کی کارفرمائی سے کام لیا گیا ہے۔لیکن اس کے پس پشت بچوں میں سائنسی شعور کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ دورِ جدید میں بچہ مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کی بہ نسبت نئی نئی ایجادات اور خلائی معلومات میں زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے اب وہ بے بنیاد باتوں پر یقین کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔سائنسی تحریریں جہاں بچوں کو جدید سائنسی معلومات فراہم کرتی ہے وہیں انہیں خلائی مہمات، سیر وسیاحت اور اس نوع کے دلچسپ موضوعات پر تازہ بہ تازہ معلومات بھی فراہم کرتی ہیں۔تخیلاتی اڑن کھٹولہ اب پرانی چیز ہوگئی ہے اب بچے خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔کہانی ''مشینی گھوڑا'' کا آغاز ایک کاریگر کے بنائے ہوئے مشینی گھوڑے سے ہوتا ہے۔کاریگر گھوڑے کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور اس کی خوبیوں کا بھی ذکر کرتا ہے کاریگر گھوڑے کا تعارف ان الفاظ میں کرواتا ہے کہ:

'' کاریگر نے کہا۔'' عالیجاہ! آپ کا بول بالا ہو یہ گھوڑا
لکڑی کا تو ہے لیکن یہ معمولی گھوڑا نہیں ہے۔اس کے
اندر ایک مشین لگی ہوئی ہے، جس میں چھوٹے بڑے نہ
جانے کتنے کل پُرزے لگے ہیں کہ ان کو چھونے سے گھوڑا

ہوا میں اُڑنے لگتا ہے، اور پل بھر میں سوار کو کہیں سے
کہیں لے جاتا ہے''

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازا ہوتا ہے کہ اطہر پرویز نے بچوں کو نئے زمانے کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے بچوں میں سائنسی (ایجاد سے واقف کروانا) فکر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کیوں کہ پہلے کی کہانیوں میں گھوڑا جن یا جادو کی مدد سے چلتا تھا لیکن یہاں انہوں نے مشین کا لفظ استعمال کر کے یہ بارو کرایا ہے کہ اب انسان نے کافی ترقی کر لی ہے گھوڑے کو ہوا میں اُڑنے کے لیے جن یا جادو کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اب انسان گھوڑے کو ہوا میں اُڑانے کا ہنر جانتا ہے۔

اطہر پرویز نے کہانیاں، مضامین اور سائنسی کتابوں کے علاوہ بچوں کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان ڈراموں میں بچوں کی افتادہ طبع اور فطری رجحانات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اور بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے مکالمے پیش کیے گئے ہیں جو آسان اور عام فہم ہیں۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں ماورائی اور تخیلی باتیں بیان کرنے کے بجائے روزہ مرہ کے مسائل اور سائنس دانوں کی کاوشوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور وہ اتنی خوبصورتی سے واقعات کا تابابانا بنتے ہیں کہ کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ ''گلیلی گلیلیو'' ''شرابی'' ''چراغ سے چراغ جلتا ہے'' اور ''محلے کی ہولی'' یہ ڈرامے ان کی فنی کمالات کا بہترین ثبوت دیتے ہیں۔

''گلیلی گلیلیو'' اطہر پرویز کا بہت مقبول سائنسی نوعیت کا ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے میں فرسودہ عقائد اور توہم پرستی پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ گلیلیو ایک اطالوی ماہر فلکیات اور مشہور فلسفی تھے۔ انہوں نے سائنسی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے وہ شاقول اور دربین کے نامور موجد ہیں۔ گلیلیو انے اشیاء کی حرکات، دربین، فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔ انہیں جدید طبیعیات کا فادر (باپ) کہا جاتا ہے۔ مذکورہ ڈرامہ میں انہوں نے مشہور سائنس دان گلیلی گلیلیو کے نظریے اور کاوشوں سے بچوں کو آگاہ کیا ہے کہ سائنس داں کس طرح کڑی محنت کے بعد پرانے نظریے کو رد کرتے ہوئے دنیا والوں کو نئی سوچ سے آگاہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ گلیلیو نے کیا دراصل صدیوں سے یہی تصور عام تھا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے لیکن سترھویں صدی میں گلیلیو نے یہ ثابت کر دیا کہ سورج نہیں بلکہ زمین ہی سورج کے

چاروں طرف گردش کرتی رہتی ہے۔لیکن ان کی یہ نئی تلاش قدامت پسندوں کے لیے عقیدہ شکنی کا سبب بنی وہ عتاب کا شکار ہوا اور انہیں اپنے نظریے کی تبلیغ کرنے سے منع کر دیا گیا۔

اطہر پرویز کا یہ ڈرامہ ''گلیلی گلیلیو'' اردو سائنسی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔موصوف نے پرانی تکنیک کا استعمال کر کے اردو ڈراموں میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔اصل میں سنسکرت ڈراموں میں نٹی اور سوتر دھار کردار سے کام لیا جاتا تھا۔اوران کرداروں کی خوبی یہ تھی کہ ایسی بہت سی باتیں جنہیں ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کرتے وقت بیان کرنا مشکل ہوتا تھا یہ کردار راوی کی طرح ان باتوں کو اپنی گفتگو کے ذریعے بیان کر دیتے تھے۔مذکورہ ڈرامہ ایک ہی ایکٹ پر مبنی ہے گرچہ اس میں دو منظر ہے لیکن مصنف نے اسی پرانی تکنیک کا استعمال کر کے ڈرامے کو ایک ہی منظر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور یہی ڈرامے کی خاصیت ہے۔

اطہر پرویز نے بچوں کی ہر نہج پہ تربیت کی کوشش کی ہے۔ان کی تحریریں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور شگفتگی سے بھرپور ہوتی ہیں۔انھوں نے بچوں کی نفسیاتی ضرورت، دلچسپی اور ذہنی استعداد کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تخلیقات تحریر کیں۔انھیں اپنے ماضی سے شدید محبت ہے خاص طور پر اس تہذیب سے جسے وہ اپنے اسلاف کا روشہ سمجھ کر نئی نسل تک پہنچنا چاہتے تھے اس حوالے سے انہوں نے سوانح عمریاں اور خاکے بھی بچوں کے لیے تخلیق کیے ہیں۔اور اس میں انہوں نے اعتدال کو برقرار رکھا ہے بعض مذہبی عظیم شخصیتوں سے متعلق واقعات کو کہانی کی شکل میں بچوں کی سیرت سازی کی غرض سے پیش کی ہیں۔جن میں شامل ''حضرت علی کا انصاف'' ''باپو کے قدموں میں'' ''انمول رتن'' ''بچوں کے اقبال'' ''بچوں کے نظیر'' ''بچوں کے حالی'' ''محمد شفیع الدین نیّر'' اور ''جونپور کا قاضی'' وغیرہ شامل ہیں ''جونپور کا قاضی'' یہ ہندوستان کی لوک کہانی ہے۔یہ ایک بیوقوف کی کہانی ہے جو اپنے گدھے کو انسان بنانے کے لیے کوشاں ہے اور اس کام کے لیے وہ مولوی صاحب کو پیسے بھی دیتا ہے لیکن جب گدھا انسان بنتا ہے تو پھر اسے اپنی اصل پر لانے کے لیے دوبارہ مولوی صاحب کو پیسے دیتا ہے مولوی صاحب بخوشی معاوضہ قبول کرتے ہیں۔

اطہر پرویز نے اردو ادب کے نامور شعراء نظیر اکبر آبادیؔ، الطاف حسین حالیؔ، اسماعیل میرٹھیؔ، ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ اور چکبستؔ وغیرہ کی دلچسپ اور آسان نظموں کو از سر نو ترتیب دے کر ننھے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے تاکہ بچے با آسانی ان نظموں کا مطالعہ کر سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں۔کیوں کہ ان شعراء نے

بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔اور ادب اطفال میں اپنی پیش قیمت نظموں کی پیشکش سے بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ان شعراء کو بچوں کے مستقبل سے غیر معمولی دلچسپی تھی بچوں کی صحیح نہج پر تربیت اور صحیح ذہن سازی ان کا خاص مطمح نظر رہا تھا۔اس حوالے سے اطہر پرویز نے بچوں کے نظیر، بچوں کے حالی، بچوں کے اقبال، بچوں کے اسماعیل، بچوں کے چکبست وغیرہ کتابیں ترتیب دی ہیں۔

اطہر پرویز کو داستان اور حکایت گوئی کے موضوع سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے چنانچہ انہوں نے نہ صرف فسانہ عجائب سے متعلق ایک کتاب ''فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ'' اور ''قصہ حاتم طائی'' لکھ کر اس کا اظہار کیا۔ بلکہ داستان کے فن پر پی۔ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا۔انہوں نے فارسی ادب کے علاوہ اردو ادب میں بھی ایم۔اے کیا ہے اور اردو میں ہی تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔جب انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کا تقرر بحیثیت لکچرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہو گیا تھا۔لہذا انہوں نے بحیثیت استاد (Teacher candidate) امیدوار کے اس مقالے کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو مکمل کیا۔ایسی صورت میں مقالہ نگار کا عام طور پر کوئی نگراں نہیں ہوتا۔اور یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

اردو ادب میں داستانیں تہذیبی وثقافتی اقدار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی ۔حالانکہ ابتدا میں داستانوں کے مطالعے کو ذہنی واخلاقی صحت کے لیے مضر سمجھا گیا تھا۔لیکن گذشتہ چند سالوں میں تنقیدی رویوں میں تبدیلیوں کے باعث داستانوں کے مطالعے کی افادیت واہمیت واضح ہوئی ہے۔یہی سبب ہے کہ مختلف محققین وناقدین نے داستانوں کا فنی اور موضوعاتی مطالعہ کرتے ہوئے ،اس کے محاسن ومعائب بیان کیے ہیں ۔جن کے مطالعے سے قارئین اردو کی قدیم داستانوں کے اسلوب ،موضوعات اور معاشرتی زندگی سے واقف کرانے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔زیر نظر کتاب ''داستان کا فن'' کا شمار بھی انہی کتب میں ہوتا ہے۔

اطہر پرویز ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے بحیثیت ناقد، مدیر اور مرتب بھی اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔انہوں نے اردو فکشن کی مشہور شخصیات کرشن چندر، بیدی ومنٹو کے نمائندہ

افسانوں کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اور ان پر اپنی ناقدانہ صلاحیت و قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اور بحیثیت مرتب بھی انہوں نے اپنے نمایاں نقش ثبت کیے ہیں ان کے منتخب افسانوں کے ذریعہ زندگی کے حقائق کی تفہیم میں کافی مدد ملتی ہے اور ہم زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' کے عنوان سے پریم چند سے لے کر سلام بن رزاق تک بیس عظیم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب پیش کیا ہے اس کے علاوہ ''اردو کے تیرہ افسانے'' کے عنوان سے جو انتخاب ہے وہ بھی غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔ نیز اردو کی مشہور داستان ''فسانۂ عجائب'' اور ''قصہ حاتم طائی'' کو تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت تدوین کیا ہے۔

اطہر پرویز صاحب نے اپنی شخصیت کو یہیں تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ تادم حیات خاکے، انشائیہ اور یادوں پر مبنی تحریریں لکھتے رہے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر کی یادوں سے متعلق ایک مقبول ترین کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' اور ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' ان یادوں پر مبنی مضامین کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ جو علی گڑھ، موری شس اور ناگپور سے متعلق یادوں پر مبنی ہیں۔

اس جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے گرچہ پرویز صاحب نے اردو ادب کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن اردو ادب اطفال ان کا خاص میدان رہا ہے کہ ڈاکٹر اطہر پرویز نے اپنی تخلیقات میں تعقّل، کشادہ نظری اور انسان دوستی کا ایسا نظریۂ حیات پیش کیا جو بچوں اور نو جوانوں کو اس دور ترقی میں خود اعتمادی کے ساتھ زندہ رہنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ انہوں نے سائنس کے نو بنو موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر اردو زبان میں لکھنا آسان نہ تھا۔ لیکن انہوں نے اس ناممکن کو ممکن بنایا۔ اور اردو داں بچوں اور نابالغوں کے لیے نہایت ہی آسان اور عام فہم اسلوب نگارش میں مشکل سے مشکل موضوع کو تحریر کر کے ادرو ادب اطفال کو اور اردو ادب کو اپنی قیمتی تحریروں سے مالا مال کیا۔ ان کی تحریریں جدید معلومات کا خزانہ ہیں جو کہ آنے والی نسل نوع کے لیے بہت مفید معلومات فراہم کرتی ہیں۔ بلاشبہ اطہر پرویز کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہے۔

طہر پرویز کی یہ تخلیقی تحریریں صرف بچوں کی معلومات کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے بھی ایک بہترین معلوماتی تحفہ ہیں پس یہی وجہ ہے کہ اطہر پرویز کی شخصیت اردو ادب میں انفرادیت کے لباس میں ملبوس نظر آتی ہے کیوں کہ انہوں نے جہاں ادب اطفال میں دلچسپ کہانیوں کا ذخیرہ

اپنے فنی کمالات سے پیش کیا ہے وہیں بچوں کی معلومات میں اضافے کے لیے سائنسی نقطہ نظر کی بنیادی معلومات سے بھی واقف کروانے کے لیے اہم تخلیقات پیش کی ہیں جو انہیں ادب اطفال کی دنیا میں دوسرے ادیبوں و تخلیق کاروں سے الگ کرتی ہیں۔ اوران کا علمی وادبی سرمایہ ہمارے اردو زبان وادب کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔

فہرست

باب اول

اطہر پرویز کی مختصر سوانحی حالات

(الف) خاندان، ولادت، شخصیت کی تعمیر، حلیہ، عادتیں، تعلیم

(ب) علی گڑھ میں آمد

(د) اساتذہ واحباب

(ج) سیاست

ناگپور میں عملی سیاست میں حصہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک

قید فرنگ

شادی

وفات

خاندان:

اطہر پرویز کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا جو کہ مشترکہ تہذیب کا گہوارہ تھا۔ ان کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور تھا ان کے اجداد کا شمار سیوہارہ کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اطہر پرویز کے آباء و اجداد نے سیوہارہ کو الوداع کہہ کر الہ آباد میں مستقل رہائش اختیار کی۔ الہ آباد میں یحیٰ پور ایک بڑا محلّہ تھا اس کا ایک ضمنی محلّہ تھا جسے مینا پور بھی کہتے تھے وہیں پر بلوا گھاٹ روڈ پر بانس منڈی میں ستی چورہ کے پاس وہ رہتے تھے یہ محلے پچاس ساٹھ پیرزادوں کے مکانات پر مبنی تھا۔ دراصل ان گھرانوں کا تعلق مانک پور کے قدیم خاندانوں سے تھا اس محلے کو شہر کے لوگ ''حکیم بادشاہ،، بھی کہتے تھے دراصل مینا پور میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے اور ان کی حکمت کے دور دور تک چرچے تھے ان کی شہرت کی وجہ سے شہر کے لوگوں نے حکیم صاحب کو ''حکیم بادشاہ'' کا خطاب دیا تھا اسی لیے مینا پور حکیم بادشاہ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اطہر پرویز خود اپنے وطن الہ آباد کی تعریف اپنے ایک مضمون ''ایک پل جو ٹوٹ گیا'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''الہ آباد گنگا اور جمنا کا سنگم ہے۔ یہاں ہندو مسلمان مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں اردو اور ہندی آ کر گلے ملتے ہیں۔ یہ نرالا اور فراق کا شہر ہے۔ یہاں اکبر اعظم کا بنایا ہوا قلعہ ہے۔ جو سنگم کے سامنے اسی آب و تاب سے کھڑا ہے۔ یہیں اکبر الہ آبادی نے شعروں سے لوگوں کے دلوں کو جیتا تھا۔ یہ موتی لال نہرو اور جواہر لعل کا الہ آباد ہے۔ اردو کے ایک بڑے محسن سر تیج بہادر کا شہر ہے۔ یہ الہ آباد سچ پوچھو تو اللہ کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ دور سے لوگ آتے ہیں اور یہاں آ کر بس جاتے ہیں۔''[۱]

اطہر پرویز کے دادا کا نام افضل حسین اور دادی کا نام سلمہ بیگم تھا افضل حسین کا شمار ضلع سیوہارہ کے شرفاء میں تو ہوتا ہی تھا۔ اور الہ آباد میں مستقل رہائش اختیار کرنے کے بعد ان کے رعب و دبدبہ عزت و شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ وہ ویسے ہی باقی رہی اس کی خاص وجہ یہ تھی وہ تعلیم یافتہ شخصیت کے مالک تھے ان کے علم کی پورے مینا پور میں دھاک تھی۔ انہوں نے سن ۱۸۸۰ء میں بی۔ اے کیا تھا غالباً وہ اس ضلع کے پہلے

۱۔ چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، میں مشمولہ مضمون، ایک پل جو ٹوٹ گیا، ص ۴۹

گریجویٹ تھے، دوسری خاص وجہ ان کی ملازمت تھی۔افضل حسین محکمے پولیس میں ملازم تھے لیکن بہت ہی دیانتداراور حق پسند تھےان کی ایمانداری کے طفیل ہندو مسلم دونوں ہی فرقوں کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔اوراحتراماً انہیں لوگ میر صاحب کہتے تھے۔جیسا کہ:

''ہمارے دادا کی اس مینار پور میں بڑی مان تھی۔انہیں لوگ میر صاحب کہتے تھے۔اور جب کوئی اجنبی وہاں سے پوچھتا کہ یہ کس کا لڑکا ہے تو محلے کا کوئی نہ کوئی آدمی بڑی محبت سے کہتا کہ آپ نہیں جانتے یہ بانس منڈی کے میر صاحب کا پوتا ہے۔''[۱]

افضال حسین نے کبھی رشوت نہیں لی۔وہ رشوت کو بہت برا سمجھتے تھے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا تعلق مولویوں اور قاضیوں کے خاندان سے تھا۔افضال حسین خود بھی اچھے اخلاق کے مالک تھے اور ایماندار تھے ان کے ایک قریبی دوست تھے ان کے متعلق یہ شہرہ عام تھا کہ وہ رشوت لیتے ہیں افضال حسین کا ان صاحب سے اکثر ملنا جلنا ہوتا تھا لیکن وہ ان کے گھر کی کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔اس واقعے کا ذکر اطہر پرویز نے اپنے مضمون ''ایک تہذیب ایک بستی'' میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''ان کی عزت کا ایک سبب یہ تھا کہ انہوں نے کبھی رشوت نہیں لی تھی۔اور ان کی ایمانداری کے دور دور تک چرچے تھے۔وہ رشوت کو برا سمجھتے تھے۔ اوران کے مزاج کی یہ خصوصیت اس حد تک بڑ گئی تھی کہ میناپور کے ایک صاحب سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ان کا ہر وقت ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا۔لیکن ان کے گھر کی کوئی چیز نہ کھاتے تھے۔ان کے لیے حکیم صاحب کے یہاں سے پان بن کر آتا تھا۔اور بات صرف اتنی تھی کہ وہ آب کاری کے محکمے میں انسپکٹر رہ چکے تھے۔اور کہتے ہیں کہ وہ رشوت بھی لیتے تھے۔ہماری دادی نے ہمیں زیرلب یہ بات بتائی تھی۔'' [۲]

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو بہ، ڈاکٹر اطہر پرویز، مشمولہ مضمون، ایک بستی ایک تہذیب، مرتب سیما پرویز، سن ۲۰۱۷ء ص:۱۱۸

[۲] مشمولہ مضمون، چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، ص، ۱۱۹

اطہر پرویز کے والد کا اسم گرامی محمد عمر تھا۔ محمد عمر کی شادی سیوہارہ کے ہی ایک معزز خاندان سے تعلق رکھنے والی خاتون حلیمہ بیگم سے ہوئی تھی۔ حلیمہ بیگم کے یہاں تین اولادیں پیدا ہوئیں۔ بڑے بیٹے کا نام محمد فاورق تھا، جن کا منڈلہ میں کاروبار تھا منڈلہ (مدھیہ پردیش) میں واقعہ ہے وہیں دریا نربدا[۱] میں ڈوب کر اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اور سب سے چھوٹے بیٹے کا نام محمد انیس تھا محمد انیس بہت بیمار رہتے تھے مسلسل بیماری کے سبب ۳۰/۳۵ سال کی عمر میں وہ بھی انتقال کر گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطہر پرویز کے دونوں بھائیوں کا انتقال بہت کم عمر میں ہی ہو گیا تھا محمد عمر کے منجھلے بیٹے کا نام محمد عثمان (اطہر پرویز) تھا لیکن ادبی دنیا کے لیے انہوں نے پریم چند کی طرح اپنے اصلی نام کو سیاسی وجوہ کی بناء پر چھوڑ کر فرضی نام اطہر پرویز اپنایا۔ بعد میں اسی فرضی نام سے انہیں شہرت نصیب ہوئی۔ اور اصلی نام (محمد عثمان[۳]) صرف ڈگریوں پر ہی باقی رہا۔

ولادت:

اطہر پرویز کا خاندان ہجرت کر کے الہ آباد آ گیا تھا۔ یہیں ۲۵ دسمبر کو ۱۹۲۵ء میں اطہر پرویز پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد عمر بہت مہمان نواز، انسانی خلیق، ہنس مکھ، ملنسار انسان، نہایت ہی درجہ حلیم اور منکسر مزاج شخص تھے۔ اطہر پرویز سے بہت محبت کرتے تھے ان کا بچپن بہت خوشگوار گزرا انہوں نے ایسے تعلیم یافتہ گھرانے میں پرورش پائی جو کہ ہندوستانی تہذیب، تمدن، روسم رواج اور ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ اس کی زندہ مثال اطہر پرویز کے دادا افضال حسین کی زندگی ہے اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہو تا ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنی مشہور تصنیف ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''بہت پرانی بات ہے۔ ہماری دادی سنایا کرتی تھیں۔ ہم الہ آباد میں رہتے تھے...... ہمارے پڑوس میں ایک لالہ جی رہتے تھے۔ ان کی ہمارے دادا سے بڑی گہری دوستی تھی۔ ایک بار نہ جانے کس سلسلے میں ہمارے یہاں دعوت ہوئی۔ ہندوؤں کے لیے الگ انتظام تھا اور مسلمانوں کے لیے الگ۔ لالہ کے لڑکے ہمارے چچا کے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ اور بڑے مزے میں گوشت کھانے

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، ڈاکٹر اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، ص:۹

لگے۔ ذرا سی دیر میں ہمارے دادا کی ان پر نظر پڑی۔ انہوں نے لپک کر ان کو پکڑ لیا اور تھپڑ جمایا۔ ''تم کو شرم نہیں آتی گوشت کھاتے ہو'' صاحبزادے چپ چاپ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ کھانا کھایا۔ میں نے دادی سے کہا انہوں نے ایسا کیوں کیا ؟۔ دادی نے کہا ایسا کیوں نہ کرتے ؟ اگر فرض کر لو تمہارے چچا کوئی حرام چیز کھائیں پئیں اور لالہ جی دیکھ لیں تو کیا پڑوسی اور دوست کے ناتے ان کا فرض نہیں ہے کہ تمہارے چچا کو سزا دیں۔ میں نے کہا لیکن گوشت تو کھانے کی چیز ہے؟ کہنے لگیں لیکن ہندوؤں کے یہاں گوشت کھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے پڑوسی کے رشتے سے ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم لالہ کی اولاد کا خیال رکھیں۔'' [۱]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آدمی کی شخصیت کی تشکیل میں اس کے خاندانی روایات کا کتنا اثر ہوتا ہے واضعداری، انسان دوستی، انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا جذبہ اطہر پرویز کو اپنے خاندان سے ورثے میں ملا۔ اور تا حیات ان کی شخصیت کا حصہ بنا رہا۔ شروع سے ہی ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اکثر ضرورت مند طالب علموں اور دوستوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہر محلے اور ہر گاؤں میں اسکول قائم کیا جائے تا کہ غریب سے غریب بچہ آسانی سے تعلیم حاصل کر سکے۔ انہوں نے علی گڑھ میں ایک اسکول ''ماڈل ہائر سکینڈری ذاکر حسین'' کے نام سے قائم بھی کیا۔ جس سے اب تک قوم کے نونہال تعلیمی زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔

شخصیت کی تعمیر:

شخصیت انسان کے ظاہری اور باطنی رویوں کے مجموعے کا نام ہے۔ شخصیت کا مطالعہ نفسیات کا سب سے پیچیدہ حصہ ہے۔ کسی بھی انسان کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا ظاہری وجود ہوتا ہے جس میں قد، سراپا، لباس، بال وغیرہ آتے ہیں۔ شخصیت کے ظاہری وجود کے ساتھ ساتھ اس کا باطنی وجود بھی ہوتا

---

[۱] علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ڈاکٹر اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ، اشاعت ثانی ۲۰۰۷ء، ص: ۱۰۷

ہے جس میں انسان کے احساسات وجذبات، اعمال وافکار، خیالات وتصورات، فہم وادراک، زاویۂ نظر وغیرہ شامل ہیں۔ اور شخصیت کے ارتقا میں باطنی محرکات ہی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کوئی انسان اگر خوبصورت ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ اچھی شخصیت کا مالک ہو۔ اور اسی طرح اگر کوئی انسان بدصورت ہے تو یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اچھی شخصیت کا مالک نہیں ہے۔

فن کار دوہری شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ ایک فنکار کی تخلیقی شخصیت ہوتی ہے اور دوسری غیر تخلیقی شخصیت ہوتی ہے۔ تخلیقی شخصیت جس کی معیاری ہوگی فن کارانہ شخصیت بھی اتنی ہی اعلیٰ ہوگی۔ فن کاری شخصیت منفرد بنانے میں کچھ اہم محرکات خود بخود شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً جس علاقے سے فن کار کا تعلق ہے وہاں کی آب وہوا، گھر، تہذیبی پس منظر، سماجی اور سیاسی فضا اور اس کے علاوہ نفسیاتی سطح پر بہت سے جانے انجانے اثرات جو شعوری اور غیر شعوری طور پر انسان کو متاثر کرتے ہیں۔ عادات واطوار میں نسلی وراثت بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔ عموماً ماں باپ کے خصائل اولاد کو ورثے میں ملتے ہیں۔ اس طرح ایک شخصیت تکمیل کے متعدد مراحل طے کرتی ہے۔ اور ایک کی شخصیت دوسرے سے الگ ہوتی ہے۔ شخصیت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے۔ لہذا یہاں پرویز صاحب کے خاندان اور ان کے بچپن کے بعض واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔

حلیہ:

قد چھوٹا، رنگ گورا، پیشانی چوڑی، ناک قدرے موٹی، دہانہ چھوٹا، ہونٹ موٹے اور باہر کو پھیلے ہوئے۔ ٹھوری اسی نسبت سے کسی قدر چھوٹی، کل ملا کر ان کا چہرہ دیکھنے میں بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر کی سنجیدگی اور سادگی ان کے چہرے پر منعکس ہوتی تھی۔

عادتیں:

چوڑی دار پاجامہ اور کھدّر کا کرتہ، پجامہ اور کھدّر کی بنڈی پہنتے تھے۔ عام طور پر لباس میں شیروانی، پینٹ شرٹ بھی پہنا کرتے تھے۔ موٹے فریم کا چشمہ لگاتے، وقت، رنگ، موسم اور جگہ کی مناسبت سے کپڑے

---

[1] محمد شفیع الدین نیّر، ڈاکٹر اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی، ص:۱۱

پہنتے تھے،سفید اور کریم ان کے پسندیدرنگ تھے،مچھلی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ان کی شخصیت کا ایک خاص وصف ان کی مہمان نوازی بھی تھی۔اکثر لوگ ان کی مہمانوازی کے مداح تھے۔یہاں علی گڑھ میں ہی طالب علمی کے زمانے میں سگریٹ پینے کی عادت پڑھ گی تھی،بعد میں جیل میں یہ عادت ترک کر دی تھی،پان بھی کھاتے تھے،چائے بہت شوق سے پیتے تھے۔خاص طور پر گُڑ کی چائے کے بہت شوقین تھے۔صبح میں چہل قدمی کرنے کی بھی عادت تھی۔اور رات میں بہت دیر تک پڑھتے تھے۔اور بچوں کو کہانی سنانا،قلم جمع کرنے کا بھی انہیں شوق تھا،مختلف قسم کے قلم بڑی احتیاط اور سلیقے سے ایک کیس میں رکھتے تھے۔وہ بہت خوش خط تھے۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس تھا۔اس حوالے سے بشیر حسین زیدی لکھتے ہیں کہ:

''وہ کام کو نہ صرف قرض بلکہ خود پر فرض سمجھتے اور انتہائی پابندی،ایمانداری، خلوص،لگن اور محنت کے ساتھ اس فرض کی ادائیگی میں منہمک رہتے'' [۱]

پرویز صاحب پان بھی کھاتے تھے یہ عادت ان کے چچا جان کی دین تھی۔اس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں اس طرح کیا ہے کہ:

''میں چھبیس ستائیس سال پہلے جامعہ میں تھا اس وقت نہ صدیقہ پان کھاتی تھیں اور نہ میں مہمان کی خاطر نئے زمانے کے اعتبار سے چائے سے ہوتی تھی۔ایک بار میرے چچا وہاں آئے۔ان کے لیے پاندان کا انتظام کیا گیا۔ہر چند کہ وہ بہت تھوڑے دنوں رہے لیکن انھوں نے جان بوجھ کر پان کھانے کی عادت ڈال دی۔اور ہدایت کی کہ یہ پاندان سرسبز رہے۔بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہمارے گھر سے کوئی سرخرو نہ نکلے۔چائے تو رہا سہا پان کا رنگ بھی صاف ہو جاتا ہے۔برگ سبز اتحفہ درویش۔چنانچہ وہ دن اور آج کا دن،یہ پان نہ صرف یہ کہ شمشاد تک پہنچا بلکہ یہ سمندر پار موری شس تک ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ دور دور سے لوگ ہمارے پان کی شہرت سن کر کھانے

---

[۱] علی گڑھ سے علی گڑھ تک،اطہر پرویز،اردو گھر،علی گڑھ،ص:۱

آتے ہیں ....مشہور شاعر جناب بیکل اتساہی جب پچھلے دنوں
موری شس تشریف لائے تھے تو پان کی طلب انھیں بار بار میرے گھر
کھینچ لایا کرتی تھی۔'' [1]

تعلیم:

اطہر پرویز کی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق روایتی انداز میں ہوئی۔ چار پانچ سال کی عمر میں ان کی بسم اللہ ہوئی۔ قاعدہ پڑھایا گیا اور گلستان و بوستان بھی۔ اس زمانے میں تعلیم کا اہم ستون شیخ سعدی کی معروف کتابیں گلستان و بوستان کو ہی مانا جاتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ مسلمان گھرانوں میں ہی یہ کتابیں مقبول عام تھیں۔ بلکہ ہندؤ گھرانوں میں بھی ان کتابوں کو بنیادی درجہ حاصل تھا وہ بھی اپنے بچوں کی تعلیم کا آغاز انھیں کتابوں سے کیا کرتے تھے۔ اطہر پرویز بھی ان کتابوں کی اہمیت سے واقف تھے نئے زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قدم بہ قدم ملا کر چلنے کے باوجود انہیں اپنے قدیم روئے سے بہت محبت تھی۔ اور اس بات پر فخر بھی محسوس کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے قدیم سرمائے ادب کو پڑھا ہے اور بذات خود اس کا اعتراف کرتے ہیں وہ اپنی معروف کتاب ''محمد شفیع الدین نیّر'' میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انہوں نے بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیّر پر لکھی تھی لکھتے ہیں کہ:

> ''میں شفیع الدین نیّر سے کہا کرتا تھا کہ میری ابتدائی تعلیم بھی ان کتابوں
> کے سہارے ہوئی۔ دراصل اس زمانے میں یہی بنیادی تعلیم کی کتابیں
> تھیں جنھوں نے برسوں مسلمان گھرانوں کے بچوں کی ذہنی تربیت بھی
> کی اور ان کے توسط سے انہوں نے اردو اور فارسی زبانوں کو سیکھا بھی۔
> مدارس کے مولوی تو اپنا کام کرتے ہی تھے۔ لیکن ان کتابوں نے سہارے
> کا کام کیا۔ آج درس وتدریس کے نئے نئے خیالات سامنے آ گئے۔
> لیکن پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ ان کتابوں کے بغیر ہماری ابتدائی تعلیم ادھوری

---

[1] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ، ص: ۶۳/۶۴

ہے جب بچے بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور ماں باپ ان کو چلنا سکھاتے ہیں تو ان کو ''گڈ ولنا'' دے دیتے ہیں یہ لکڑی کی تین پہیوں کی چھوٹی گاڑی ہوتی ہے بچے پہلے اس کے سہارے چلتے ہیں ۔اور پھر جب وہ اپنے پانو سبھالنے لگتے ہیں تو اس ''گڈ ولنے'' کو چھوڑ کر چلتے ہیں یہ بات میں نے اس لیے کی کہ میرے نزدیک یہ کتابیں (جن کا میں نے ذکر کیا ہے) گڈ ولنے کی حیثیت رکھتی ہیں یہ میں نہ جانے کیوں کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ اگر بچپن میں یہ نہ پڑھائی جاتیں تو ہم گر پڑتے۔'' [۱]

اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اطہر پرویز کا داخلہ الہ آباد کے مشن اسکول میں کرایا گیا۔ جہاں انہوں نے دل لگا کر محنت ولگن کے ساتھ تعلیم حاصل کی ۔وہ شروع سے ہی ذہین اور محنتی طالب علم رہے ہیں بچپن سے ہی مجتہدانہ مزاج کے حامل تھے ۔اور انگریزی زبان میں بھی مہارت تھی (اگر ان کو کوئی چیز سمجھ میں نہ آتی تو اس میں مزید وقت لگا کر اس چیز کو اچھی طرح سے سمجھ لیتے۔) یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بہت کم عمر میں بحیثیت ادیب اور سیاستداں کے ادب کی اہم خدمات انجام دیں ہیں ۔اور خاص طور پر اردو ادب اطفال کو اپنی قیمتی تحریروں سے مالا مال کیا ہے مشفقانہ طبیعت اور منکسار شخصیت کے مالک تھے۔ بڑوں کا ادب وحترام اور چھوٹوں سے ہمیشہ محبت سے پیش آتے تھے ان کے بچپن کے بعض واقعات ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہیں ۔ایک واقعہ ملاحظ ہو۔جس کا ذکر انہوں نے خود ولی شاہ جہانپوری کے نام ایک خط میں کیا ہے ولی شاہ جہانپوری جو کہ پیام تعلیم کے ایڈیٹر تھے انہوں نے اطہر پرویز کی تصنیف ''محمد شفیع الدین نیّر'' کا پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ دراصل اس وقت اطہر پرویز ساتویں جماعت کے طالب علم تھے اور وہ حساب میں بہت کمزور تھے لیکن محنت سے انہوں نے اس مشکل مضمون میں اپنی گرفت مظبوط کر لی کہ:

''یہ بات ۱۹۲۷ کی ہے میرے ایک استاد تھے جناب نذیر احمد وہ ہمیں حساب پڑھاتے تھے میں حساب میں بے حد کمزور تھا سوُد در سوُد کے سوالات مجھ سے حل نہ ہوتے تھے ایک روز نذیر صاحب مجھ پر ناراض ہوئے اور کہنے

---

[۱] محمد شفیع الدین نیّر، ڈاکٹر اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی، ص: ۱۶/۱۵

لگے آج سے میں تم سے بات نہ کروں گا...... ماسٹر نذیر احمد بڑے شفیق استاد تھے ان کے اس جملے کا میرے اوپر بہت اثر ہوا۔ گویا اس نے تازیانے کا کام کیا میں نے چکرورتی حساب کی کتاب لی اور اسکول سے واپس آ کر ان سوالات کو حل کرنے میں لگ گیا۔ جب بھی وقت ملتا حساب کرتا.........میں نے دس بارہ روز سخت محنت کی اور اب میں ہر سوال کر لیتا تھا نوبت یہ آئی کہ نہ صرف یہ کہ سوُ د در سوُ د کے سوالات بڑی آسانی سے حل کرنے لگا بلکہ رقبے ارو الجبرا اکویشن وغیرہ کے سوالات میں بھی مجھے کبھی کوئی دقت پیش نہ آتی.......نذیر احمد صاحب نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی ایک روز میں ان کے پاس گیا اور میں رونے لگا ماسٹر صاحب پر میرے رونے کا بڑا اثر ہوا کہنے لگے تم پریشان مت ہو میں تم کو خود پڑھاؤں گا تم انشاء اللہ حساب کرنے لگو گے،، میں نے ہچکیوں کے درمیان انہیں بتایا کہ،، اب میں ہر سوال کر سکتا ہوں۔ آپ میرا امتحان لے لیجئے۔ ارو مجھ سے بات کیجئے''۔[1]

اس واقعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اطہر پرویز بچپن سے کتنے محنتی انسان تھے۔ اور تاعمر انہوں نے اسی لگن ومحنت سے اپنے تمام کاموں کو انجام دیا۔ اور اپنے بڑوں کا بہت ادب واحترام کرتے تھے انہوں نے بہت جدوجہد والی زندگی بسر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ ماہر سیاستداں، ادیب، معلم اور مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔ اس حوالے سے انھیں کئی بار موریشس بھی جانا پڑا۔ اور وہاں اردو زبان کو فروغ دینے میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ وہاں کے لوگ ان کو آج بھی بابائے اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اطہر پرویز کو خود بھی یہ جگہ بہت پسند تھی انہوں ایک کہانی ''انوکھا تحفہ'' کے عنوان سے موریشس کے بارے میں ہی لکھی تھی۔ انہوں نے نوع بہ نوع موضوعات پر کتابیں تخلیق کی ہیں۔ ساتھ ہی اردو ادب کی بیشتر صنف پر طبع آزمائی کی ہے اور کسی حد تک

[1] غیر مطبوعہ مضمون، ڈاکٹر اطہر پرویز

کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ موریشس میں گاندھی انسٹیوٹ کا قیام انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اس میں آج بھی ان کی تصویر لگی ہوئی ہے۔اور وہاں پرویز صاحب کو وہی مقام حاصل ہے جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کو ہندوستان میں حاصل تھا۔

الہ آباد کے مشن اسکول سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد اطہر پرویز نے ۱۹۴۱ء میں الہ آباد کے کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔لیکن سوئے قسمت کہ اسی سال ان کے والد صاحب نے اس دارِفانی سے رخصت ہوگئے اور اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کے چچا اور والدہ محترمہ نے اٹھائی۔ان کے چچا کا نام محمد ادریس تھا۔جنہیں گھر کے بچے ان کی خاندانی روایت کے مطابق ''بھائی میاں'' بلاتے تھے۔ جو سرکاری پیشے سے وابستہ تھے انہوں نے اطہر پرویز کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھا۔ بھائی میاں نے انہیں کبھی والد کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ بھائی میاں کی طرح ہی گھر کے بچے اطہر پرویز کو ''بھائی جان'' بلاتے تھے حتیٰ کہ ان کی بیٹیاں بھی ان کو اسی نام سے بلاتیں تھیں۔اور ان کی چھوٹی بیٹی شیلا اں پرویز نے ایک مضمون ''میرے بھائی جان'' کے عنوان سے ہی لکھا ہے۔

اطہر پرویز نے کرسچین کالج سے انٹر کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے الہ آباد یونیورسٹی کے بجائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلے صدیق احمد صدیقی کی شخصیت سے متاثر ہو کر لیا تھا۔ دراصل صدیقی صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں یونین کے سکریڑی تھے اور الہ آباد میں ان کے ایک خاص دوست جناب عبدالمجید رہتے تھے اور صدیقی صاحب اکثر و بیشتر ان سے ملنے الہ آباد جایا کرتے تھے۔ پھر رات میں ان سب کو علی گڑھ کے قصے سناتے تھے جن میں رشید احمد صدیقی' آل احمد سرور' پروفسر حبیب اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد وغیرہ کا اکثر ذکر ہوتا رہتا تھا یہ قصے کہانیوں سن کر اطہر پرویز کو علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے ،اور یہاں کی معروف شخصیات سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی اور انہوں نے آگے کی تعلیم یہاں سے مکمل کرنے کا ارداہ کیا۔ گرچہ شروع میں ان کے گھر والے اس بات پر راضی نہ تھے۔لیکن پھر صدیقی صاحب نے ہی ان کے گھر والوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انہیں علی گڑھ بھیجیں اس کا ذکر خود اطہر پرویز نے اپنے مضمون ''پوچھتے ہیں وہ کہ'' مشمولہ ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' میں کیا ہے ان کی یہ کتاب یاداشت پر مبنی انشائیہ یا خاکہ نما مضامین کا مجموعہ ہے:

''میں الہ آباد چھوڑ کر علی گڑھ آیا تھا۔الہ آباد چھوڑنے کی وجہ جناب صدیق احمد صدیقی تھے جو جناب عبدالمجید خواجہ سے ملنے اکثر الہ آباد آیا کرتے تھے۔یہ یونیورسٹی یونین کے سکریٹری رہ چکے تھے اور یونیورسٹی میں ان کی لیاقت کی بڑی دھوم تھی۔انہوں نے میرے گھر والوں کو مجھے علی گڑھ بھیجنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ان کی زبانی جو نام بار بار سنے تھے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، پروفیسر حبیب، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، خواجہ منظور حسین وغیرہ۔چنانچہ جب میں علی گڑھ آیا تو ان سب سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ان میں سے سب سے پہلے سرور صاحب کو دیکھا۔'' [۱]

علی گڑھ میں آمد:

سن ۱۹۴۲ء میں اطہر پرویز کی یہ دلی خواہش پوری ہوئی۔اور وہ علی گڑھ آئے اور یہاں آکر مذکورہ بالا شخصیات کو قریب سے جاننے کا موقعہ بھی ملا۔اور ان میں سے چند سے گہری دوستی بھی ہوئی۔رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، ذاکر حسین اور سید ہادی حسن ان اشخاص سے اطہر پرویز کے تعلقات بہت گہرے تھے۔انہوں نے معاملات زندگی میں اکثر و بیشتر اطہر پرویز کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے۔رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور پر مضمون بھی لکھا۔رشید احمد صدیقی اور ذاکر حسین ان دو شخصیات کا ان کی زندگی میں اہم رول رہا ہے ان دونوں نے زندگی کے ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کی ہے۔تعلیم سے متعلق کوئی مسلئہ ہو یا کوئی اور مشکل چاہیے ان کے دوستوں کا ہی کوئی مسئلہ ہو اطہر پرویز فوراً رشید صاحب کے پاس جاتے اور رشید صاحب حل بتاتے۔آل احمد سرور کا بھی اطہر پرویز سے گہرا تعلق تھا بعد میں جب اطہر پرویز نے رجب علی بیگ سرور کی مشہور داستان ''فسانہ عجائب'' کو مرتب کیا۔تو انہوں نے آل احمد سرور سے ہی اس کا تعارف لکھوایا۔ذاکر صاحب سے اطہر پرویز کی عقیدت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے جامعہ میں بھی دونوں ساتھ تھے۔

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو ڈاکٹر اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص:۱۴۱ تا ۱۴۲

اس کے علاوہ پرویز صاحب نے اپنی چند تصانیف کا انتساب بھی ذاکر حسین کے نام کیا ہے۔اوران کی محبت کا ثبوت ان کے نام سے علی گڑھ میں ''ذاکر حسین ماڈل اسکول'' قائم کر کے دیکھایا۔گویا پرویز صاحب ان حضرات نے زندگی کے نازک سے نازک معاملے میں اطہر پرویز کو اپنی قیمتی رایوں سے مستفید کیا ہے۔جب ایم۔اے کے بعد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ضیاء الدین صاحب نے انہیں باہر کی آسامی کے لیے منتخب کیا۔اور انہوں نے منع کر دیا تو سید حامد کے کہنے پر ہی اس وقت اطہر پرویز نے علی گڑھ چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔جس کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔

علی گڑھ آکر اطہر پرویز نے شعبہ فارسی میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔اور ممتاز ہوسٹل رہائش کے لیے دیا گیا۔مگر انہیں رہنے کے لیے وہ جگہ زیادہ مناسب نہ لگی۔اور وہ یونیورسٹی کے قریب ہی ایک بازار دودھ پور کے نام سے مشہور ہے وہاں پاس میں نشاط منزل کے نام سے ایک گھر واقع تھا یہیں انہوں نے ایک کمرہ کرایے پر لیا اور ٹھاٹھ سے رہنے لگے۔نشاط منزل بہرے نواب صاحب کی کوٹھی تھی ؎وہاں ممتاز حسین جو کہ ترقی پسند نقاد تھے بعد میں پاکستان چلے گئے تھے،سید حسن امام جو کہ کلکتہ کے مشہور بیرسٹر تھے، جناب معبود حسن مونس رضا اور حافظ عبدالباری سب نشاط منزل میں ہی رہائیش پذیر تھے۔انھیں احباب کی صحبت نے اطہر پرویز کو سیاست کی طرف متوجہ کیا۔گویا طالب علمی کے زمانے میں ہی انہیں سیاست سے آشنائی ہوئی اور اس آشنائی نے انہیں ٹریڈ لیڈر یونین بنا دیا۔لیکن کبھی بھی ترقی پسند میں غلو سے کام نہیں لیا۔اس طرح سے دیکھا جائے تو علی گڑھ کی زندگی ان کے لیے بڑی انقلابی ثابت ہوئی۔کچھ تو احباب کی صحبت کی وجہ سے اور کچھ اپنی دلچسپی کی بناء پر وہ کمیونسٹ بن گئے جب کہ ان کے والد مسلم لیگی تھے۔

اطہر پرویز نے ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز مکمل کرنے کے بعد یہیں سے فارسی ادبیات میں ۱۹۴۵ء میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ایم اے کرنے کے بعد ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ فارسی ادبیات کے ہی کسی موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کریں۔لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا اسی دوران ان کی زندگی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔جس نے ان کی زندگی کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔اس واقعہ کا ذکر انہوں اپنی تصنیف ''شفیع الدین نیّر ایک مطالعہ'' میں تفصیلاً کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر نے پروفیسر ہادی حسن سے کہا کہ

برٹش سرکار کو ایک آسامی کی ضرورت ہے شعبہ فارسی سے ایک ایسے طالب علم کی سفارش کی جائے جو ایران میں رہ سکے فارسی میں ایم۔اے ہو فارسی زبان میں تھوڑی بہت بات چیت کر سکے مسلمان ہو اور علی گڑھ کا فارغ التحصیل ہو قرعہ میرے نام کا پڑا ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مسلم یونیورسٹی کے کرتا دھرتا تھے......ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سے میرا تعارف ڈاکٹر عبادالرحمان خاں نے کروایا تھا۔ وہ الہ آباد میں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے دوست اور میرے کرم فرما تھے اسی لیے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد میرا بڑا خیال کرتے تھے۔ ہاں تو انہوں نے مجھے بلایا کہنے لگے مبارک ہو اتنی بڑی ملازمت کے لیے ڈاکٹر ہادی حسن نے تمہارا نام تجویز کیا ہے میں بے حد خوش ہوا کہ ہادی حسن صاحب کو میرا بڑا خیال ہے اب میرے سامنے ایک شاندار مستقبل ہوگا میں نے اس ملازمت کو ٹھکرا دیا جب یہ بات سر ضیاء الدین کو معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور پھر پروفیسر ہادی حسن صاحب نے کہا کہ اب تمہارے لیے علی گڑھ میں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے چنانچہ میرا داخلہ نہ ہو سکا اور مجھے یونیورسٹی چھوڑنی پڑی ذاکر صاحب سے رشید صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی انہوں نے جامعہ آنے کی دعوت دی لیکن بات جمی نہیں میرا ذہن تو اونچی اڑان کر رہا ہے'' [1]

یہ واقعہ پیش آنے کے بعد اطہر پرویز کا علی گڑھ میں رہنا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً انہیں علی گڑھ چھوڑ کر واپس الہ آباد جانا پڑا۔ وہ علی گڑھ میں چار سال تک زیر تعلیم رہے اس دوران ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں کا سلسلہ بھی جاری و ساری رہا۔ الہ آباد میں انہوں نے کچھ عرصے تک قیام کیا۔ اور پھر سرکاری ملازمت نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور ممبئی جا کر اخبار نویسی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس

---

[1] محمد شفیع الدین نیّر، اطہر پرویز، مکتبہ جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵ ص: ۷/۸

سلسلے میں انہوں نے اپنے دوستوں اختر ایمانؔ اور سجاد ظہیر کو خط بھی لکھا جو کہ اس وقت ممبئ میں ہی تھے اور ان دونوں کے مثبت جواب نے ان کے ارادے کو مزید جلا بخشی اور وہ ممبئ کے لیے روانہ ہوئے۔

اطہر پرویز کو علی گڑھ کے پرفضا تعلیمی ماحول میں بھرپور طریقے سے پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اور یہاں تعلیم حاصل کرنے سے ان کو کئی فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ سیاست سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ اشترا کی نقطہ نظر کی بھی بھرپور آبیاری ہوئی۔ دوسرا یہ کہ حلقہ احباب کا گروہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ وہ خود بہت خوش مزاج اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی رہتے ان کا حلقہ احباب وسیع ہو جایا کرتا تھا۔ چاہیے پھر وہ جیل ہو، ناگپور ہو، جامعہ ملیہ اسلامیہ ہو یا علی گڑھ یہی وجہ ہے جب ہم ان کے طالب علمی کے زمانے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کے دوستوں کا جم غفیر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کہ طور پر وامق جونپوری، سجاد ظہیر، جو کہ ترقی پسند تحریک کے بانی تھے اور کنور محمد اشرف سے بھی ان کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں وہ کمیونسٹ پارٹی کے بنیاد گزاروں میں سے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ مارکسی خیالات نے اطہر پرویز کے یہاں شدت اختیار کر لی تھی۔

اساتذہ واحباب:

کسی بھی شخصیت کو نکھارنے وسنوارنے اور زندگی کو نئے مفاہیم ونئ جہتوں سے آشنا کرانے میں اساتذہ ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بعض اساتذہ اپنی پرکشش شخصیت کے باعث دل ودماغ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتے ہیں۔ اطہر پرویز کو شروع سے ہی کچھ ایسے اساتذہ ملے۔ جنھوں نے انہیں کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر انہوں نے اپنی معروف تصنیف ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں جگہ جگہ کیا ہے۔ چونکہ ان کی زیادہ تر تحریریں یادداشت پر مبنی ہیں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں ان کے دوستوں، استادوں، اور شاگردوں کا ذکر جابجا ملتا رہتا ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے سب سے اہم نام پروفسر ہادی حسن کا ہے۔ پروفیسر سید ہادی حسن ۳ ستمبر سن ۱۸۹۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید امیر حسن تھا۔ جو اس وقت حیدر آباد میں کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ ہادی حسن نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے فرگوسن پونے مہاراشٹر (firgusson college in pune ,maharashttra) سے بی۔ اے۔ سی کیا۔ ہادی حسن بہت ذہین (genius) تھے ان کو ریاستِ حیدر آباد سے وظیفہ ملتا تھا۔ ہادی

حسن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ گئے۔ انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ہادی حسن کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ باٹنی (botany) میں بطور ریڈر ہوا۔ بعد میں وہ شعبہ باٹنی میں صدر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

انھیں فارسی سے بہت لگاؤ تھا۔ اسی لیے انہوں نے فارسی ادب میں (london school of oriental studies) سے ڈاکٹریٹ کیا۔ اور انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ہادی حسن صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہی شعبہ فارسی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ چوں کہ فارسی پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ ان کے متعلق یہ شہرہ عام تھا کہ رولان کی'' ہسٹری آف پرشیا'' انھیں زبانی یاد تھی۔ اور مقرر بھی بہت اچھے تھے بحیثیت معلم وہ پڑھاتے بھی اچھا تھے۔ ہادی حسن اطہر پرویز کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ پرویز صاحب کو خود بھی فارسی زبان سے دلچسپی تھی اور فارسی ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے اور اس ذوق کو پروان چڑھانے میں پروفیسر ہادی حسن کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے پروفیسر ہادی حسن کے پڑھانے کا ایک جگہ یوں ذکر کرتے ہیں:

> ''ایک روز ہمارا فائنل کا کلاس ہو رہا تھا ڈاکٹر ہادی حسن ''عمر خیام''
> پڑھا رہے تھے لطف آ رہا تھا لفظوں کی دھیمی دھیمی بارش ہو رہی تھی ساری
> جماعت خیام کے عہد میں پہنچ چکی تھی'' [۱]

ہادی صاحب کے علاوہ حبیب صاحب کا شمار بھی اطہر پرویز کے پسندیدہ استادوں میں ہوتا تھا۔ حبیب صاحب کا ذکر ان کی تصنیف 'علی گڑھ سے علی گڑھ تک' میں جا بجا ملتا ہے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ان کی شخصیت علی گڑھ میں لیجنڈ کی سی تھی ابھی چند سال پہلے ان کا
> انتقال ہوا وہ بے حد فراخ دل استاد تھے ان کی فراخ دلی کے بے شمار قصے
> مشہور ہیں ایک بار ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کہیں باہر چلے گئے تھے۔
> پروفسر حبیب قائم مقام وائس چانسلر ہوئے اس درمیان میں حسب دستور
> طالب علم اپنی فیس کے مسائل لے کر آتے اور پروفیسر موصوف اس کی
> فیس کا بقایا اپنی تنخواہ سے ادا کرنے کی ہدایت کر دیتے'' [۲]

---

۱ اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک' اردو گھر، علی گڑھ، اشاعت ثانی فروری ۲۰۰۷ء، ص: ۱۰۸

۲ اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ، اشاعت ثانی فروری ۲۰۰۷ء، ص: ۱۲۶/۱۲۷

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شمار بھی اطہر پرویز کے پسندیدہ اساتذہ میں ہوتا ہے۔ جہاں تک رشید احمد صدیقی کی بات ہے انہوں نے علی گڑھ میں پڑھنے والے بیشتر طالب علموں کی مدد کی ہے۔ اور ضرورت پڑنے پر کچھ طلباء کو اپنے گھر میں بھی رکھا۔ رشید صاحب اطہر پرویز کو اپنی اولاد کی طرح ہی عزیز رکھتے تھے۔ انہیں کبھی والد کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کی رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں یا ان کے دوستوں کو کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تو پرویز صاحب رشید صاحب کے پاس ہی جاتے تھے۔ طالب علمی کے بعد بھی ان کے تعلقات ویسے ہی رہیں۔ رشید صاحب نے ان کی اکثر و بیشتر تصانیف پہ تعارف لکھا ہے۔ وہ بھی رشید صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اس کا اندازہ اطہر پرویز کا مضمون ''رشید احمد صدیقی'' کے مطالعے سے ہوتا ہے جو ان کی مشہور کتاب ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' میں مشمول ہے۔ جس کا یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے کہ:

> ''رشید صاحب نے ادبی محفل میں اپنی زبان سے ہمیشہ ایک فضا قائم کی ان کے فقروں کی گونج یونیورسٹی کی عمارتوں میں آج بھی جذب ہے ان کی کتابیں برابر ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں اور پڑھی جائیں گی۔ علی گڑھ میں ہمیشہ ان کا ذکر رہے گا لیکن ہم رشید صاحب کو نہ دیکھ سکیں گے۔ ان کی موت سے ادبی دنیا میں جو سناٹا ہوا ہے وہ یقیناً بھیانک ہے۔ ہم اردو والوں کو رشید صاحب کے بغیر جینا ہوگا لیکن ان کی تصانیف ہماری رہنمائی کریں گئیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ 'موت العالم موت العالم' عالِم کی موت عالَم کی موت ہے'' [۱]

اطہر پرویز رشید احمد صدیقی سے ادب و زندگی کے ہر معاملات میں متاثر ہوئے۔ رشید صاحب وقتاً فوقتاً انھیں نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ جس کا ذکر انہوں نے خود اپنی تصنیف ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں کیا ہے کہ:

> ''میاں صحبت اچھی رکھنا یہ بڑی چیز ہے اس سے انسان بنتا اور بگڑتا ہے دو بادشاہوں کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے ایک نے صحبت اچھی رکھی ابوالفضل اور فیضی کے پاس بیٹھا تو ظلّ الٰھی سے بھی آگے بڑھ گیا

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، ڈاکٹر اطہر پرویز مرتبہ، سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ص: ۱۱۵

حالانکہ خود بے پڑھا لکھا تھا لیکن کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور اس کے
مقابلے میں ایک دوسرے بادشاہ کی زندگی کو لیجئے کہ ناچنے گانے والوں
کی صحبت میں بیٹھا اور پیا جان عالم کہلایا'' ۱؎

پرویز صاحب نے اپنی تصنیف علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' جو انہوں اپنے تعلیمی ارادے (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی یادوں کے حوالے سے تحریر کی ہے لیکن بعض واقعات موریشس اور جامعہ اسلامیہ دہلی اور الہ آباد کے بھی شامل ذکر ہیں۔ لیکن اصل ذکر علی گڑھ کے زمانے کا ہے جس میں انہوں اپنے اساتذہ، احباب وغیرہ کا جا بہ جا ذکر کیا ہے۔ اپنے پسندیدا ساتد پروفیسر ضیاءالدین احمد کے بارے میں راقم طراز ہیں کہ:

''پروفیسر ضیاءالدین احمد بدایونی اور لفٹنٹ حمیدالدین خاں جیسے استاد
نیونیوسٹی میں آج بہت کم نظر آتے ہیں جو درس و تدریس کو عبادت سمجھ کر
کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم سرور بھی شعبۂ فارسیہ میں تھے۔ بڑی محنت اور
محبت سے پڑھاتے تھے۔ ان سے طالب علم بہت مانوس تھے۔ جہاں
کوئی مشکل پیش آئی ان کے پاس دوڑے ہوئے پہنچے اور انھوں نے
ہماری مشکل آسان کردی۔'' ۲؎

احباب:

اطہر پرویز کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور ان کے حلقے میں آئے روز اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ان کے دوست اتنے زیادہ تھے کہ وہ خود بھی ان کی فہرست نہ بنا سکتے تھے۔ وہ مزاج کے اعتبار سے انسان دوست اور ''بہ دوستاں تلطف'' کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے احباب کے نام میں جہاں بزرگ ان کے ہم عصر اور ہم عمر افراد شامل تھے، وہاں کئی نوجوانوں کے نام بھی ان کی ''کتابِ دوستاں'' میں درج تھے۔ مثلاً اختر الایمانؔ، مجازؔ لکھنوی، حبیب تنویر اور عزیز حامد مدنی، مجاز، سجاد ظہیر، اشفاق محمد خاں، ذاکر حسین، سید حامد، ممتاز حسین،

۱؎ اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ، اشاعت ثانی فروری ۲۰۰۷ء، ص: ۱۶۱

۲؎ اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ، اشاعت ثانی فروری ۲۰۰۷ء، ص: ۳۸

مونس رضا، میراجی اورعتیق احمد صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اطہر پرویز کو علی گڑھ میں کچھ دوست ایسے بھی ملے۔ جو بعد میں معروف ادیب اور دانشور کہلائے ان احباب کے نقوش پرویز صاحب کی زندگی میں بہت گہرے تھے۔ مثلاً اختر الایمانؔ، مجازؔ لکھنوی، حبیب تنویر اور عزیز حامد مدنی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔۱۹۴۳ء میں جب اختر الایمان علی گڑھ آئے اور ایم۔اے اردو میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کی ملاقات اطہر پرویز سے ہوئی اور دوستی ہوگئی۔ پرویز صاحب اختر الایمان کی شاعری کے بھی بڑے مداح تھے جبکہ ان کے دوسرے ساتھی ممتاز حسین اور مونس رضا وغیرہ اختر الایمان کی شاعری سے ہمیشہ بدکتے تھے کیوں کہ ان کی شاعری اشترا کی نقطہ نظر کی حامل نہ تھی۔لیکن اطہر پرویز کا معاملہ بالکل مختلف تھا، وہ ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں غلو کے قائل نہیں تھے۔انہوں نے اختر الایمان کی شاعری کا مطالعہ بہت ہی انہماک سے کیا تھا۔ اور انہوں نے اختر الایمان کی بعض نظموں کی سیاسی توضیح کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔اس سے ان کے تنقیدی شعور کا بھی علم ہوجاتا ہے جو کہ بعد میں نکھر کر سامنے آیا ہے جب انہوں نے اردو کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب پیش کر کے بحیثیت ناقد شہرت حاصل کی۔

اختر الایمان کے ساتھ اطہر پرویز آل انڈیا ریڈیو بھی گئے۔اور وہاں ان کی ملاقات میراؔجی، مختار صدیقی، سعادت حسن منٹو اور ن۔م راشدؔ سے ہوئی۔ایک رات دونوں میراؔجی کے یہاں ٹھہرے اور رات بھر شاعری کی محفل چلتی رہی اور دستک کا بھی ذکر آیا۔ میراؔجی نے اس کو ''طوائف کا انتظار بتایا'' اور جب میراؔجی نے اطہر پرویز کا مطلب سنا جو کہ پہلے مذکور کیا گیا ہے۔تو میراجی بھی بہت خوش ہوئے۔علاوہ ازیں اقبال کا کلام مارکسی نقطہ نظر کے حوالے سے بھی زیر بحث رہا۔مالی مشکلات کے سبب اختر الایمان علی گڑھ میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔لیکن جب تک وہ یہاں رہے ان کی اکثر شامیں اطہر پرویز کے یہاں ہی گزرتی تھیں۔اطہر پرویز لکھتے ہیں جبکہ وقتاً فوقتاً شاہد احمد دہلوی جو کہ ''ساقی'' کے مدیر ہیں اختر الایمانؔ کی مدد کیا کرتے تھے۔لیکن دوسروں کے سہارے سے کب تک کام چلتا آخر میں مجبوراً اختر الایمان کو علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔اور فلمی دنیا کی راہ اختیار کی۔ بعد میں بھی دونوں کی دوستی قائم ودائم رہی جب تک وہ زندہ رہے۔ اختر الایمان کی علی گڑھ میں آمد کے متعلق پرویز صاحب اس طرح سے ذکر کرتے ہیں کہ:

''اسی زمانے میں اختر الایمان دہلی سے علی گرھ آئے تھے۔انہوں نے

اردو ایم اے میں داخلہ لیا تھا یہ زمانہ وہ تھا جب انھیں شعر کہتے ہوئے
زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن علی گڑھ میں وہ اپنا مجموعہ کلام (گرداب)
لے کر داخل ہوئے۔ ادبی حلقوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن ترقی
پسند حضرات ایک مشکل میں پڑ گئے تھے اور بات چیت کے اعتبار سے وہ
قنوطیت کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ ان کی نظمیں ادب لطیف، ادبی دنیا اور
ساقی وغیرہ میں بڑے طمطراق سے چھپتی تھیں۔'' [۱]

پرویز صاحب اختر الایمان کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ اختر الایمان جب بھی کوئی نئی نظم لکھتے تو ان کے پاس لے کر جاتے اور ان کو پڑھاتے انہوں نے اپنی نظم ''دستک'' لکھی اور فوراً پرویز صاحب کو پیش کی۔ جو کہ اس طرح سے ہے۔

کھٹکھٹاتا ہے درخفتہ کوئی
انتظار اشک گماں کچھ بھی نہیں
شمع پروانے دھواں کچھ بھی نہیں
سوچ لوں باز کروں ورنہ کروں
شیشہ وسنگ کی آواز سنوں
آج کیا کہتے ہیں غم خوار رستوں
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دووازہ کھلا

اس نظم کو پڑھ کر پرویز صاحب نے اس طرح تعریف کی:

''میں نے کہا انسانیت ایک کمرے میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔ اشتراکیت
دستک دیتی ہے لیکن عہد اس سے پہلے عہد فطرت، عہد جاگیرداری اور عہد

---

[۱] علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اطہر پرویز، اردو گھر، علی گڑھ، اشاعت ثانی فروری ۲۰۰۷ء، ص: اص: ۱۴۰

سرمایہ داری مایوس کر چکے ہیں اب یہ پس وپیش میں ہے کہ اشتراکیت
کے لیے دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں'' ۱

اختر الایمان اطہر پرویز کو اپنے ساتھ آل انڈیا ریڈیو گئے اور وہاں مختار صدیقی، سعادت حسن منٹو، ن م راشد اور میراجی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اختر الایمان کی وجہ سے ہی پرویز صاحب کی دوستی میراں جی سے بھی ہوئی۔ اور یہی سے دونوں میراجی کے گھر گئے۔ جس کا ذکر پرویز صاحب نے اس طرح کیا ہے کہ:

''میراجی کے کمرے میں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ بجلی نہیں
تھی۔ موم بتی جلی تو معلوم ہوا کہ دو جھلنگے پڑے ہیں اور اوران پر ہر طرف
کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ میراجی نے بڑے سلیقے سے دونوں چارپائیوں
کی کتابیں ایک ایک طرف کیں اور چارپائی پر اتنی جگہ کردی کہ میرے
اور اختر الایمان کے لیے جگہ نکل آئی۔ تکیے کا کام کتابوں نے کیا۔ بڑی
گہری نیند آئی اور صبح جب آنکھ کھلی تو میراجی بیٹھتے پان لگا رہے تھے۔
وپ وہیں فرش پر سوئے تھے اور اٹھنے کے بعد شاید ان کا یہی پہلا کام تھا۔
اگلے روز ہم لوگ علی گڑھ واپس آ گئے۔'' ۲

مجاز لکھنوی سے بھی اطہر پرویز کے دوستانہ مراسم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کا ذکر ان کی مشہور تصنیف ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں جا بجا ملتا ہے۔ جب کہ مجاز کو علی گڑھ چھوڑے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ لیکن جب بھی وہ علی گڑھ تشریف لاتے تھے تو ان کا قیام اکثر اوقات ہوسٹل میں ہی ہوتا تھا۔ خورشید الاسلام اور مسعود حسین کا شمار مجاز کے رفقاء میں ہوتا تھا اسی لیے ان کا زیادہ تر وقت لڑکوں کے کمروں میں ہی گزرتا تھا اطہر پرویز حاضر جواب اور تنقیدی ذہن کے مالک رہے ہیں۔ اسی لیے جب بھی وہ اپنے دوستوں کی تحریرات کا مطالعہ کرتے تو ان کی تخلیقات پر اپنی تنقیدی رائے دیتے تھے (کے متعلق اپنی ایک الگ رائے رکھتے تھے)۔ مجاز کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

---

۱ علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اطہر پرویز اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۱۴۴

۲ علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اطہر پرویز، اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۱۴۵/۱۴۴

''مجاؔز مرحوم علی گڑھ میں پڑھے ہوئے تھے اور بقول شخصے کہ علی گڑھ کی
رگ رگ سے واقف تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظم میرا چمن میں
علی گڑھ کی صحیح شخصیت کو پیش کر دیا ہے وہ چاہے ناہید سے سرگوشی کریں یا
پروین سے رشتے جوڑیں یا قبائیں نوچیں یا ذرات کے بوسے کے لیے
آکاش کو زمین سے اتاریں وہ ان سب میں علی گڑھ کے کردار نمایاں
کرتے ہیں'' [۱]

اطہر پرویز کا ماننا تھا کہ غالبؔ کے بعد اردو شاعری میں مجاؔز ہی کے لطائف زبان زد ہیں مجاؔز بہت حاضر جواب تھے ان کے ایک واقعہ کا ذکر اطہر پرویز نے اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''اردو شاعری میں غالبؔ کے بعد مجاؔز ہی تھے جن کے لطائف زبان زد
ہیں مجاؔز حاضر جواب تھے زبان سے بات نکلی اور انہوں نے جملہ چست
کیا ایک روز میں ان کے ساتھ چاندنی چوک سے گزر رہا تھا اتورا کا دن
تھا چاندنی چوک کی دکانیں بند تھیں ایک دکان پر بہت بڑا تالا لگا ہوا تھا
میں نے کہا مجاز صاحب یہ تالا دیکھئے مجاؔز مرحوم نے مڑ کر دیکھا اور بولے
'میاں یہ تالا ہے..... یا اللہ تعالیٰ مجاز چوکتے نہ تھے زبان پر آیا ہوا لفظ کبھی
واپس نہ لیتے تھے'' [۲]

ایک بار کا واقعہ ہے کہ علی گڑھ میں نئے 'ادیبوں کا معمار' کے نام سے کتابوں کے پبلشرز نے نئے ادیبوں پر کتابچوں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہاں سے عصمت چغتائی کا مجاؔز پر لکھا ہوا خاکہ بھی شائع ہوا تھا، اس میں عصمت نے اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا تھا، کہ ان دنوں گرلز کالج کی لڑکیاں مجاؔز پر جان چھڑکتی تھیں مجاز کے نام کا قرعہ ڈالا کرتی تھیں، کہ مجاؔز کی شادی کس سے ہو، یہ عبداللہ ہال کی لڑکیوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت مجاؔز کی نظم ''آوارہ'' منظر عام پر آ چکی تھی اور اس نظم کے مصرعے ہوسٹل کے کمرے میں سنائی دیتے تھے۔

---

[۱] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۱۹۳

[۲] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۴۰

اس بات کا ذکر مجازؔ نے خود اطہر پرویز سے کیا ہوا یوں کہ ان کی ملاقات مجازؔ سے الہ آباد کے اسٹیشن پر ہوئی مجازؔ ممبئی سے آرہے تھے۔ان سے مخاطب ہوئے کہ تم نے عصمت کا مضمون پڑھا۔اس واقعے کے حوالے سے وہ اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ:

''کہنے لگے ارے میاں اس المیہ پر نظر نہیں پڑی کہ میرے نام پر گرلز کالج کی لڑکیاں قرعے ڈالا کرتی تھیں اور سنو عصمت بھی ان قرعوں میں شریک ہوتی تھیں لیکن ٹریجیڈی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے نام کے قرعے پڑتے تھے دوسری طرف ہم لڑکی کی شکل دیکھنے کو ترستے تھے یہ لڑکیاں واقعی ظالم ہوتی ہیں عشق ہم سے کرتی ہیں اور شادی شاہد لطیف سے''[۱]

ساحر کا شمار بھی اطہر پرویز کے دوستوں میں ہوتا ہے۔کچھ دنوں تک ساحرؔ کا قیام ان کے گھر پر ہی رہا۔انہیں دنوں ان دونوں کی وامقؔ جونپوری،مجازؔ،فراقؔ اور اپندر ناتھ اشکؔ وغیرہ سے روز ملاقاتیں ہونے لگیں۔الہ آباد میں سول لائن ہی ادب کا بڑا مرکز تھا۔کیونکہ یہیں اس وقت کے تمام ادباء وشعراء شام کے وقت آکر ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے اس جگہ کو اکثر لوگ تاج محل کے نام سے جانتے تھے۔پھر جب کچھ دنوں کے بعد ساحرؔ بمبئی گئے تو ان کے گیت پورے ہندوستان میں مشہور ہوگئے۔ساحرؔ اور اطہر پرویز کی ملاقات الہ آباد میں ہی فراق کے گھر پر ہوئی تھی۔اور کچھ ہندی ادیبوں سے بھی ملے انہوں نے ساحرؔ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''بھئی پرویز تمہارا گھر تو محفوظ ہے نا۔ میں انڈر گراؤنڈ ہوں' یہ عمل کئی روز چلتا رہا پھر ساحرؔ الہ آباد سے بمبئی چلے گئے اور چند روز میں ان کے گیت سارے ہندوستان میں گونجنے لگے جب مجازؔ مرحوم بمبئی سے واپس آئے اور میں نے ساحرؔ کی خیریت پوچھی تو انہوں نے کہا دو روز تو میں ساحرؔ کے ساتھ رہا۔دن بھر گھومتا تھا اور شام کو جب میرا جی چاہتا تھا

---

[۱] اطہر پرویز،علی گڑھ سے علی گڑھ تک،اردو گھر،علی گڑھ اشاعت ثانی،فروری ۲۰۰۷،ص: ۴۰

کہ افلاک کی سیر کروں تو ساحؔر کو انڈر گراؤنڈ ہونے کی فکر ہوتی تھی۔

چنانچہ میں نے کہہ دیا میرا اور تمہارا نہیں نبھے گا۔'' [۱]

اطہر پرویز کے ایک اور عزیز دوست حبیب تنویؔر بھی تھے۔ جو کہ بعد میں ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نگار اور ڈراما آرٹسٹ اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہوئے انھیں متعدد انعامات بھی ملے۔ حبیب تنویر نے نظیر آکبرآبادی پر'' آگرہ بازار'' کے عنوان سے غیر معمولی ڈرامہ بھی لکھا۔ حبیب تنویؔر ۱۹۴۴ء میں ناگپور سے علی گڑھ آئے تھے ناگپور یونیورسٹی سے ہی انہوں نے بی۔اے کیا تھا اور ناگپور یونیورسٹی کے پوزیشن ہولڈر بھی رہے تھے۔ اسی لیے انہیں یونیورسٹی کی طرف سے وظیفہ بھی ملتا تھا جب وہ علی گڑھ ایم۔اے کرنے آئے تو یہاں بہت ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے۔ انہوں نے بھی دودھ پور میں لالہ رخ کے پاس والے نواب کا چھوٹا سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہاں ان کے ساتھ اطہر پرویز کے ایک دوست عزیز حامد مدنی بھی رہتے تھے۔ اطہر پرویز عزیز حامد مدنی کے پاس آتے رہتے تھے تو حبیب تنویؔر سے بھی دوستی ہوگئی حبیب تنویؔر کو اسفار کا بہت شوق تھا۔ اور انہوں نے اس شوق کو پورا بھی کیا انہوں نے کشمیر' کلکتہ' ممبئی اور بنگلور وغیرہ جگہوں کا سفر کیا۔ گرچہ ان اسفار سے ان کو فائدہ ہوا لیکن نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس کے نتیجے میں حبیب تنویؔر کی حاضری بہت کم ہوگئی اس مسئلے کا ذکر انہوں نے اطہر پرویز سے کیا۔ وہ انہیں رشید صاحب کے پاس لیے گئے اس واقعے کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے:

> ''میاں صاحبزادے آپ کی کل حاضری کتنی ہے حبیب تنویر میں اعتماد پیدا ہوا اور انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا جناب عالی اکیس فی صدی حبیب تنور کے لہجے میں واقعی بلا کا اعتماد تھا اور اکیس فی صدی کچھ اس طرح کہا جیسے وہ سو فی صدی کہہ رہے ہوں پروفیسر رشید احمد صدیقی پر جیسے بجلی گری کہنے لگے حضرت کم سے کم ضروری حاضری ۷۵ فی صد ہونا چاہئے اگر اس میں ۵ فی صد کی کمی ہو تو استادوں کی سلام دعا سے کام چل جاتا ہے اگر ۶۵ فی صد ہو تو طالب علم زرا سا پریشان ہو جاتا ہے وہ یونین

---

[۱] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۱۸۲

اور اسپتال کے چکر لگاتا ہے .... ہاں اگر حاضری ۶۰ فی صد ہوتو
طالب علم وائس چانسلر سے ادھر نہیں ٹھہرتا اور چھوٹی تسلیوں پر کان نہیں
دھرتا کیونکہ پھر وائس چانسلر ہی چاہے تو کچھ کرسکتا ہے بہر حال ڈاکٹر ضیاء
الدین احمد ایسے کام تو کرہی دیتے ہیں لیکن بھائی ۵۵ فی صد حاضری ہوتو
لڑکا ایک لمحہ ضائع نہیں کرتا۔ کچہری کے سامنے سانگالیتا اور سیدھا
کمرے پہنچتا ہے اور پاٹنر سے دو ایک رازدارانہ فقرے کہہ کر اسٹیشن پر جا
کر دم لیتا ہے۔ میاں تم ۲۱ فی صد پر نا امید نہیں۔ بخدا تم ہندوستان میں
انقلاب کر سکتے ہیں اور جہاں تک میرا تعلق ہے میرے بھائی میں مجاہد
کہلانے کے لیے تیار نہیں ہوں لیکن احمق کہلانے کے لیے تیار نہیں ہوں''
ہم لوگوں پر سناٹا چھا گیا۔ اور رشید صاحب میری طرف مخاطب ہوئے
اور بولے بھائی ان کو لے جایئے اور کمیونسٹ پارٹی میں بھرتی کروادیجیے
یہ آپ کے لیے بڑے کام کے آدمی ثابت ہوں گے'' [۱]

بہر حال حبیب تنؔویر کی حاضری کا مسلہ حل تو نہیں ہوا۔ اور نہ ہی حبیب تنؔویر رشید صاحب کے علاوہ یونیورسٹی میں کسی اور کے پاس گئے۔ لیکن قسمت نے ممبئ جانے کا راستہ کھول دیا۔ اختر الایمان جو کہ اس وقت ممبئ میں ہی تھے۔ لہذا اطہر پرویز نے اختر الایمان کو خط لکھا تاکہ وہ حبیب تنؔویر کی مدد کرسکیں۔ جس کا ذکر خود انہوں نے ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں کیا ہے:

''میں نے ایک تعارفی خط اختر الایمان کے نام دیا جو اس وقت شالیمار
کمپنی میں ڈبلیو زیڈ احمد کے یہاں کام کر رہے تھے اور پھر وہاں سے
حبیب تنویر کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔'' [۲]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطہر پرویز شروع سے ہی اپنے ساتھیوں رشتہ داروں اور خاص طور پر اپنے

---

[۱] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ، اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷ ص، ۱۹۱/۱۹۲

[۲] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۱۹۳

دوست واحباب کی مدد کے لیے ہمیشہ کھڑے رہتے تھے۔ان کی پریشانی دیکھ کر خود بھی پریشان ہو جاتے اور حل کرنے کی کوشش کرتے غرض کہ وہ اپنے احباب کا بہت خیال رکھتے تھے ان کے دوست اشفاق احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''مکتبہ جامعہ سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک مسلسل ۳۵ سال کی رفاقت میں اطہر پرویز صاحب کو میں نے اچھے اور بڑے دونوں حالات میں دیکھا اور پرکھا۔مگر جب مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کسی حال میں بھی اپنے غموں اور دکھوں کا رونا کسی دوسرے کے سامنے رویا ہو۔میں ہمیشہ اُن کو صابر اور شاکر، مسرور اور مطمئن ہی پایا۔البتہ کبھی پریشان پایا بھی تو اپنے کسی عزیز دوست کی زبوں حالی دور کرنے کی فکر میں سرگرداں پایا۔اُن کے احباب میں سب سے زیادہ مصیبت زدہ راقم الحروف تھا۔ جب کبھی نامساعد حالات سے دوچار ہوا تو ''دوست آں باشد کہ گیہ دستِ دوست'' کے مصداق اطہر پرویز ہی میری دست گیری اور دلجوئی کی اور طرح طرح سے مجھے سہارا دیا۔ وہ اپنے تمام احباب سے بڑی محبت اور گرمجوشی سے ملتے تھے۔ دوستوں کا خیال، خاطرداری اور مہمان نوازی نہ صرف اُن کی بلکہ صدیقہ آپا اور ان کے سب بچّوں کی فطرت ثانیہ ہے۔کوئی بھی شخص کسی وقت بھی اُن کے گھر چلا جائے سب کے سب بڑی خوشدلی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ہر طرح سے مسرور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں'' [۱]

اطہر پرویز ہر کسی کی مدد کرتے تھے چاہیے اپنے جاننے والے ہوں یا اجنبی ہوں کیوں کہ ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ جس کی مدد کریں وہ ان کی جان پہچان کا ہو۔ بلکہ ان کا اصل مقصد دوسروں کی مدد کرنا اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا تھا رحم دلی کا یہ جذبہ جو ان کے اندر تھا کہ بلاتفریق ہر کسی کے کام آنا یہ انھوں نے اپنے گھر کے بزرگوں سے ہی سیکھا تھا۔ کیوں کہ ان کے خاندان کے بزرگ ہر محتاج کی مدد کرتے تھے ان کے

---

[۱] علی گڑھ میگزین، مشمولہ مضمون اطہر پرویز۔ایک آدمی اور ادیب، از اشفاق احمد خاں، ص:۱۴۲/۱۴۳

خاندان کی ایک اہم عادت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی ضرورت کا انتخاب دوسروں کی حاجت دیکھ کے کیا کرتے تھے حتیٰ کہ درزی کا انتخاب بھی درزی کی سلائی دیکھ کر نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی ضرورت کو نظر میں رکھا جاتا تھا۔ الہ آباد میں ایک غنی میاں رہتے تھے، جو ان کے خاندان کے درزی تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ کپڑے بالکل بھی اچھے نہیں سلتے تھے۔ اطہر پرویز اور ان کے بھائی اکثر اپنے چچا سے شکایت بھی کرتے تھے ہمیں ان درزی کے سلے ہوئے کپڑے نہیں پہننے لیکن چچا نے کہا غنی میاں ہمارے خاندانی درزی ہیں اور وہ حاجت مند بھی ہیں۔ اس واقعے سے ان کے خاندانی وضعداری کا ثبوت ملتا ہے:

> ''پینتیس چالیس سال پہلے کی بات ہے میں الہ آباد میں رہتا تھا ہمارے ایک خاندانی درزی تھے انہیں غنی میاں کہتے تھے میں اور میرے دونوں بھائی کتنا ہی احتجاج کریں لیکن ہمیں کپڑے انہیں سے سلوانے پڑتے ایک سے ایک قیمتی کپڑا آتا لیکن غنی میاں اسے اپنے مخصوص انداز سے سیتے تھے وہ بڑے دور اندیش تھے یہ کہتے تھے کہ بچوں کا جسم بڑھتا ہوا ہوتا ہے اس لیے بچوں کے کپڑے ڈھیلے ڈھالے ہی ہوں تو اچھا رہتا ہے چنانچہ ہم شیروانی کے نام پر چوغہ اور قمیض کے نام پر کرتے سے زیادہ لمبی چوڑی کوئی چیز پہنتے تھے غنی میاں جب چھوٹا کوٹ سیتے تو اوورکوٹ کا شبہ ہوتا تھا چنانچہ جب بھی ہم چچا صاحب سے احتجاج کرتے تو وہ یہی کہتے تم نہیں سمجھتے وہ بہت غریب ہیں اور ابا کے زمانے سے ہمارا کام کر رہے ہیں لہذا کپڑوں کے سینے کے لحاظ سے درزی کا انتخاب نہیں کیا گیا تھا بلکہ غریبی کے اعتبار سے درزی کا انتخاب ہوتا تھا''[1]

اسی خاندانی روایت کی وجہ سے جب اطہر پرویز علی گڑھ میں رہنے لگے تو انہوں نے وہاں اشرف نامی درزی کو اپنے لیے منتخب کیا ہر چند کہ کپڑے اچھے نہیں سیتا تھا لیکن اطہر پرویز اسی کے پاس اپنے قیمتی کپڑے سلواتے تھے اس حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں کہ:

---

[1] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۹۲/۹۳

''(اشرف درزی) مجھ کو اپنا ازلی ہمدر سمجھتا ہے اور نہ جانے کیوں مجھے اندرا گاندھی سمجھتا ہے کہ جب کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے میرے پاس آتا ہے لفظاً اگر مرہم کا کام کر سکتے ہیں تو میں نے بھی اکثر اس کے زخموں پر مرہم رکھا ہے بیچارہ سیدھا سا شریف آدمی ہے لیکن تقدیر بہت سے بدنصیبوں کو اکٹھا لے کر آ گیا ہے مجھے اس پر اتنا ترس آتا ہے کہ میں عام طور پر اپنے سوٹ اور شیروانی اسی سے سلواتا ہوں لوگ کہتے کہ پرانے فیشن کے کپڑے پہنتا ہوں لیکن مجھے اچھے لگتے ہیں کیوں کہ یہ اشرف کے سلے ہوئے ہیں اور اشرف ضرورت مند ہے'' [۱]

سیاست:

چونکہ اطہر پرویز طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست سے وابستہ ہو گئے تھے۔لیکن باقاعدہ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب ان کو مجبوراً علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔گر چہ اس وقت ذاکر حسین نے انھیں جامعہ آنے کی عوت دی تھی لیکن انہوں نے اس وقت نوکری نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور ممبئی جا کر صحافی بننے کا ارادہ رکھتے تھے اسی سلسلے میں انہوں نے اپنے دوست عبداللہ بریلوی جو اس وقت بامبے کرائنل کے چیف اڈیٹر تھے۔جن کا شمار ہندوستان کے مشہور صحافیوں میں ہوتا تھا۔اور سجاد ظہیر جو ترقی پسند تحریک کے بانی تھے ان کو بھی خط لکھا اس حوالے سے وہ اپنی کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''انہوں نے مجھے لکھا آجاؤ لیکن خرچ کی زمیداری نہیں لیتا ویسے مضامین لکھنے سے کچھ نہ کچھ مدد ہو ہی جائے گی سید سجاد ظہیر کو بھی خط لکھا انہوں نے بھی سہارا دیا اور ممبئی آنے کی دعوت دی۔'' [۲]

ان دونوں حضرات کے مثبت جواب نے اطہر پرویز کے لیے ممبئی جانے کا راستہ کھول دیا۔چنانچہ ۱۹۴۵ء میں جب وہ ممبئی کے لیے روانہ ہوئے۔تو راستے میں گوندیا نامی شہر پڑتا ہے جو کہ مدھیہ پردیش کے پاس ہی

[۱] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص:۱۱۶

[۲] اطہر پرویز، محمد شفیع الدین نیّر، مکتبہ جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵، ص:۹

واقع ہے وہاں ان کے بھائی رہتے تھے۔ وہ اپنے بھائی سے ملاقات کے غرض سے تین چار دن کے لیے وہاں ٹھہرنے کے ارادے سے گئے۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ گویا وہ پانچ سال تک وہاں رہیں۔ یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اس کا اعتراف خود انہوں نے بھی کیا ہے:

''صحافت کا کیریر سیاست کی بھنیٹ چڑھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ ہو گیا اس لیڈری میں پانچ سال گزر گئے'' [۱]

گرچہ طالب عملی کے زمانے سے ہی پرویز صاحب نے کمیونسٹ پارٹی کا اثر قبول کیا تھا۔ اور کمیونسٹ کے لیڈروں سے اکثر ملاقات بھی کرتے تھے جس کا انہوں نے خود ذکر کیا جب وہ شروع میں علی گڑھ آئے تو انہوں نے دوودھ پور میں ایک مکان کرایے پر لیا۔ جس کے مالک بہرے نواب تھے وہیں وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں سے ملتے تھے۔ جس کا ذکر انہوں نے خود ان لفظوں میں کیا ہے کہ:

''کمیونسٹ پارٹی کے انڈر گراؤنڈ لیڈر یہاں اکثر وبیشتر آتے تھے۔ یہاں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا دفتر بھی تھا۔ اگلے سال ہم لوگوں نے یہ مکان چھوڑ دیا۔'' [۲]

پرویز صاحب کمیونسٹ تھے جب کہ ان کے والد مسلم لیگی تھے۔ اور ان کے یہاں کمیونسٹ نے شدت اختیار کر لی تھی۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں بہت سی باتیں برداشت کر لیتا ہوں لیکن سیکولرزم کی توہین برداشت کرنا میرے بس میں نہیں کیوں کہ اس کے ذریعہ میں عام انسانوں سے اپنا رشتہ قائم کرتا ہوں اور اسوقت بظاہر میرا سیکولرزم خطرے میں پڑا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔'' [۳]

---

[۱] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۵۰

[۲] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۱۳۱

[۳] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر، علی گڑھ اشاعت ثانی، فروری ۲۰۰۷، ص: ۸۲

ناگپور میں عملی سیاست میں حصہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک:

گوندیا ناگپور سے قریب ایک شہر ہے اس شہر کو سرمایہ داروں کا شہر کہا جاتا تھا کیونکہ اس شہر میں بیڑی، چاول اور چمڑے وغیرہ کے کارخانے کثرت سے موجود تھے ایسا گمان ہوتا تھا کہ یہ سرزمین خاص طور سے مزدوروں کے لیے ہی بنی ہے اور ان دنوں وہاں مزدور تحریک بڑے زوروں پر تھی۔اطہر پرویز کو سیاست سے بہت دلچسپی تھی لہذا انہوں نے بڑھ چڑھ کر مزدور تحریک میں حصہ لیا۔اس وقت گوندیا میں جو مزدور رہنما پہلے سے موجود تھے ان کے ساتھ جلسے وجلوس میں جانا شروع کیا ٹریڈ یونین سے بھی زیادہ قریب ہوئے حتیٰ کہ باقاعدہ طور پر ٹریڈ یونین کے ممبر بن گئے مختلف انجمنیں قائم کیں اور مختلف انجمنوں وتحریکوں میں حصہ بھی لیا۔ اور فوجیوں کی بغاوت کی تحریک میں بھی شامل ہو گئے (۲۶) دوسری وجہ یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی کا صوبائی دفتر بھی گوندیا میں ہی تھا اور اس صوبے کی پارٹی کے جزل سکریٹری بھونا دامکر جی تھے کچھ عرصے کے بعد اطہر پرویز بھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے اسی دوران ان کی ملاقات ایک شخص محمد زبیر سے ہوئی جن کا تعلق علی گڑھ سے تھا پیشے سے استاد تھے اور وہ ناگپور میں ہی انجمن ہائی اسکول میں پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے انہوں نے اطہر پرویز سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کے اسکول میں بحیثیت استاد ملازمت کریں ان کے اصرار پر پرویز صاحب نے یہ ملازمت اس شرط کے ساتھ قبول کی کہ جب بھی پارٹی کا کوئی ضروری کام آن پڑے گا تو وہ اس نوکری کو فوراً چھوڑ کر چلے جائے گئے اس شرط پر پرنسپل بھی راضی ہوئے اور اس طرح اطہر پرویز نے وہاں پڑھانا شروع کیا۔اسکول کے ایک واقعے کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے ان کی تحریریں زیادہ تر یادوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان کی زندگی سے متعلق واقعات اکثر و بیشتر ان کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ایک دفعہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر سالانہ معائنہ کرنے کے غرض سے آیے ان کو اطہر پرویز کے پڑھانے کا طریقہ تو پسند آیا لیکن ان کا لباس پسند نہیں آیا اس واقعہ کا ذکر خود انہوں نے سیدھے سادے انداز میں اس طرح کیا ہے:

> ''جہاں تک پڑھانے کا تعلق ہے قابل قبول ہوں تاریخ اور سوکس کا
> اچھا استاد ہوں کلاس ڈسپلن کے بارے میں لکھا ہے کہ سب سے اچھی
> بات ہے لباس باغیانہ اور حکومت کے نقطۂ نظر سے نامناسب ہے........

چلتے ہوئے ہیڈ ماسٹر کو مشورہ دے گئے کہ دوسرے استاد کی تلاش جاری رکھے اور مجھے جلد از جلد سبکدوش کرنا چاہیے ان کی موجودگی طلبہ کے لیے مضر'' ۱؎

کچھ عرصے کے بعد اس عارضی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہ مکمل طور پر پارٹی کے کاموں میں مصروف ہو گئے بہت قلیل مدت میں نہ صرف یہ کہ اطہر پرویز بحیثیت سیاسی لیڈر معروف ہوے بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری بھی بن گئے اسی اثناء میں ایک حادثہ ایسا پیش آیا جس نے اطہر پرویز کی سیاسی زندگی میں چار چاند لگوا دیے دراصل چتر بھج بھائی جسانی جو کہ،، موبی سکا کمپنی ،، کے مالک تھے اور بمبئی میں سکا نگر' آسام میں سکارٹی گارڈ اور کانگرس کمیٹی کے ممبر بھی تھے چوں کہ جسانی بھائی سیاسی آدمی تھے اسی لیے کئی بار جیل بھی گئے تھے جسانی بھائی کے اور بھی دو بھائی تھے جن میں سے ایک تو کٹر فرقہ پرست تھے جن کا تعلق راشٹریہ سوئم سیوک سے تھا تیسرے کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی محض کاروباری آدمی تھا تیسرے بھائی نے گوندیا میں ایک انگریز گورنر کو بلایا اور اس کے لیے شاندار استقبال کی تیاریاں کی گئی جب کہ یہ وہی گورنر تھا جس نے اس کے بھائی چتر بھائی جسانی کو گرفتار کروایا تھا اسی واقعے کی بناء پر چتر بھائی جسانی اور اطہر پرویز کے درمیان دوستی کے تعلقات قائم ہوئے جب جسانی بھائی جیل سے چھوٹے تو وہ ان سے ملنا چاہتے تھے اطہر پرویز کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو انھوں نے ایک سواگت کمیٹی بلوائی جس میں دوسری تمام جماعتوں کے لوگ بھی شامل تھے گویا جلسہ بھی بہت کامیاب ہوا اور اطہر پرویز پر جو غداری کا الزام سن ۱۹۴۲ء میں لگایا گیا تھا وہ بھی صاف ہو گیا اس واقعے کا تفصیل سے ذکر انھوں نے اپنے مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے:

''چناچہ یہ بات ۱۹۴۵ء کی ہے انھوں نے صوبے کے انگریز گورنر کو گوندیا میں بلایا اس کو ایک شاندار استقبالیہ دیا اور سونے کا ایک قیمتی ہار اپنی طرف سے ان کے گلے میں پہنایا.....اس استقبالیہ کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ میں نے یہ دیکھا تو شہریوں کا ایک جلسہ بلایا۔ کامریڈ جھا اور میں نے اس جلسے کو ایک احتجاجی جلسے میں بدل دیا......میں نے

۱؎ اطہر پرویز، محمد شفیع الدین نیّر، مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دلی ۱۹۸۲ء، ص:۶/۵

اپنی تقریر میں کہا.........'بڑے شرم کی بات ہے کہ اس شہر کے ممتاز رہنما کے ہاتھوں میں جس نے ہتھکڑیاں پہنائی تھیں، آج اس کا بھائی اسی گورنر کے گلے میں سونے کا ہار پہنا رہا ہے'.......یہ تقریر اپنی جذباتیت اور سچائی کی بناء پر بہت پسند کی گئی کیونکہ فی الواقعی چتر بھج بھائی جسّانی کو جب گوندیا میں گرفتار کیا گیا تو یہی گورنر صاحب بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے ۔انگریزی زمانے میں گورنر کے ہاتھ میں بڑے غیر معمولی اختیارات تھے۔ ہمارا آج کا گورنر تو محض ایک آئینی حیثیت رکھتا ہے بہر حال اس تقریر کو اخباروں نے بڑی بڑی سرخیوں میں چھاپا.........سچ پوچھے تو سی پی میں میری دھاک اسی تقریر سے بیٹھی تھی میں جدھر جاتا لوگ بڑے تپاک سے ملتے'' [۱]

مذکورہ بالا واقعے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اطہر پرویز حق گو، سچے اور بے باک لیڈر تھے گویا اسی بے باکی اور حق گوئی کی وجہ سے ان کو شہرت نصیب ہوئی ان کا خود بھی یہی ماننا تھا کہ قوم کے لیڈر کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہونا چاہیے اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مفاد پرست نہ ہو جو صرف اپنے جاننے والوں اور رشتے داروں کے کام آئے بلکہ ساری قوم کی بھلائی کے لیے کام کرے کیونکہ لیڈر عوام سے ہی بنتا ہے لہذا ان کے مطابق ایک سیاسی لیڈر کو مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے وہ لکھتے ہیں:

۱۔ ''کہ وہ آدمی یقیناً عظیم ہے جو بنی نوع انسان سے ہمدردی رکھتا ہے اور ان کے کام آتا ہے۔
۲۔ وہ آدمی اس کے بعد عظمت کو چھوتا ہے جو اپنی قوم کے کام آتا ہے
۳۔ وہ آدمی اسے کم تر ہے جو صرف اپنے فرقے کا خیال رکھتا ہے اور اسی کے کام آتا ہے
۴۔ وہ آدمی گھٹیا ہے جو صرف اپنے رشتہ داروں کے کام آتا ہے چاہے کھدر کے کپڑے اور گاندھی ٹوپی پہنے'' [۲]

اطہر پرویز خود ایک دردمند انسان تھے۔ سرسید کی طرح ان کو بھی قوم کا درد تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

۱۔ اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص:۳۴

۲۔ اطہر پرویز: علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ، ص:۴۶

بے سہارا مزدوروں کا ساتھ دیا جو کہ مل مالکوں کے ستائے ہوئے تھے اس زمانے میں یہ رواج عام تھا کہ مزدوروں سے مزدوری تو پوری لیتے تھے لیکن اجرت کم دیتے تھے جب اطہر پرویز مزدوروں کے احوال سے اچھی طرح واقف ہوئے تو انہوں نے گوندیا میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور جس مقصد کے لیے وہ ممبئی جا رہے تھے اس کو بھی ترک کر دیا اور مزدورں کو انصاف دلانے کے لیے کوشاں رہے حتیٰ کہ ان کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ دراصل گوندیا میں سردار جی مل مالک تھے جو کہ لاکھوں کے مالک تھے لیکن مزدوروں کا حق ادا نہیں کرتے تھے۔ اطہر پرویز نے ایک نوٹس سردار جی کو بھیجا اگر چہ انہوں نے اس نوٹس کو دھمکی سے تعبیر کیا لیکن اطہر پرویز نے ایک بھی نہ سنی مل میں چھ دنوں تک مسلسل ہڑتال رہی آخر کار مزدوروں کی جیت ہوئی۔ اس وقت اطہر پرویز ٹریڈ یونین کی بھی رہنمائی کر رہے تھے اور یونین بنگال اور ناگپور سے بھی وابستہ تھے اس کے علاوہ بھی انہوں نے کہیں بار ہرتال کروایی اور وہ کامیاب بھی ہوئے کچھ کا ذکر انہوں نے خود اپنے مضمون میں کیا ہے:

''سردار جی چاول کی کئی ملوں کے مالک تھے............ان کے کارخانوں میں مزدوروں کو بہت کم اجرت ملتی تھی۔ میں نے ان کے مزدورں کی با قاعدہ ایک تنظیم بنائی اور چند روز بعد با قاعدہ ایک نوٹس دیدیا۔ سردار جی لکھ پتی آدمی تھے، ایسی باتیں سننے کے عادی نہ تھے۔ وہ اس قانونی نوٹس کو دھمکی سے تعبیر کرنے لگے اور انہیں یہ بات سخت ناگوار گزری کہ ہم ان کے کاروبار میں کیوں دخل دیں۔ بار بار کہتے تھے صاحب یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اسے آپ کا کیا تعلق''..... میں نے ان کو ٹریڈ یونین کے بارے میں سمجھایا۔ با قاعدہ قانوں کا حوالہ دیا..... لیکن جن لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے وہ شاید قاعدے قانون کو بہت اہمیت نہیں دیتے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ ''میرے کارخانے ہیں' میں جو چاہے اجرت دوں، آپ کون ہوتے ہیں بیچ میں بولنے والے؟'' بہر حال رجسٹرڈ یونین تھی، تمام مزدور یونین کے ساتھ تھے۔ بڑی معمولی اجرت پر کام کر رہے

تھے۔ جنگ نے گرانی کو بڑھا دیا اور جنگ کے بعد یہ گرانی اور زیادہ ہوش
ربا ہوگئی تھی اس لیے مزدورں کے مطالبے جائز تھے۔ بہرحال ہرتال
ہوئی، چھ دن تک خاصہ ہنگامہ رہا اور پھر بلا آخرانہیں یونین سے معاملہ
طے کرنا پڑا۔ سردار جی ناراض ہو گئے لیکن مزدوروں کے مطالبے کے
سامنے انہیں جھکنا پڑا ''[۱]

اطہر پرویز کی سیاسی زندگی بہت مشکلات میں گزری جیل کی سختیاں، کھلم کھلا مخالفتوں کا زور اتنا بڑا کہ ہے ان کو کچھ عرصے تک روپوش بھی رہنا پڑا۔ نیز ان پر جان لیوا حملے کروائے گیے کیوں کہ گوندیا میں اکثر مل مالک ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس وقت وہ یونین ٹریڈ کے لیڈر تھے ان تمام مشکلات کے باوجود بھی ان کے قدم لڑکھڑائے نہیں بلکہ وہ ثابت قدم رہے۔ ایک سازش کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون ''جنوں میں جتنی بھی گزری''میں اس طرح کیا ہے کہ:

''مجھے کسانوں کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے گوندیا سے ملے ہوئے
ایک گاؤں جانا تھا۔ یہ شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھے۔ لیکن
میں گوندیا ہی کی ایک میٹنگ میں اتنا مصروف ہوگیا کہ مجھے گاؤں پہنچنے
میں خاصی دیر ہوگی۔ بہرحال میں دو گھنٹے کے بعد پہنچا مغرب کا وقت
ہوگیا جلسہ ہوا ایک گھنٹہ کے بعد وہاں سے واپس ہوا میرے ہاتھ میں
کاغذات کا ایک تھیلہ تھا مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے پیچھے پیچھے آرہا ہو
میں نے مڑکر دیکھا تو واقعی ایک آدمی تھا اندھری رات تھی میں نے اپنے
قدم تیز کیے اس نے بھی اپنی قدموں کی رفتار تیز کردی اور اسی دیر میں وہ
میرے بلکل پاس آ گیا میں اندر سے ڈر رہا تھا لیکن پھر ہمت سے کام لیتے
ہوئے رک گیا۔ میرے سامنے شکور کھڑا تھا شہر کا چھٹا ہوا بدمعاش........وہ
مسکرایا بولا ماسٹر بابو آج آپ کیوں لیٹ ہوگئے خدا کو آپ کی جان بچانی

---

[۱] اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص۲۹

تھی ورنہ اگر آپ صحیح وقت پر آتے تو میں نے مار کر پلیا کے نیچے ڈال دیا ہوتا'' مگر تم مجھے کیوں مارنا چاہتے تھے'' الفاظ بمشکل میری زبان سے نکل رہے تھے کہنے لگا ماسٹر بابو سیٹھ لوگوں نے آپ کو مارنے کے لئے مجھے پانسو روپے دیے تھے۔ میں دارو پی کر آپ کا کام تمام کرنے آیا پر آپ کو دیر ہوگئی آپ نہیں آئے تو میں نے کسان بھائی لوگوں سے سنا۔ پھر آپ کا بھاشن سنا مجھے اپنے اوپر بہت غصہ آیا تم لوگوں کی بھلائی کی بات کرتے ہو اور میں ہتھیا رتم کو ماروں ۔ ماسٹر بابو میرا مغز پلٹ گیا۔ ...اب میں تمہارے ساتھ ہوں مجھے بھی اپنی پارٹی کا ممبر بنالو اور مجھے بتاؤ تم جسے کہو اس کو ماردوں گا فکر مت کرنا۔ آج سے تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا شکور کی زبان میں فرق نہیں آئے گا۔ وہ میرا باڈی گارڈ بن گیا'' [1]

بعد میں جب جیل میں ان کی ملاقات سردار جی سے ہوئی تو اس راز کا پردہ بھی فاش ہوگیا کہ سردار جی نے ہی اطہر پرویز پر جان لیوا حملہ کروایا تھا۔ لیکن اطہر پرویز عمدہ اخلاق کے مالک تھے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے دشمن بھی ان سے محبت کیے بنا نہیں رہ سکے اسی لیے سردار جی اور شکورا (یعنی جس نے حملہ کیا تھا) دونوں کی بعد میں پرویز صاحب سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے کہ'' فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے۔ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے'' کچھ ایسا ہی اطہر پرویز کے ساتھ ہوا جس نے مارنے کا ارادہ کیا تھا وہی محافظ بن گیا بعد میں جب شکورا کی اطہر پرویز سے دوستی ہوگئی تو انہوں نے اپنی پارٹی ہیڈ کواٹر کو شکورا کی رپوٹ بھیجی تو انہوں نے ہدایت کی کہ اسے اپنے ساتھ رکھو اور تھوڑا بہت پڑھاؤ اسے ہندی سکھانے کی ذمہ داری کسی دوسرے کامریڈ کی تھی اردو اور بقیہ تعلیم دینے کی ذمہ داری اطہر پرویز کی تھی۔ مارکسزم پر زیادہ زور دیا گیا۔ دو سال تک شکورا اطہر پرویز کا باڈی گارڈ بن کر سایے کی طرح ان کے ساتھ رہا اور ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔

اسی اثناء میں دوسری سیاسی جماعتوں کے لیڈر بھی اطہر پرویز کے مخالف ہو گئے اور ناگپور کے اخبار

---

[1] اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص ۳۱/۳۲

نویسوں نے بھی دل بھر کے مخالفت کی ۔ وہ زمانہ اطہر پرویز کے لیے بہت مشکل ثابت ہوا ''ترن بھارت مرہٹی روزنامہ'' جو کہ ناگپور سے نکلتا تھا اس اخبار نے ان کی کھل کر مخالفت کی ۔ پوسٹر نکال کر الزام تراشی کی گئی حتیٰ کہ یہ بھی لکھا گیا کہ وہ سور کا گوشت کھاتے ہیں غرض طرح طرح کے الزام لگائے گے لیکن اطہر پرویز اپنے اصولوں کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ ان کی پارٹی نے بھی جوابی کاروائی شروع کی بعد میں چتر بھائی جسانی نے جو کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور کئی کمپنیوں کے مالک تھے ان کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے انہوں نے اس سلسلے کو ختم کرنے میں اطہر پرویز کی مدد کی اور بلآخر یہ کولڈ وار ختم ہوا اس دردناک دور کا ذکر اطہر پرویز نے اپنے ایک مضمون ''جنوں میں جتنی بھی گزری'' میں اس طرح کیا ہے:

> ''ہاں تو یہی وہ زمانہ تھا جب میری مخالفت نے شدت اختیار کر لی تھی ۔
> ترن بھارت مرٹھی روزنامہ جو ناگپور سے نکلتا تھا اس سے میری بڑی مخالفت تھی آر ایس ۔
> ایس والوں کے ساتھ کانگریسی بھی میری مخالفت میں آگے آگے تھے ....
> .میرے خلاف جو پوسٹر نکلے اس میں لکھا گیا کہ میں سور کا گوشت کھاتا ہوں.......غرض طرح طرح کے حملے کئے گئے''۔[1]

قیدِ فرنگ:

اس زمانے میں اطہر پرویز اپنی جان پر کھیل کر کسانوں اور مزدروں کے لیے لڑتے رہے وہ حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اسی لیے کسی کی حق تلفی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان سے مزدورں کا استحصال نہیں دیکھا گیا کیوں کہ اس وقت فرنگیوں کی حکومت ختم نہیں ہوئی تھی اور ان کے مظالم عوام پر بدستور جاری تھے ۔ جب اطہر پرویز نے مزدوروں کے حق کے لیے آواز اٹھائی اور مزدورں کے ساتھ مل کر کئی ملوں میں ہڑتال کروائی ۔ یہ ہڑتالیں تو کامیاب ہوئی لیکن اطہر پرویز کو گوندیا کے سیٹھوں اور سرداروں کی عداوت کا نشانہ بنناپڑا جس کی وجہ سے انہیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ حکومت تک نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اطہر پرویز کو جہاں بھی دیکھا جائے ان کو فوراً وہی شوٹ کیا جائے پولیس والوں نے اندھا دھند گولیاں چلائی بعض

---

[1] اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص۳۴

مزدوروں کو مارا گیا بعض کو جیل بھیجا گیا، مگر ہڑتال پھر بھی جاری رہی ادھر حکومت نے اطہر پرویز کے نام وارنٹ جاری کر دیا تھا لہذا ان کو مجبوراً کچھ عرصے تک روپوش رہنا پڑا۔ ان دنوں صدیقہ سیوہاری ناگپور میں ہی اپنے بھائی کے یہاں قیام پذیر تھیں ۔ راتوں رات اطہر پرویز نے اپنا حلیہ بدل کر چند ساتھیوں کے ساتھ جا کر صدیقہ سیوہاری (یہ ان کی ماموں زاد بہن تھی بعد میں ان سے ہی اطہر پرویز کی شادی ہوئی تھی) کو اس صورتحال سے باخبر کیا۔ جب ہڑتالیں کامیاب ہوئی تو ان کے نام جو وارنٹ جاری ہوا تھا وہ تو رفع دفع ہو گیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اطہر پرویز کو جیل بھی جانا پڑا گوندیا میں ہی انہیں سن ۱۹۴۶ء میں گرفتار کیا گیا جب کہ اس وقت اطہر پرویز ضلع کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری تھے اس کے علاوہ تین ٹریڈ یونین کے رہنما اور بنگال و ناگپور ریلوے یونین سے بھی وابستہ تھے گویا ان کی گرفتاری سے عوام میں افراتفری مچ گئی انہوں نے اپنی گرفتاری کا ذکر اس طرح تفصیل سے کیا ہے:

''یہ شاید اکتوبر کا مہینہ تھا۔ مجھے گوندیا میں گرفتار کیا گیا تھا مزدوروں کی تحریک شباب پر تھی..... آزادی کی جدوجہد اور مزدوروں کی ہڑتالیں مل کر دو آتشہ ہوگئی تھیں ....۔ میں اس وقت ضلع کیونسٹ پارٹی کا سکریڑی اور تین ٹریڈ یونینوں کی رہنمائی کر رہا تھا اور بنگال ناگپور ریلوے (BNR) یونین سے وابستہ تھا۔ میری گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ۔ پولیس والوں نے یہ غلطی کی کہ اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے مجھے بیچ بازار سے ہتھکڑی پہنا کر لے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے بے عزتی ہوگی، لیکن وہاں الٹا اثر ہوا لوگوں کا غصہ بھڑک اٹھا ...... صدر تھانے پہنچتے پہنچتے بھیڑ جمع ہوگئی اس چھوٹے سے شہر میں جس کی آبادی چالیس پچاس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی، پانچ ہزار اکٹھا ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی ۔ اب میں اندر تھا۔ باہر نعرے لگ رہے تھے، مجھے ایک لمحے کے لیے یہ خیال ضرور آیا کہ کہیں پولیس کمشنر تشدد پر نہ اتر آئے

.........دارالخلافہ ناگپور سے ہدایت آئی کہ مجھے جلد از جلد بھنڈارا ضلع

جیل میں منتقل کردیا جائے چنانچہ راتوں رات مجھے وہاں پہنچادیا گیا''[۱]

اطہر پرویز جیل میں بھی بہت فعال و متحرک رہے چوں کہ وہ خود ملنسار طبیعت کے مالک تھے یہی وجہ تھی جب کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو قیدیوں سے ملنے جاتے اوران کی پریشانیاں پوچھتے اور جہاں تک ممکن ہوتا قیدیوں کی پریشانیاں کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔ انہیں مطالعے کا بچپن سے ہی بے حد شوق تھا یہ شوق قید فرنگ میں بھی باقی رہا۔شروع میں جیل میں ان کے پاس کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ تاہم دوسرے سیاسی لیڈر جو پہلے سے قید میں تھے ان کے پاس سے چند کتابیں مل جاتی تھیں کچھ دنوں کے بعد اطہر پرویز کو جیل میں ایک خاص دوست ہزار نویس ملا جوان کے لیے باہر سے کتابیں بھجوادیا کرتا تھا ان کی مدد سے پرویز صاحب نے جیل میں بہت سے بہترین جاسوسی ناول اور دیگر کتابوں کا مطالعہ کیا۔اس زمانے میں ان کے مطالعے کی رفتار بہت تیز ہوگئی تھی تین سوصفحات روز پڑھ لیتے تھے[۳۴] اور جیلر کے توسط سے بھی بعض ناول پڑھے اسی دوران انہوں نے پنڈت نہرو کی ''گلمس آف دی ورلڈ ہسٹری'' تین بار پڑھی۔جس سے ان کو آگے چل کر بہت فائدہ ہوا۔ ہزار نویس کے کہنے پر ہی اطہر پرویز نے لاء کالج جوئن کیا تھا۔لیکن ڈگری حاصل نہ کرسکے اس طرح دیکھا جائے تو جیل میں اطہر پرویز کی بہترین رفیق کتابیں ہی تھیں۔لیکن جلد ہی اطہر پرویز کو جیل میں ایک شنکر نامی شاگرد بھی ملا شنکر پچیس چھبیس برس کا نوجواں تھا، جو کہ جاہل تھا اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا گویا پرویز صاحب نے اس کی علم کی پیاس بجھائی۔حسب عادت وہ جیل میں ایک دو دن کے بعد سب کے پاس چکر لگاتے تھے جب شنکر سے ملے تو شنکر نے اپنی داستان غم سنائی کہ میں جاہل ہوں اور میری بیوی میٹرک پاس ہے شنکر کی کہانی سن کر اطہر پرویز کو شنکر سے غیر معمولی ہمدردی ہوگئی میں نے کہا شنکر تم پڑھنے کو تیار ہو تو میں تمہیں پڑھاؤں گا۔[۳۵] شنکر کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون میں اس طرح کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ شنکر تھا اسے رات دن اسی سیل میں بند رکھتے۔صرف کھانا دینے کے

لیے کھولتے۔ضرورت کے لیے بھی باہر نہیں جاسکتا تھا وہیں فارغ ہوتا۔

---

[۱] اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، :ص ۱۹/۲۰

وارڈ کا کہنا تھا کہ نیتا جی دو دن میں اس کی نسیں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ گناہ خانہ بہت برا تھا'' [۱]

اس طرح اطہر پرویز نے شنکر کو اپنا شاگرد بنایا اور باقاعدہ اس کے لیے نصاب تیار کیا۔ اس طرح شنکر جو کہ جیل میں آنے سے پہلے جاہل اور علم وادب سے محروم تھا لیکن اطہر پرویز کی صحبت میں رہ کر اچھا خاصا پڑھا لکھا انسان بن گیا اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ گناہ خانے سے شنکر کو کیسے باہر نکالا جائے گویا اطہر پرویز نے جیلر سے التجا کی کہ وہ شنکر کو گناہ خانے سے باہر آنے کی اجازت دے دیں کیونکہ جیلر سے بھی اطہر پرویز کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی اور اتفاق سے اس دوستی کی وجہ بھی علم ہی تھا دراصل جیلر صاحب غالب کی شاعری کے شیدائی تھے اسی لیے کبھی کبھی غالب کے اشعار سنے اور سمجھنے کے لیے اطہر پرویز کے پاس آتے تھے۔ ۳۵ جیلر صاحب کو شنکر کے بارے میں بتایا اور ان سے کہا کہ میں شنکر کو خاص طور پر پڑھانا چاہتا ہوں وہ بھی پڑھ لکھ جائے گا اور میرا وقت بھی کٹ جائے گا آپ کو بھی ثواب ملے گا۔ ۳۷ بلا آخر اطہر پرویز نے جیلر کو راضی کر لیا اور انہوں نے شنکر کو گناہ خانے سے باہر آنے کی پرمیشن دے دی۔ شنکر کی جیل میں ہی باضابطہ طور پر کلاسیس شروع ہوگئیں۔ چونکہ انہوں نے شنکر کا نصاب اسی نوعیت کا تیار کیا تھا جس طرح کہ عام طور پر سکولوں کا نصاب ہوتا ہے۔ جس کے متعلق وہ خود اس طرح رقم طراز ہیں کہ:

> ''اب میں نے شنکر کے لیے باقاعدہ نصاب تیار کیا۔ اس نصاب میں حساب کے علاوہ باقی تمام علوم کی جھلک تھی۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب، سیاست، سائنس اور کسی حد تک فلسفہ اور معاشیات وغیرہ بھی.........
> شنکر واقعی ذہین تھا، وہ ایک بار بتانے میں سمجھ لیتا تھا......... میں اسے ایک گھنٹہ انگریزی اور اردو پڑھاتا باقی وقت زبانی کام ہوتا ''گلمس آف دی ورلڈ ہسٹری'' بڑی کام آئی'' [۲]

---

۱ اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص ۲۴

۲ اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص ۲۸

اطہر پرویز نے شنکر کو پڑھا لکھا کر اچھا خاصا باشعور انسان بنایا حتی کہ وہ روسی اور فرانسیسی کے انقلاب کو بھی سمجھنے لگا چین اور ہندوستان کی تاریخ میں بھی دلچسپی لینے لگا گو انہوں نے شنکر کی زندگی سنوار دی۔

شنکر کے علاوہ سردار جی بھی جیل میں ان کے دوست تھے یہ وہی سردار جی ہے جو چاول مّل کے مالک تھے اور انہوں نے ہی سپاری دے کر اطہر پرویز کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ جس کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے جیل میں ان کی ملاقات سردار جی سے ہوئی۔ دراصل سردار جی کو ایس۔ ڈی۔ ایم کی بیٹی کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا روئے عامہ بھی سردار جی کے خلاف تھی اور تاکید کی گئی تھی کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے دفعہ تین سو دو کا مقدمہ دائر کر دیا تھا ایسے وقت میں پرویز صاحب نے ان کا ساتھ دیا گو یا وہ مصیبت کے وقت اپنے دشمنوں کے بھی دوست بن جاتے تھے اس طرح انہوں نے ساری پرانی باتوں کو نظر انداز کر کے جیل میں سردار جی کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ اس حوالے سے وہ اپنی تصنیف ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''میں نے سندر سے کہہ دیا کہ سردار جی ہمارے کھانے میں شریک ہوں گے۔ چنانچہ زیادہ کھانا پکنے لگا۔ دو روز تو سردار جی نے الگ کھایا، پھر میرے ساتھ کھانے لگے۔ چند روز میں ہماری ان کی گہری دوستی ہوگئی۔'' [۱]

سندر اطہر پرویز کا خدمت گار تھا جو کہ جیل میں اپنا کاروبار کرنا چاہتا تھا لیکن پیسے کی قلت تھی لہذا جیل سے نکلنے سے پہلے اطہر پرویز نے سندر کی بھی مالی امداد کی۔ اس طرح سندر نے جیل میں اپنا بیڑی کا کاروبار شروع کیا۔ ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ قدم قدم پر لوگوں کی مدد کرتے تھے سماجی کاموں کے لیے ہمیشہ تیار رہتے کسی بھی موقعے کو نظر انداز نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد سب سے پہلے ان دوستوں کے گھر گئے جنھوں نے اطہر پرویز کے ہاتھ اپنے گھر والوں کو خط بھجوایا تھا چنانچہ سب سے پہلے سردار جی کے یہاں گئے کیونکہ ان کا گھر گونڈیا میں ہی تھا اس منظر کی تصویر کشی انہوں نے اپنے مضمون میں اس طرح کی ہے:

> ''جیل سے چھوٹنے کے بعد میں سردار جی کا خط ان کی بیوی کے پاس

---

[۱] اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص ۳۰

لے کر گیا تھا رات ۹ بجے تھے لیکن ایسی بھیانک صورت حال تھی میں آج
بھی اس کے تصور سے کانپ جاتا ہوں بمشکل تمام گھر کا دروازہ کھلا، ان
کی بیوی نکلیں .... جب میں نے انہیں خط دیا اور بتایا کہ میں جیل
سے آیا ہوں۔ انہوں نے جھٹ سے دورازہ بند کیا....... جلدی جلدی
خط پڑھا اور پڑھنے کے بعد زاروقطار رونے لگیں۔ میں ایک گھنٹہ ٹھہرا
میں نے دلاسے کے الفاظ کہے....... لیکن وہ روتی تھیں اور کچھ بول نہ
سکتی تھیں۔ مجھے خیال ہوا کہ سردار جی جیل میں اتنے پریشان نہیں تھے
جتنی ان کی بیوی....... میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں اور پھر
میں ان سے اجازت لے کر واپس ہو گیا'' [1]

اس کے بعد اطہر پرویز شنکر کے گھر گئے جیل سے رہا ہونے سے پہلے ہی انہوں نے شنکر سے یہ عہد لے رکھا تھا کہ وہ اپنا مطالعہ جاری رکھے گا اور وہ اس کے لیے باہر سے کتابیں بھیجیں گے۔ انہوں نے جیلر سے بھی شنکر کا خاص خیال رکھنے کو کہا۔ ان کی دوستی میں بہت بے تکلفی تھی۔ شنکر نے جیل میں کئی بار اپنی بیوی اور گھر کے متعلق ان سے ذکر کیا تھا اسی لیے جب پرویز صاحب جیل سے رہا ہوئے تو شنکر نے ان کے ہاتھ اپنی بیوی کو خط بھیجا۔ اگر چہ شنکر کا گھر بہت دور تھا اور لمبی مسافت کے بعد بھی انہوں نے شنکر کے گھر خط پہنچایا۔ جس کا ذکر انہوں نے خود اپنے مضمون میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ کہ:

''میں نے ٹھیک اسی کے دروازے پر دستک دی اندر سے ایک مہاراشٹرین
لڑکی نکلی میں نے شنکر کا نام لیا وہ اچھل پڑی۔ کہنے لگی آپ بھنڈار جیل
والے گروجی ہیں نا۔ آپ ہی نے تو اسے لکھنا پڑھنا سکھایا ہے ...... وہ
عجیب انداز سے اچھل رہی تھی۔ بار بار وہ شنکر کا حال پوچھ رہی تھی۔ معلوم
ہوا کہ یہی شنکر کی بیوی ہے میں نے اسے شنکر کا لفافہ دیا جو بڑے احتیاط
سے لایا تھا اس نے بڑی خاطر مدارت کی طرح طرح کی مٹھائیاں منگوائیں۔

---

[1] اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی، ص ۳۵

میں نے انسانی چہرپراتنی غیرمعمولی مسرت بہت کم دیکھی تھی۔ پوچھنے لگی
اب تو وہ انگریزی اور اردو سیکھ گیا ہے اپنے خط میں بڑے بڑے لوگوں
کے نام لکھتا ہے آپ نے میرے اوپر احسان کیا.....آپ کتنے اچھے ہیں
......چلتے وقت اس نے مجھے روکا اور اٹھ کر اندر گئی۔اندر سے ایک بڑا
لفافہ لائی۔ میرے ہاتھوں میں دے دیا میں نے کہا ''یہ کیا ہے؟'' کہنے
لگی ''اپنے گھر جا کر دیکھئے گا'' میں نے اس کے سامنے لفافہ کھولا.....
اس میں سوسو روپے کی گڈیاں تھیں ......دس ہزار روپے کی مجھے یقین
نہ آیا۔میں جاگ رہا ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں. میں نے کہا ''یہ
کیا؟'' کہنے لگی شنکر کا آدیش ہے ہمیں تو اسے زیادہ دینا چاہیے تھا'' میں
گھبرا گیا...میں نہیں لے سکتا کہنے لگی آپ نے اسے پڑھایا اس کی زندگی
پلٹ دی .....یہ معمولی بات ہے. میں اس کی قیمت کبھی نہیں چکا سکتی''
میں نے کہا'' میں علم کا سودا نہیں کرتا۔میں نے شنکر کے ساتھ بہت اچھا
وقت گزارا ہے اس کے لیے کیسا معاوضہ؟'' ابھی اس کو پاس رکھو....
جب شنکر آجائے تو اس سے کہنا کہ اس روپے سے کوئی اچھا سا پاٹشالہ
کھوادے یا کسی اسکول کو دے دے۔ میں سمجھوں گا کہ مجھے مل گیا'' [۱]

جب اطہر پرویز واپس آنے لگے تو شنکر کی بیوی نے انہیں معاوضہ دیا جس کو لینے سے انہوں نے انکار کردیا۔لیکن جب شنکر کی بیوی نے بہت ضد کی تو اطہر پرویز نے اسے کہا تم یہ پیسے رکھ لو جب شنکر جیل سے باہر آئے گا تو تم دونوں مل کران پیسوں سے ایک اسکول کھولنا مجھے لگے گا مجھے میرا معاوضہ مل گیا۔گویا اطہر پرویز کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہر گاؤں اور ہر شہر میں اسکول ہوتا کہ ہر بچہ آسانی سے تعلیم حاصل کر سکے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے موریشس اور علی گڈھ میں اسکول کھولا۔اس طرح سے دیکھا جائے تو پرویز صاحب نے ناگپور میں خطرات سے پرُ زندگی بصر کی۔

---

[۱] اطہر پرویز مشمولہ مضمون، جنوں میں جتنی گزری، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشن نئی دہلی،:ص ۴۵/۴۶

شادی:

اسی افرتفری کے ماحول میں ان کی شادی ۲۳ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ان کے سگے ماموں کی لڑکی صدیقہ سیوہاری سے ہوئی جو اس وقت کی مشہور افسانہ نگار خاتون تھی اور ترقی پسند تحریک سے متاثر تھیں۔ شادی کے بعد صدیقہ سیوہاری اور اطہر پرویز دونوں الہ آباد میں ہی مقیم رہے۔ پرویز صاحب کو چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے اللہ نے نوازا۔ بڑی بیٹی سیما پرویز اس کے بعد شاداں پرویز پھر نیلماں اور شیلا پرویز وہ اپنی بیٹیوں سے بہت محبت کرتے تھے اور لڑکیوں کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دیتے۔ ان کا تعلق چوں کہ ادب اطفال سے بھی رہا تو جب بھی اردو کے ننھے قارئین کے لیے کوئی کہانی لکھتے تو سب سے پہلے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی شیلا پرویز کو سناتے اور دیکھتے کہ کہانی کو پڑھنے سے بچی پر کیا اثر ہوتا۔

اس تمام افراتفری کے باوجود اطہر پرویز گوندیا میں شاعری کی محفلوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انور عنایت اللہ سے اطہر پرویز کی ملاقات ہوئی جو کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کراچی چلے گئے وہاں ان کو ادب میں اچھی خاصی شہرت ملی۔ ان کا خود یہ کہنا ہے کہ انور عنایت اللہ سے ملنے کے بعد میں ادب کے بہت قریب آیا اور ان کے ساتھ ہی ایک اور شخص عظیم الکریم عباسی ہے جو کہ خود مزاحیہ شاعر تھے گوندیا کے ہی ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔ پرویز صاحب نے ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ انہیں حضرات کی بدولت گوندیا میں اردو زبان وادب زندہ تھا۔ انہی کے گھر پر شاعری کی محفلیں منعقد ہوا کرتیں تھیں انور عنایت اللہ ہی سے ان محفلوں کی رونق ہوتی تھی جب کہ انور صاحب کٹر مسلم لیگی تھے اس کے باوجود ان کی دوستی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں تھی۔ بلکہ ایک دوسرے سے بڑی محبت سے پیش آتے اور ایک دوسرے کے خیالات سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ پانچ سال سیاست میں خوب محنت کرنے کے بعد انہوں نے اچانک بعض وجوہات کے بناء پر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ہر چند کہ راقمہ نے ان وجوہات کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کو سراغ نہ ملا۔ البتہ اطہر پرویز نے خود اپنی تحریروں میں صرف اتنا لکھا ہے کہ بعض وجوہ کے بناء پر میں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو انہوں نے جامعہ ملیہ کا رخ کیا اور چھ سال تک وہاں درس وتدریس اور بچوں کے مشہور رسالہ ''پیام تعلیم'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس طرح

انہوں نے خود کو سیاست سے الگ کر لیا اور ادبی دنیا میں مصروف ہو گئے اور تام عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ جبکہ طالب علمی کے ہی زمانے سے ذاکر حسین صاحب نے انہیں جامعہ آنے کی دعوت دی تھی، لیکن اس وقت پرویز صاحب نے انکار کر دیا تھا۔لیکن بعد میں جب دوبارہ غلام ربانی تاباں نے خط لکھ کر انہیں جامعہ آنے کی دعوت دی تو انہوں نے لبیک کہا۔

اطہر پرویز نے جامعہ میں جو وقت گزارا وہ بہت ہی خوشگوار گزرا کیونکہ وہاں اطہر پرویز کو شفیع الدین نیّر جو کہ بچوں کے مشہور شاعر تھے ان سے بھی قربت بڑھی۔عتیق احمد، کنور محمد اشرف اور رشید نعمانی وغیر شخصیات سے گہرے مراسم قائم ہوئے۔ جامعہ ملیہ میں ہی انہیں ذاکر حسین سے مزید آشنا ہونے کا موقعہ ملا جب کہ اس زمانے میں ذاکر صاحب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر فائز تھے۔اس کے باوجود ذاکر صاحب کا دہلی برابر آنا جانا لگا رہتا تھا یہی لہذا ذاکر حسین سے ان کی بے تکلفی بہت بڑھ گئی تھی۔

گر چہ اطہر پرویز جامعہ میں تدریسی خدمات بہت عمدہ طریقے سے انجام دے رہے تھے۔لیکن قدسیہ آپا نے ان کی صلاحیتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان کو مشورہ دیا کہ تم علی گڈھ چلے جاؤ وہاں یونیورسٹی میں لکچرر شپ مل جائے گی۔؁۴۵ اطہر پرویز کو بھی قدسیہ آپا کی رائے پسند آگئی اور ؁۱۹۵۶ء میں جامعہ ملیہ سے استعفیٰ دے کر دوبارہ علی گڈھ آئے۔ یہاں آ کر انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں پبلیکشن انچارج کا عہدا سنبھالا۔اور شمشاد مارکیٹ کی حامد علی بلڈنگ کی اوپر والی منزل میں ایک مکان کرائے پر لیا۔ پھر تا عمر اسی گھر میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہے۔انجمن ترقی ہند کے دفتر میں اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی ایم۔اے کیا اور ؁۱۹۵۸ء میں ممتاز نمبروں کے ساتھ ڈگری حاصل کی۔ اور ؁۱۹۵۹ء میں اطہر پرویز کا جرنل ایجوکیشن سنٹر میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ شعبہ اردو اے۔ایم۔یو میں بحیثیت ریڈر تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔اس دوراں کئی بار موریشس بھی جانا ہوا اور وہاں بھی اردو زبان کی خدمات انجام دیں۔موریشس اطہر پرویز کو بہت پسند تھا وہاں کے لوگوں کو بھی انہیں سے بہت انسیت تھی۔ گویا آخر عمر تک درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے کاموں میں مصروف رہے۔

وفات:

۱۹۶۷ء میں پرویز صاحب نے ''داستان کا فن'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ رقم کر کے ڈگری کے لیے پیش کیا۔اور دوبارہ موریشس چلے گئے۔اور ۱۹۷۹ء میں واپس علی گڑھ آ گئے یہاں سید حامد یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے انہیں ڈپٹی پراکٹر بنایا۔اور ساتھ میں ہی راس مسعود ہال کا پرووسٹ بھی بنایا گیا۔اس طرح وہ مکمل طور پر یونیورسٹی کی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ انتظامی کاموں میں مصروف ہو گے۔اور اسی دوراں وہ شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔اور ۱۹۸۰ء سے تاحیات علی گڑھ سے شائع ہونے والی مشہور ادبی رسالے ''الفاظ'' کے مدیر بھی رہے ''الفاظ'' تحقیقی وتنقیدی نوعیت کا رسالہ تھا۔یہ رسالہ ۱۹۶۷ء کو ابوالکلام قاسمی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔اس کے بعد پرویز صاحب نے اس رسالے کی ادارت کی۔بقول احمد جمال پاشا ''الفاظ'' کا ادبی معیار بہت بلند کر دیا۔پرچے کو جامع اور مقبول بنانے کے لیے انہوں بڑے دلچسپ سلسلے شروع کیے۔وہ تھکن محسوس کیے بغیر انتہائی مصروف زندگی گزار رہے تھے کہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۴ء کو اچانکہ حرکتِ قلب رک جانے کی وجہ سے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا۔اور اردو ادب کے قارئین اور اپنے عزیز واقارب کو داغ اجل دے گئے۔یونیورسٹی کی جانب سے تعزیتی جلسہ ہوا اور سید حامد، نواب رحمت اللہ خاں اور ڈاکٹر نور الحسن نقوی وغیرہ نے مقالات پڑھے۔بعد میں ۱۵ اپریل، ۱۹۸۴ء میں ان مقالات کو تہذیب الاخلاق میں شائع کیا گیا۔

اس کے علاوہ رسالہ ''پیام تعلیم'' نے بھی اطہر پرویز نمبر شائع کیا۔نیز علی گڑھ میگزین نے گوشہ اطہر کے نام سے ان پر لکھیے گئے مضامین شائع کیے۔اس شمارے میں اردو کے اہم ادیبوں پر خصوصی گوشے شائع کیے گئے۔جن کی ترتیب اس طرح ہے گوشۂ مجنوں، گوشہ دوقی، گوشۂ اختر، گوشۂ نسیم اور گوشۂ گوشہ اطہر پرویز شائع ہوا۔

باب دوم

اطہر پرویز کی تعلیمی و تدریسی خدمات

(الف) جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک

(ب) علی گڑھ میں دوبارہ آمد

(د) موریشش میں قیام

(ج) علی گڑھ میں ذاکر حسین اسکول کا افتتاح

اطہر پرویز کی تعلیمی وتدریسی خدمات:

ڈاکٹر اطہر پرویز اردو کے ممتاز ادیب، ماہر سیاست دان، محقق، ناقد، ترجم نگار، ترتیب نگار، انشائیہ نگار، ایجوکشن آفیسر اوراعلیٰ پائے کے انشاء پرداز تھے۔تصنیفی خدمات کے ساتھ ساتھ وہ بہترین مدرس بھی رہے ہیں۔وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے مگراس دوران متعدد بار موریشس جاکر کہی کہی سال تک اردو زبان وادب کی تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔موریشس میں تقریباً دوسو سال سے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اس لیے وہاں ہندوستان کی متعدد زبانوں سے واقفیت اوران کی تعلیم وتدریس کا نظام ہنوز قائم ہے۔وہاں اردو کو ثانوی زبان کے طور پر بولنے اوراردو زبان وادب کو زندہ رکھنے والے افراد بھی بہت بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ڈاکٹر اطہر پرویز نے وہاں ابتدائی اور ثانوی سطح پر تعلیم وتدریس کا جوسلسلہ شروع کیا تھا وہ ان کے زمانے میں ہی ایک لسانی تحریک کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا اور آج تک اطہر پرویز کو لوگ وہاں بابائے اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز ایک ذرخیز ذہن کے مالک تھے۔انہوں نے ادب اطفال پر خصوصی توجہ صرف کی۔ ان کے دو درجن کتابچے بچوں کے ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔انہوں نے اردوادب اطفال میں سائنسی طرز کی تحریریں، ڈرامے، معلومات پر مبنی کتب، داستانوی طرز کی تحریریں انگریزی اور بعض دوسری زبانوں کی کہانیوں کو اردو کے لباس میں ملبوس کیا ہے ان کی اکثر تصانیف پر حکومت ہند کی طرف سے انعامات سے نوازا گیا ہے۔اس کے علاوہ کلاسیکی ادب کو آسان وعام فہم زبان میں ترجمہ بھی پیش کیے ہیں۔صحیح معنوں میں بچوں کے ادب پر لکھی ہوئی کتابیں ڈاکٹر اطہر پرویز کی مشاقی اور عام فہم زبان میں اپنی بات پہچانے کا وسیلہ ثابت ہوئی ہیں یہی وجہ ہے تھی کہ جب انہوں نے ادب کے بنیادی مسائل پر ''ادب کا مطالعہ'' کے نام کتاب لکھی تو اس کی آسان زبان اور دلنشیں اسلوب نے ان کی اس کتاب کو غیر معمولی طور پر کامیاب بنا دیا۔اوراس کتاب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔اس حوالے سے ڈاکٹر خورشید الاسلام رقمطراز ہیں کہ:

''اطہر پرویز صاحب مختلف موضوعات پر لکھتے ہیں، لیکن ان کا مخاطب

ہمیشہ ایک ہی قسم کا حلقہ نہیں رہا ہے۔انہوں نے بچوں کے لیے لکھا ہے
،حرف شناس بالغوں کے لیے بھی اور تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی۔وہ
ادب اور سماجی مسائل کے علاوہ سائنس کی دنیا سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں
اور ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ سائنس کے دقیق مضامین کو بھی آسان اور
دلچسپ زبان میں پیش کر سکتے ہیں۔'' [۱]

بچوں کے پرُ تجسس ذہن کے لیے جہاں انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔وہیں انہوں نے مختلف جگہوں پر درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ،اور موریشس میں کئی سالوں تک اپنے علم وہنر سے بچوں کو فیض یاب کرتے رہے تھے۔اس باب میں ہم پرویز صاحب کی درسی وتدریسی خدمات کا تفصیل سے جائزہ پیش کریں گے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک:

۱۹۵۰ء میں سے پہلے پرویز صاحب سیاست کے میدان میں بڑے متحرک تھے لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد ان کی زندگی نے ایک نیا رخ بدلا۔اور انہوں نے مکمل طور پر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔اس کنارہ کشی کی خاص وجہ تو انہوں نے کھل کر بیان نہیں کی البتہ صرف اتنا کہا کہ ''اچانک بعض وجوہ کی بناء پر میں نے سیاست کو خیر آباد کہنے کا ادارہ کیا'' [۲] کیوں کہ اس زمانے میں ان کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔جان پر بھی حملے کروائے گئے ان کے خلاف پوسٹر بھی نکالے گئے۔جیل بھی جانا پڑا اور کچھ عرصہ روپوش بھی رہے۔

ان تمام سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بچنے کے لیے اطہر پرویز نے جامعہ ملیہ میں پناہ لی،اور خود کو ادبی دنیا میں مصروف رکھا۔جبکہ طالب علمی کے ہی زمانے میں ان کی ملاقات رشید صاحب کے گھر پر ذاکر حسین صاحب سے ہوئی تھی۔تو انہوں نے اس وقت بھی انہیں جامعہ آنے کی بھی دعوت دی تھی چوں کہ انہوں نے اس وقت نوکری کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب ''محمد شفیع الدین نیّر'' میں ذکر کیا ہے کہ:''اس وقت میرا ذہن اونچی اوڑان بھر رہا تھا اسی لیے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔''

---

[۱] اطہر پرویز،ادب کا مطالعہ،اردو گھر،علی گڑھ،ص:۷

جب سیاست سے دوری اختیار کی تو انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ اردو ادب کی خدمت درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی صورت میں انجام دی جائے۔ اسی دوراں انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے دوبارہ درس وتدریس کے لیے مدعو کیا گیا اور اس بار غلام ربانی تاباں نے خود خط لکھ کر انہیں جامعہ آنے کی دعوت دی اور انہوں نے تاباں کی دعوت پر لبیک کہا اور وہ جامعہ چلے گئے۔ جامعہ کی منظر کشی اس طرح سے انہوں نے اپنی کتاب ''شفیع الدین نیّر میں کی ہے کہ:

> ''میں جون ۱۹۵۰ء میں جامعہ میں وارد ہوا جامعہ ملیہ اسلامیہ اوکھلے میں بہت پہلے آ چکی تھی ......چھوٹی سی بستی تھی ۔ یہاں مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کی عمارت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ کالج کی عمارت ابھی بنی نہ تھی ......غلام ربانی تاباں صاحب میرے میزبان تھے وہ مدرسہ ثانوی میں رہ رہے تھے۔ ڈاکٹر آغا اشرف کے مکان میں ......جو اپنے آبائی وطن کشمیر گرمیوں کی چھٹیوں میں گئے ہوئے تھے۔ ان کو میں علی گڈھ سے جانتا تھا۔ یہ ہماری علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اسٹوڈنس یونین کے نائب صدر رہ چکے تھے۔ تاباں صاحب شاعر تو بڑے تھے ہی، ان کا دل بھی بڑا تھا۔ انہوں نے دعوت دے دی اور بقول ان کے ......چمگادڑ کی مہمان نوازی کا معاملہ تھا۔ چنانچہ میں بھی مدرسہ ثانوی کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں لٹک گیا'' [۱]

اطہر پرویز نے جامعہ میں جو وقت گزارا وہ بہت ہی خوشگوار گزرا۔ کیوں کہ وہاں کی زندگی درویشانہ نہ تھی بلکہ ان کے مزاج سے بہت میل کھاتی تھی ۔ پاس میں ہی ڈاکٹر انصاری کا مقبرہ تھا شام ہوتے ہی وہاں محفلیں سجتیں اور سیاسی ،سماجی، معاشی اور ادبی غرض کہ ہر پہلو پر گفتگو ہوتی تھی ۔شعر وشاعری کا بھی دور چلتا اس ماحول میں علی گڑھ کی یاد بھی تازہ ہو جاتی، دن میں بچوں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے، اور رات شاعرانہ محفلوں میں گزرتی تھی۔ اطہر پرویز منلسار شخصیت کے مالک تھے یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم دنوں

---

[۱] اطہر پرویز، محمد شفیع الدین نیّر، مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵ ص: ۱۰/۹

میں انہوں نے جامعہ کے لوگوں کے دلوں میں بھی جگہ بنالی تھی۔ کچھ مشفق احباب انہیں جامعہ میں بھی ملے جو کہ خود مقبولِ زمانہ تھے۔ مثلاً رشید نعمانی صاحب، عتیق احمد جو کہ ثانوی مدرسے کے استاد تھے بعد میں انہوں نے انگلستان کو ہی ہمیشہ کے لیے اپنا مسکن بنایا۔ ان کی بیگم مشیر فاطمہ (جو کہ اس وقت جامعہ نرسری کی نگراں تھیں) کنور محمد اشرف ان کی بیگم اور صاحبزادے احمد صدیقی جو کہ مشہور شاعر اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ بعد میں پرویز صاحب کے طالبِ علمی کے زمانے کے ایک دوست حبیب تنویر بھی جامعہ آ گئے تھے۔ جو کہ مشہور ڈرامہ نگار تھے انہوں نے جامعہ میں کئی ڈرامے اسٹیج بھی کروائے۔ چوں کہ پرویز صاحب اور قدسیہ آپا کو بھی ڈرامہ میں دلچسپی تھی اسی لیے ان دنوں ان کے گھر میں زیادہ رونق رہتی تھی۔ ان کی اہلیہ صدیقہ سیوہاری نے جامعہ کی زندگی کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

> ''جامعہ کی زندگی بڑی خوبصورت تھی۔ کل بیس پچیس گھرانے تھے اور سب ایک ہی خاندان کی طرح رہتے تھے۔........تمہارے عزیز دوست حبیب تنویر بمبئی چھوڑ کر جامعہ آ رہے ہیں، کسی نوکری کے لیے نہیں وہی اپنے ڈرامے لے کر۔ پھر انہوں نے جامعہ نگر میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہمارے گھر میں بھی کتنی رونق ہوگئی تھی، دن بھر ڈرامے لکھے جاتے رات کو رہل سل ہوتا اور پھر رات بھر چائے چلتی۔ پھر یہ ڈرامے اسٹیج پر دکھائے جاتے۔ کئی ڈراموں میں تو تم نے بھی کام کیا تھا۔ اسی دوران میں قدصیہ زیدی ملیں کیونکہ ان کو بھی ڈرامے لکھنے اور اسٹیج کرنے کا بے حد شوق تھا۔'' [۱]

جامعہ میں ہی اطہر پرویز کی ملاقات بچوں کے معروف شاعر شفیع الدین نیّر سے ہوئی۔ دراصل انہیں رات کو دیر سے سونے کی عادت تھی اور یہ عادت علی گڑھ کی دین تھی اور اتفاق سے نیّر صاحب بھی دیر سے ہی سوتے تھے۔ اسی عادت کے سبب ان کی دوستی بہت گہری ہوئی۔ اس کے بعد جب وہ رات میں ٹہلنے نکلتے تھے تو پرویز صاحب کے گھر ضرور جاتے ان کی دوستی اس وقت زیادہ گہری ہوئی۔ جب نیّر صاحب کے علی گڑھ میں

---

[۱] علی گڑھ میگزین، مشمولہ مضمون، آخری خط، از صدیقہ سیوہاری، ص: ۱۳۸

امتحان شروع ہوئے دراصل وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردوادب میں پرویٹ ایم۔اے کررہے تھے۔تو امتحان کی تیاری میں پرویز صاحب نے ان کی بہت مدد کی اور شفیع الدین نیّر اپنا یاد کیا ہوئے سبق کی مشق کرنے کے غرض سے انہیں کہی بار سناتے تھے۔ بعد میں انہوں نے ''شفیع الدین نیّر ایک مطالعہ'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔جس میں انہوں نے نیّر صاحب سے اپنی تعلقات کی نوعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:

> ''جب وہ ایم۔اے کا امتحان دے رہے تھے تو جو کچھ پڑتے وہ میرے سامنے دہراتے...... یہ بتانے کو کہ کیا کیا پڑھا۔اور بتانے کا انداز ایسا ہوتا جیسے مجھ سے بات نہ کررہے ہوں، کہیں تقریر کررہے ہوں اور پھر خود کہتے .... ''پرویز صاحب آپ کی وجہ سے مجھے امتحان میں بڑی مدد ملتی ہے''۔
> پھر جب وہ علی گڑھ سے ارود کا امتحان دے کر آئے تو اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے میرے پاس آئے اور کہنے لگے .... ''پرویز صاحب مجھ سے رشید صاحب نے بچّوں کے ادب کے بارے میں ایک سوال کیا تھا۔ میں نے آپ کا نام لیا اور آپ کے کاموں کا ذکر کیا''۔ [۱]

اس طرح جامعہ میں ایک سال تک درس وتدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد انہوں نے بچوں کا مشہو ومعروف رسالہ ''پیام تعلیم'' کی ادارت بھی شروع کردی۔''پیام تعلیم'' ہندوستان کے صدر مقام نئ دہلی میں قائم مشہور ومعروف یونیورسٹی ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی زیر سرپرستی، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، کی نگرانی میں شائع ہونے والا بچّوں کا ماہنامہ ہے آج بھی بچوں کا یہ ماہنامہ مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ سے جاری وساری ہے رسالہ ''کھلونا'' کی طرح ''پیام تعلیم'' نے بھی ادب اطفال کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اپنی منفرد شناخت بھی قائم کی۔ پیام تعلیم کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں بچوں کے لیے نظمیں تو لکھی جارہی تھیں لیکن نثر پر توجہ نہیں دی جارہی تھی (جب کہ بڑوں کے ادب میں دونوں صنف پر توجہ مرکوز کی گئ تھی) لیکن پیام تعلیم کے اجراء کے بعد بچوں کے لیے نثری تخلیقات بھی اسی زروشور سے لکھی گئیں جس طرح نظمیں لکھی جارہیں تھیں۔ نیز بچوں کی ذہن سازی کے ساتھ ساتھ بطورِ حوصلہ افزائی اُن کی تحریروں بھی اس رسالے میں

---

[۱] ڈاکٹر اطہر پرویز، محمد شفیع الدین نیّر ایک مطالعہ، مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئ دہلی ص:۱۳

شائع کیں گئیں۔ اپریل سن ۱۹۲۶ء میں ذاکر حسین کی تحریک پر پہلی بار ''پیام تعلیم'' پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ کی شکل میں جاری ہوا پھر ماہنامہ بن گیا۔ اور ادب اطفال میں خوب نام کمایا۔ پیام تعلیم کے مدیروں کی فہرست بہت لمبی رہی ہے ڈاکٹر عابد حسین خان، محمد حسین حسان، غلام ربانی تاباں، شاہد علی خان اور اطہر پرویز بھی اس کے ایڈیٹر رہے ہیں۔

جب اطہر پرویز جامعہ ملیہ گئے تو اس وقت ''پیام تعلیم'' کچھ عرصے سے بند تھا۔ حامد علی خاں جو کہ جامعہ کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے ان کو یہ خیال آیا کہ ''پیام تعلیم'' کو دوبارہ شروع کیا جائے۔ لہذا انہوں نے ستمبر ۱۹۵۱ء کو اطہر پرویز کی قیادت میں ''پیام تعلیم'' کا دوبارہ اجرا کروایا۔ چوں کہ پرویز صاحب کو بچّوں کے ادب سے خاصا شغف تھا۔ انہوں نے ''پیام تعلیم'' کی ادارت کے فرائض سن ۱۹۵۱ء سے سن ۱۹۵۶ء تک بحسن خوبی انجام دئے۔ اور ''پیام تعلیم'' کو اپنی محنت ومشقت سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ جامعہ میں اطہر پرویز نے پانچ سال تک پیام تعلیم کے زریعے بچوں کے ادب کی خدمت کی انہوں نے بچّوں کے ادب کو نئے نئے تجربات سے روشناس کیا اور وہ کامیاب بھی ہوئے چونکہ اس سے پہلے ادب اطفال محض لوک کہانیوں اور قصے کہاوتوں تک ہی محدود تھا لیکن اطہر پرویز نے پیام تعلیم کو ایک جدید شکل عطا کی۔ انہوں نے پیام تعلیم میں سائنسی معلومات کو بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا جبکہ سائنس ایک نہایت ہی خشک سبجیکٹ ہے جسے اکثر بچے پیچھا چھڑاتے ہیں اس کے باوجود انہوں نے ایسے خوش اسلوب انداز میں نئے سائنسی مضامین پیش کیے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ بچوں کو حظ حاصل ہو بلکہ ان کی معلومات میں اضافہ بھی ہوا انہوں نے اپنے اردگرد ایسے لوگوں کا ایک حلقہ بنا رکھا تھا جو کہ سائنسی ادب کے ساتھ ساتھ لوک کہانیاں اور قصے بھی لکھتے تھے۔ اس رسالے کی تمام زمہ داریاں وہ خود سنبھالتے تھے۔ کیوں کہ وہ ''پیام تعلیم'' کے مینجر اور ایڈیٹر دونوں ہی تھے۔

''پیام تعلیم'' کے کاموں کے نوعت اس طرح سے تھی اطہر پرویز ''پیام تعلیم'' کے خریداورں اور ادیبوں سے خود خط وخطابت کرتے تھے پرچہ ترتیب دیتے اور کتابت کرواتے' کا پیان اور پروف پڑھتے پریس کے چکر بھی خود ہی لگاتے' دوکان سے کاغذ لے کر جلد ساز سے جلد کروانا' یہاں تک کہ ڈاک خانوں کے تمام کارکنوں کو بھی خود ہی چائے پلواتے آخر میں جب یہ سارے کام ہو جاتے تو اطہر پرویز فرماتے ہیں کہ میں گنگا نہا تا گویا اس طرح انہوں نے اپنی بے انتہا کوششوں سے پیام تعلیم کو بچوں کے لیے مفید بنایا۔ اور پیام

تعلیم کو ایک جدید شکل عطا کی۔

جامعہ میں اطہر پرویز کے لیے سب سے بڑا مسلہ ''پیام تعلیم'' کا اداریہ لکھنا تھا جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ حامد علی خان جامعہ کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے جس کی وجہ سے وہ بے حد مصروف رہتے تھے۔ جب اطہر پرویز ''پیام تعلیم'' کا اداریہ لکھ کے لے جاتے تو حامد صاحب اپنی مصروفیت کی وجہ سے کئی دنوں میں چیک کر کے دیتے جب اداریہ واپس ملتا تو بیچ بیچ میں لال قلم سے نشان لگے ہوتے اور حکم ہوتا اداریہ دوبارہ لکھا جائے اس طرح حامد صاحب یہ اداریہ اطہر پرویز سے چار پانچ بار لکھواتے تھے تب کئی جا کر حامد صاحب اداریہ منظور کرتے۔ اسی زمانے میں مجیب احمد خان ''کتاب نما'' اڈٹ کرتے یہی مسلہ ان کے لیے بھی تھا لیکن وہ کبھی حروفِ شکایت زبان پر نہ لاتے آخر ایک روز اطہر پرویز نے ان سے ان کے اطمینان کا سبب دریافت کر ہی لیا انہوں نے کہا بھائی میں حامد صاحب کو خوب جانتا ہوں میں ایک ایڈیٹوریل محنت سے لکھتا ہوں پھر اس کے ساتھ ساتھ تین چار اداریے یوں ہی لکھ لیتا ہوں جب وہ ایک کو رد کرتے ہیں تو میں بلا تامل دوسرا پیش کرتا ہوں اور جب سب ختم ہو جاتے ہیں تو میں پہلا لکھا ہوا اداریہ چلاتا ہوں اور بلا آخر یہی منظور ہو جاتا ہے تم بھی یہی کرو اس کے بعد اطہر پرویز نے یہی طریقہ اختیار کیا اور یہ مسلئہ بھی حل ہو گیا لیکن حامد علی خان صاحب کی قابلیت اور باریک بینی کا اندازہ ان کو مسوری میں ہوا دراصل ۱۹۵۳ء میں یونسکو اور منسٹری ایجوکیشن نے مل کر کچھ کتابوں کو مرتب کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا اس کام کے لیے انہوں نے جامعہ ملیہ کا انتخاب کیا تین کتابیں افغانستان' چین اور سویت روس کے عنوان سے ترتیب دینے کے لیے منتخب ہوئیں تھیں جامعہ ملیہ سے اطہر پرویز کو منتخب کیا گیا۔ ان دنوں کا ذکر اطہر پرویز نے اپنے مضمون ''کچھ باتیں کچھ یادیں'' میں اس طرح کیا ہے:

> ''حامد علی خان بھی وہاں پہنچ گئے یہاں انھیں فرصت تھی۔ اطمینان سے ایک ایک لفظ پڑھتے۔ بار بار لکھواتے ان کتابوں کے لیے مجھے بڑی مصیبت جھلنی پڑی اس وقت جھنجلاہٹ تو بہت ہوئی لیکن مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچا۔'' [۱]

---

[۱] کچھ باتیں کچھ یادیں، اطہر پرویز کا غیر مطبوعہ مضمون،

اس طرح پرویز صاحب کی کاوشوں سے ''پیام تعلیم'' نے شب وروز ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے شعراء وادباء کے ایک بڑے طبقے کو اپنے ساتھ منسلک کرنے میں کامیاب ہوگیا۔جن میں شفیع الدین نیّر ، پروفیسر رشید احمد صدیقی ،صاحبزادہ سعید الظفر ، پروفیسر سید عطاء اللہ، پروفیسر آل احمد سرور،حفیظ جالندھری، شفیع الدین نیّر ،محمد صدیقی ،عبدالواحد سندھی ،عبدالغفار مدھولی ،اظہر افسر، آصفہ مجیب ،محمود علی خاں ،سید ابوشمیم ہاشمی ،فریدی آبادی، چمن لال جرنلسٹ ،خواجہ شفیع دہلوی، آفتاب حسن بی اے، کیف احمد صدیقی ،سعادت نظیر، غلام حیدر، نظر برنی ،احسان الحق ،مجاہد حسین زیدی، خلیق انجم اشرفی ،علقمہ شبلی ، یوسف ناظم محمد حسن مسلم ضیائی، ذاکر حسین ، الیاس مجیبی ہاجرہ بیگم ،سیدہ فرحت ،محمد امین ، دیوندر ستیارتھی ،حفیظ جالندھری ،صالح عابد حسین سید منیر الحسن حامد علی خان اور خود اطہر پرویز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔جن کی ادیبانہ تحریروں اور کاوشوں نے'' پیام تعلیم'' کو بلند معیار عطا کیا ہے اور ان ادباء کی تخلیقات نے ادب اطفال کو مزید تقویت دینے میں اہم رول ادا کیا حتیٰ کہ تاریخ میں اس دور کو ادب اطفال کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔

گویا پرویز صاحب کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز جامعہ سے ہی ''پیام تعلیم'' کی ادرارت کے دوران ہی ہوا۔اس طرح پانچ سال تک جامعہ میں بہت ہی خوش اسلوبی سے ''پیام تعلیم'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور مسلسل بچوں کے لیے کہانیاں ،علمی ،ادبی اور معلوماتی مضامین لکھتے رہے۔انہوں نے اردو ادب اطفال کو روایتی قصے کہانیوں سے ایک نئے انداز میں روشناس کرایا ہے ساتھ ہی جدید موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہے نیز دوسری زبانوں سے ماخوذ کہانیاں لکھ کر ادب اطفال میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔بچوں کے ادب پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے دورِ جدید میں بچوں کو سائنٹفک طریقہ کار اپناتے ہوئے ان کے ذہنی نشو ونما کے لیے دلکش اسلوب اور آسان زبان میں کتابیں تخلیق کرنے میں ماہر تھے۔

اطہر پرویز پابندی سے ''پیام تعلیم'' کے لیے خود بھی مضامین لکھتے رہے اور اپنے ساتھیوں سے بھی لکھواتے رہے جن کو لوگ شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سائنس کے مشکل سے مشکل موضوعات پر مبنی کتابیں اور مضامین تحریر کیے۔مثلاً انڈونیشیا کی کچھ رسمیں' جولائی ۱۹۵۱ء ''ہنگری کے بچے'' اگست ۱۹۵۲ء ''ہندوستانی ریلوں کی کہانی'' جون ۱۹۵۳ء ''کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو' جولائی ۱۹۵۳ء ''تبت کے رسم ورواج'' مارچ ۱۹۵۱ء ''اقوام متحدہ'' نومبر ۱۹۵۴ء ''ننّھے منے پودے'' جون ۱۹۵۵ء '' کابل' نومبر

۱۹۵۳ء ''فاہیان کا سفر'' اپریل ۱۹۵۴ء ''چائے'' مئی ۱۹۵۴ء وغیرہ قابل ذکر مضامین ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً پیام تعلیم میں شائع ہوتے رہے۔

(اور اپنے ساتھیوں سے بھی لکھواتے رہے۔ ان کا خاص وصف یہ تھا کہ انہوں نے بچوں ادب سے شغف تو تھا ہی اسی لیے خود بھی ''پیام تعلیم'' کے لیے مسلسل لکھتے رہے اور اپنے ساتھیوں سے بھی نئے طرز کی تحریریں لکھواتے رہے۔ انہوں نے علمی، ادبی اور سائنسی مضامین اور کتابیں بچوں کے لیے تحریر کیں۔ اور نوع بہ نوع موضوعات پر ان کی تحریریں ملتی ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں کامیاب ہوئے انہوں نے بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے، تراجم اور علمی و ادبی مضامین اور مختلف الجہات موضوعات پر کتابیں تحریر کیں۔)

جامعہ میں ہی اطہر پرویز کی ملاقات مشاہیر وقف سے بھی ہوئی۔ جس کی بدولت انہیں اس وقت کی عظیم ہستیوں سے نہ صرف یہ کہ ملنے کا موقعہ ملا بلکہ ان سے گہرے مراسم بھی قائم ہوئے کرنل بشیر حسین زیدی جو کہ اس زمانے کا معروف نام تھا اس وقت پارلیمنٹ کے ممبر تھے او وہ دہلی میں ہی رہتے تھے اطہر پرویز کا ان کے گھر روز آنا جانا لگا رہتا تھا زیدی صاحب کی بیگم جو کہ قدسیہ آپا کے نام سے مشہور تھیں لیکن دلی میں بیگم زیدی کے نام سے جانی جاتیں تھیں وہ اطہر پرویز کو بہت عزیز رکھتیں تھیں اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ قدسیہ آپا کو ڈرامے سے غیر معمولی دلچسپی تھی قدسیہ آپا کو خود بھی ڈرامے لکھنے اور انہیں اسٹیج کروانے کا بے حد شوق تھا۔ قدسیہ زیدی کے ہی فضل و کرم کا ہی نتیجہ تھا کہ دلی میں ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد رکھی گئی۔ اس تھیٹر نے آگے چل کر بہت ترقی کی اور بہت سارے ڈرامہ نویسوں کو اس کے زریعے سے فائدہ ہوا جن میں قابل ذکر حبیب تنویر، نیاز حیدر، ارشاد پنجتن وغیرہ ہیں۔ اس تھیٹر کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر اطہر پرویز بھی تھے قدسیہ زیدی کی وجہ سے ہی اطہر پرویز کی ملاقات خواجہ غلام السطین، رفیع احمد قدوائی اور یونس خان سے ہوئی۔ اطہر پرویز کے کالج کے دوست حبیب تنویر بھی جامعہ آ گے تھے اور جب تک وہ جامعہ میں رہے ان کا قیام اطہر پرویز کے گھر پر ہی رہا۔ اس لیے ان کے گھر ان دنوں بہت چہل پہل رہتی تھی اس حوالے سے ان کی اہلیہ صدیقہ سیوہاری نے اپنے ایک مضمون جو کہ ۱۹۸۹ء کو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا میں رقمطراز ہیں کہ:

''ہمارے گھر میں بھی کتنی رونق ہوگئی تھی دن بھر ڈرامے لکھے جاتے۔

رات کو ریہرسل ہوتا اور پھر رات بھر چائے چلتی پھر یہ ڈرامے اسٹیج پر
دیکھائے جاتے کہی ڈراموں میں اطہر پرویز نے بھی کام کیا۔ ۱

جامعہ ملیہ میں رہ کر ہی اطہر پرویز کو ذاکر حسین سے مزید آشنا ہونے کا موقعہ ملا اگر چہ اس زمانے میں ذاکر صاحب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے باوجود ذاکر صاحب کا دہلی برابر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ یہ اطلاع ملی کہ ذاکر صاحب دفتر چیک کریں گے اور کارکنوں سے بھی ملے گئے۔ چوں کہ ذکر صاحب نفاست پسند تھے اسی لیے سارے کارکنان اپنی اپنی میز وغیرہ صاف کرنے لگے۔ اور پرویز صاحب نے بھی جلدی جلدی میز پر لگے کاغذات کے انبار کو ہٹانے لگے اور فورا سارے کاغذات اٹھا کر دراز میں رکھ دیئے دومنٹ میں میز صاف ستھری ہوگئی جب ذاکر حسین کمرے میں داخل ہوئے اور میز کو دیکھ کر فورا بولے بھئی یہ ہے ایک ایڈیٹر کی صاف ستھری میز مجھے بڑی خوشی ہورہی ہے کہ آپ کے یہاں اتنی سلیقہ مندی ہے ۴۹ لیکن باتوں باتوں میں جب ذاکر حسین نے دراز کھولا تو بے ساختہ کہا ''تو جناب یہ ہے آپ کی صفائی کا راز'' پھر کچھ دیر ہنسی مذاق کیا۔ اور چلے گئے۔

اسی اثناء میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا اتفاق سے یہ بھی ذکر حسین سے ہی متعلق ہے ہوا یوں کہ ذاکر حسین دلی آئے اسی دن رادھا کشن جو کہ نائب صدر جمہوریہ تھے ان کے یہاں کرنل بشیر حسین زیدی اور ان کی اہلیہ کو ڈنر پر جانا تھا اب مسلئہ یہ درپیش تھا کہ ذاکر حسین کے پاس کون روکے گا چونکہ قدسیہ آپا کے اطہر پرویز کے ساتھ اچھے تعلقات تھے انہوں نے کار بھجوا کر اطہر پرویز کو بلوایا اور ہدایت کی کہ ذاکر حسین کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہے ان کا خاص خیال رکھنا جب رات کو کھانے کا وقت ہوا تو نوکر نے ڈائنگ روم میں کھانا لگایا اور جب ہم ڈائنگ روم گئے تو ذاکر حسین نے سارے نوکروں کو باہر نکال دیا اور پھر اطہر پرویز کی جگہ خود بیٹھ گئے کیونکہ ذاکر حسین کو ڈاکٹر نے پرہیزی کھانا کھانے کی ہدایت کی تھی گھر میں کسی اور کو نہ پا کر ذاکر صاحب نے موقعے کو غنیمت جانا اور خود مسالے والہ کھانا کھایا اور اطہر پرویز کو پرہیزی کھانا کھلوایا اس واقعے کا ذکر اطہر پرویز نے اپنے مضمون میں اس طرح کیا ہے کہ:

''بھائی معاف کرنا آج میں نے تم کو بڑی تکلیف دی۔ لیکن اب تو جو

---

۱ آخری خط مشمولہ مضمون، علی گڑھ میگزین، از صدیقہ سیوہاروی ص: ۱۳۸

ہونا تھا سو ہو گیا بھائی اور زیدی صاحب سے اس کا ذکر مت کرنا میرے
جسم کو اس کھانے سے اتنا نقصان نہ پہنچے گا جتنی انہیں تکلیف ہوگی۔'' [1]

گرچہ جامعہ میں اطہر پرویز بحیثیت مدرس اور مدیر اپنی زمہ داریاں بحسن خوبی انجام دے رہے تھے تاہم ان کی قابلیت اور علمی صلاحیتوں کے بناء پر قدسیہ زیدی نے ان کو ۱۹۵۶ء کو مشورہ دیا کہ ''تم علی گڑھ چلے جاؤ وہاں یونیورسٹی میں لکچر رشب مل جائے گی۔تو ان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے۔انہوں نے ۱۹۵۶ء میں جامعہ سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آ گے۔اور یہاں تدریسی خدمات انجام دینے لگے اور اس دوران وہ کہیں بار موریشس بحیثیت ایجوکیشن آفسر کے گئے۔اور وہاں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔

اطہر پرویز کا علی گڑھ میں دوبارہ قیام:

اس طرح اطہر پرویز نے علی گڑھ آ کر شروع میں انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں پبلکیشن انچارج کے عہدے پر فائض ہوئے۔کچھ دنوں تک تو گھر کی تلاش میں ادھر ادھر پریشان رہے بالا آخر جاوید کمال کے توسط سے شمشاد مارکیٹ میں انہیں حامد علی بلڈنگ میں اوپر والی منزل میں ایک مکان کرائے پر ملا۔جیسا کہ وہ اپنی تصنیف ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک''میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''جاوید کمال بڑے خوشگوار شاعر ہیں۔لیکن ان کی شخصیت میں غضب کا ڈراما ہے۔انھوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے پیش کیا۔میرے خاندان کی بزرگی کی باتیں کیں وہ صابری صاحب کی کمزوری سے واقف تھے۔صابری صاحب متاثر ہوگئے۔اور مجھے اوپر کا ایک مکان دینے پر آمادہ ہوگئے۔'' [2]

اطہر پرویز جب تک زندہ رہے اسی گھر میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہے۔انجمن ترقی ہند کے دفتر میں اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی ایم۔اے کیا اور ۱۹۵۸ء میں ممتاز نمبروں کے

---

[1] اطہر پرویز کا غیر مطبوعہ مضمون، آؤ تمہیں سنائیں سے ماخوذ

[2] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ، ۲۰۰۷، ص:۵۳

ساتھ ڈگری حاصل کی۔اس زمانے میں کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر تھے وہ اطہر پرویز کی صلاحیتوں کے بڑے قائل تھے اور ۱۹۵۹ء میں اطہر پرویز کا تقرر جرنل ایجوکیشن کے سنٹر میں بحیثیت لکچرر ہو گیا۔ کچھ عرصے تک اطہر پرویز نے ویمنس کالج میں بھی کلاسیس لیں۔اس کے کچھ دنوں کے بعد ہی ان کا تقرر بحیثیت ریڈرا ے، ایم ، یو کے شعبہ اردو میں ہوا پھر آخر عمر تک درس وتدریس اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رہے۔ ہاں اس درمیان کہیں بار موریشس بھی گئے۔اور وہاں پرائمری بچوں کے لیے درس وتدریس کی کتابیں لکھیں۔

موریشس میں اطہر پرویز کا قیام:

اطہر پرویز ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ جب بھی ان کو اردو ادب کی خدمت کا کوئی بھی موقعہ ملتا تو اس موقعے کو غنیمت جان کر اردو ادب کی خدمت کرتے یہی وجہ ہے کہ اطہر پرویز علی گڑھ میں تدریسی فرائض انجام دے ہی رہے تھے کہ ۱۹۶۸ء میں حکومتِ موریشس نے حکومتِ ہند سے اپنے جزیرے پر اردو زبان وادب کی ترقی واشاعت کے لیے کسی ایسے شخص کے تقرر کی درخواست کی جو اردو کے اکسپرٹ ہوں تا کہ وہ موریشس میں اردو زبان وادب کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر سکیں۔ دراصل حکومت موریشس نے یہ گزارش اسپیشل کامن افریکن اسیٹنس پلان (special commonwealth assistance for african programme) کے تحت کروائی تھی۔لہذا ہائی کمیشن برائے حکومت ہند نے اس عظیم کام کو انجام دینے کے لیے اطہر پرویز کا نام منتخب کیا۔ اور ان کا تقرر ٹیچر ٹرینیگ کالج موریشس میں بحیثیت اردو ایجوکیشن آفیسر کے ہو گیا۔۱۳ اگست ۱۹۶۸ء کو اطہر پرویز ہوائی جہاز کا سفر طے کر کے موریشس پہنچے موریشس کے سب سے بڑے ہوٹل ''ہوٹل پارک'' میں ٹھہرے اور ۱۵ اگست کو انہوں نے موریشس کے ٹرینیگ کالج میں اپنا عہدہ سنبھالا۔ کچھ دن تک ہوٹل پارک میں رہنے کے بعد'' روڈ واک واکوا'' میں منتقل ہو گئے۔اور جب تک وہ موریشس میں رہے وہی قیام پذیر رہے دسمبر ۱۹۷۰ء کو اطہر پرویز ہندوستان واپس آ گئے لیکن ۱۹۷۶ء کو حکومتِ موریشس نے انہیں دوبارہ بلایا۔دوسری مرتبہ اطہر پرویز جب موریشس گئے تو کچھ دنوں تک ہوٹل کونٹینٹل میں ٹھہرے لیکن چندروز

کے بعد ہی ''موکا'' نامی جگہ پر ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔اس بار ان کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہوا تھا۔اب وہ ٹیچر ٹریننگ کالج کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ ''مہاتما گاندی انسٹی ٹیوٹ'' سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔جو ان ہی کی کاوشوں کی وجہ سے قیام میں لایا گیا تھا۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> موریشس میں اطہر پرویز کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے۔کہ انہوں نے وہاں اردو ادب کو استحکام دلانے کے لیے ایک اردو انسٹی ٹیوٹ قایم کروَایا۔سر عبدالرزاق محمد سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ان سے اطہر پرویز نے شکوہ کیا کہ موریشس میں تقریباً ہر زبان کا ادارہ موجود ہے۔اس کے برعکس جب کہ اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد یہاں موجود ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہاں کوئی اردو کا ادارہ نہیں ہے گویا ۱۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کو گورنر جرنل عبدالرحمان عثمان نے ''دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ'' کا سنگِ بنیاد رکھا۔[۱]

اس کے علاوہ انہوں نے موریشس میں پرائمری اور ثانوی کلاسیس کی کتابیں بھی مرتب کیں۔جب دوسری مرتبہ وہ وہاں گئے تو اسی انسٹی ٹیوٹ نے ان کا شاندار استقبال کیا اس کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون ''ایک رہنما....ایک انسان'' ان لفظوں میں کیا ہے کہ:

> ''موریشس میں ہر زبان کا ادارہ ہے۔ہندی،تامل،تیلگو،مراہٹی...... لیکن ۱۹۷۰ء سے پہلے اردو کا کوئی ادارہ نہ تھا۔جب میرے یہاں سے جانے کے تھوڑے دن رہ گئے تو میں نے سر عبدالرزاق سے کہا ''دیکھئے اس جزیرے میں تیلگو بولنے والے بہت تھوڑے ہیں لیکن اپنی زبان اور تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ''آندھرا مہاسبھا'' بنالیا ہے۔اردو بولنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے پھر بھی ان کا کوئی ادارہ نہیں'' [۲]

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،ڈاکٹر اطہر پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی،ص:۶۲

[۲] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،ڈاکٹر اطہر پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی،ص:۶۰

نیز اطہر پرویز نے موریشش میں پرائمری اسکول کے بچوں کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں لکھی ہیں:

۱- اردو کی پہلی کتاب

۲- اردو کی دوسری کتاب

۳- اردو کی تیسری کتاب

۴- اردو کی چوتھی کتاب

۵- اردو کی پانچویں کتاب

۶- اردو کی چھٹی کتاب

اطہر پرویز کو موریشس بہت پسند تھا انھوں ''خدا کا تحفہ'' کے عنوان سے ایک کہانی لکھی۔ جس میں موریشس شہر کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اور موریشش کے لوگ بھی اطہر پرویز کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اور آج بھی وہاں ان کے شاگرد اچھی خاصی تعداد موجود ہیں۔ جو اردو زبان وادب کی خدمت کے لیے کوشاں ہیں۔ مثلاً صابر گودڑوی، عنایت حسین، یوسف عبدالطیف اور احمد قاسم وغیرہ وہاں کے لوگ اطہر پرویز کو بابائے اردو کے نام سے جانتے ہیں یعنی جو لقب مولوی عبدالحق کو ہندوستان میں ان کی گراں قدر خدمات کے باعث ملا وہی مقام ومرتبہ اطہر پرویز کو موریشس میں حاصل ہے۔ ان کی بیگم صدیقہ سیوہاری نے لکھتی ہے کہ موریشس میں جو گاندھی انسٹی ٹیوٹ اطہر پرویز کی کوششوں کے سبب قائم ہوا تھا وہاں ان کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ اس جگہ سے انہیں والہانہ محبت تھی۔ جس کا احساس ان کی تحریریں پڑھ کر بھی ہوتا ہے جن میں جگہ جگہ موریشش کا ذکر ملتا ہے۔ موریشس میں انہیں کچھ خاص رفیق بھی ملے جن میں عبدالرزاق کا نام سرفہرست ہے ان کے علاوہ محمد صابر گوڈر، حسن محسن وغیرہ سے بھی ان کے رفیقانہ مراسم تھے۔ موریشس میں ہفتے میں سنیچر اور اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔ نیز تعلیمی ودرسی خدمات کے ساتھ ساتھ انہوں نے وہاں اکثر وبیشتر مقامات پر خود بھی پروگرام کروائے اور اردو ادب کو فروغ دینے کے لیے خود بھی وہاں کے پروگراموں میں شرکت کرتے اور اردو ادب کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے اور موریشس کی عوام کو اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کا احساس دلاتے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہر شہر ہر گاؤں میں تعلیمی ادارہ ہوتا کہ ہر انسان آسانی سے تعلیم حاصل کر سکے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہر اس آدمی کی مدد کی جو تعلیم کا بھوکا تھا جیل میں شنکر کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کو پائے تکمیل

تک پہنچایا اور موریشس میں ان طلباء کی مدد کی جو اردو ادب کو پڑھنا چاہتے تھے۔لیکن اردو سے ناواقفیت کے سبب بعض دشواریوں کا سامنا کرنا پڑھتا تھا اس بات کا انہیں بخوبی احساس تھا۔وہ اپنے طلباء کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ان کی مالی امداد کرنا،اپنے خالی اوقات میں گھر بلا کر پڑھانا،وغیرہ غرض کہ اپنے طلباء کے ہر طرح کے معاملے سے باخبر رہتے اس طرح سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر اطہر پرویز نے وہاں ابتدائی اور ثانوی سطح پر تعلیم وتدریس کا جو سلسلہ جاری کیا تھا وہ ان کے زمانے میں ہی ایک لسانی تحریک کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا۔انہوں نے اردو ادب کی شمع کو روشن کرنے کے لیے بے انتہا کوشش کیں۔بلاشبہ موریشس میں بھی انہوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت بحسن خوبی نبھائی اور ۱۹۷۹ء کے اوائل میں وہ ہندوستان واپس آ گئے۔

علی گڑھ میں ذاکر حسین ماڈل اسکول کا افتتاح:

موریشس سے واپسی کے بعد اطہر پرویز نے علی گڑھ میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے کام حسب معمول لگ رہے۔لیکن ۱۹۷۲ء میں جب وہ علی گڑھ واپس آئے تو انہوں اپنے ساتھیوں مثلاً نورالحسن نقوی اور عبدالعلیم صدیقی سے مشورہ کیا کہ علی گڑھ میں ذاکر حسین کے نام سے ایک اسکول بنایا جائے۔انہیں ذاکر حسین سے بہت عقیدت تھی اسی لیے ان کی یہ خواہش تھی کہ ذاکر حسین صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے تو ان حضرات نے آپس میں سوچ بچار کر کے یہ مشورہ کیا کہ اسکول کی زمین کے لیے علی گڑھ کے کلکٹر پنڈت صاحب کے پاس جائے گئے اس کا ذکر پرویز صاحب نے اس طرح کیا ہے کہ:

> ’’ایک روز جب ذاکر حسین ماڈل اسکول کی زمین کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالعلیم صدیقی ،ڈاکٹر نورالحسن اور راقم الحروف علی گڑھ کے کلکٹر پنڈتا صاحب سے ملے اور انھوں نے اس زمین کے دینے کا ارادہ ظاہر کیا جو مزمل منزل کے صدر پھاٹک کے پاس دودھ پور سے آنے والی سڑک کے تراہے پر، پان والی کوٹھی کے پائیں جانب ایک تکونے پارک کی شکل میں پڑی ہوئی تھی تو دم میں دم آیا۔اس وقت ایسا لگا جیسے تین دن کے فاقہ زدی کو کوئی سوکھی روٹی کا ٹکڑا دے۔‘‘ [۱]

---

[۱] اطہر پرویز،علی گڑھ سے علی گڑھ تک،اردو گھر علی گڑھ،۲۰۰۷،ص:۷۸/۷۹

جب اسکول کے لیے زمین کا انتخاب ہو گیا۔ تو تینوں خوشی سے جھوم اٹھے اور وہ جگہ دیکھنے گئے وہاں سامنے رحمت اللہ خان شیروانی کی کوٹھی تھی نواب صاحب خود علم پسند شخص تھے۔ تو انہوں نے سوچا نواب رحمت اللہ خان شیروانی کو بھی یہ خوش خبری سنا دی جائے۔ نواب صاحب اس وقت اپنی کوٹھی کے برانڈے میں بیٹھے ہوئے تھے لہذا وہ تینوں نواب صاحب کے پاس گے۔ انہوں نے بھی نواب صاحب کو جب یہ خبر دی تو انہوں نے وہاں اسکول قائم کرنے سے منع کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر خود پرویز صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ:

> '' آپ یہاں سڑک پر بچوں کا اسکول کھولیں گے ۔ مزمل منزل والی سڑک پر' پہلے تو مجھے یہ انداز برا لگا لیکن پھر دوسرے جملے نے اس کا اثر ذائل کر دیا۔ نواب صاحب نے سلسہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا 'کل خدانخواستہ کسی گاڑی سے اسکول کا کوئی بچّہ کچل گیا تو لوگ ہیہ کہیں گے کہ نواب کی کوٹھی کے سامنے یہ حادثہ ہوا۔ اسکول آپ بنائیں گے اور بدنامی مزمّل منزل کی ہوگی۔ میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔' اب ہم لوگوں کے آئے حواس جاتے رہے لیکن پھر بولے' یہ آخر اتنی بڑی زمین جو میری کوٹھی میں ہے یہ کس دن کام آئے گی۔ جتنی زمین کی ضرورت ہو لے لیجیے اور کام شروع کر دیجیے اور جب تک عمارت نہ بنے میرا ڈائنگ ہال استعمال کیجیے مگر ذاکر حسین کے نام پر اسکول ضرور لکھنا چاہیے اور اس کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لیے کھلے ہونے چاہئیں۔'' [۱]

نواب صاحب نے خود پرویز صاحب اور ان کے باقی ساتھیوں کے ساتھ مل کر اسکول کے لیے چندہ جمع کیا۔ دراصل نواب صاحب نے سرسید کے چمن میں تربیت پائی تھی وہ اپنی روایات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگر چہ علی گڑھ کے بعض نوابوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ مثلاً

> ''(نواب صاحب) انھوں نے ہمارے سامنے چندے کے لیے لوگوں

۱؎ اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ، ۲۰۰۷، ص: ۷۹/۸۰

کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ شہر کی گلی کوچوں کے
چکر بھی لگائے۔ رات رات بھر جاگ کر لوگوں کو عطیے کے لیے خطوط بھی
لکھے۔ علی گڑھ کے بعض روسا کو یہ بات ناگوار گزری کہ نواب سر مزمّل
اللہ خاں کی اولاد ایک اسکول کے چندے کے لیے معمولی معمولی لوگوں
کے گھروں پر جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایک پیغامبر بھیجا۔ اتفاق سے
اس وقت میں بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ نواب صاحب کو یہ مداخلت ناگوار
گزری لیکن انھوں نے بڑے سکون سے جواب دیا کہ ان حضرات سے
میرا اسلام کہیے گا اور یہ فرمایئے گا کہ یہ ہاتھ میں نے ایک فریضے کے لی
پھیلایا ہے اور میں اس قوم کا ایک ادنیٰ فرد ہوں۔ ہاتھ تو سر سید نے بھی
پھیلایا تھا اور میں سر سید کی خاک پا بھی نہیں''[1]

نواب صاحب بہت فراخ دل انسان تھے۔ زمین بھی بنا معاوضے کے دے دی اور چندے کے لیے بھی دوسرے لوگوں کے پاس گے۔ یہاں بس نہیں کیا بلکہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ اسکول میں کام چل رہا تھا۔ مزدروں کو اجرت دینی تھی اور پیسوں کی کمی تھی اور پیسوں کا انتظام کرنے پرویز صاحب دہلی گئے ہوئے تھے۔ اور نواب صاحب نے اپنے آم کے پیڑ فروخت کر دیئے اور اسکول کا کام روکنے نہیں دیا۔ اس واقعے کے حوالے سے پرویز صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''میں نے کہا: ان پیڑوں کے کٹنے کا مجھے ملال ہے۔ کہنے لگے کہ: اس
میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے قوم کے نونہالوں کے لیے
یہ آم کے پیڑوں کی قربانی ہے۔''[2]

اسکول قائم ہوا یہی وجہ ہے کہ اسکول نے بہت جلد ترقی کر لی۔ اور ہزاروں بچے اس وقت بھی اس اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''نواب صاحب نے جس خلوص اور جذبے کے ساتھ زمین دی تھی اس کا

---

[1] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ، ۲۰۰۷، ص: ۸۲/۸۳

[2] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ، ۲۰۰۷، ص: ۸۴/ ۸۵

یہ اثر ہوا کہ آج علی گڑھ اور علی گڑھ سے باہر کے تقریباً ڈیڑھ ہزار بچے
یہاں تعلیم پا رہے ہیں۔ حاجی عبید الرحمٰن خاں شروانی نے اسکول کے
ایک جلسے میں فرمایا تھا کہ یہ وہ زمین ہے جس پر سر مزمل اللہ خاں چلے ہیں
اور یقیناً یہ زمین سرسبز رہے گی اور یہاں کے پڑھے ہوئے طالب علم ان
کے نقش قدم پر چلیں گے اور اپنے ملک کی خدمت کریں گے۔'' [۱]

نواب رحمت اللہ خان شیروانی سر مزمّل اللہ خان کے بیٹے تھے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر بہت احسانات کیے ہیں۔ گویا یہ دریا دلی نواب صاحب کو خاندان سے ورثے میں ملی تھی۔ اسی لیے انہوں نے اپنی اتنی قیمتی زمین اسکول کے لیے وقف کر دی اور ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا چونکہ نواب صاحب قوم پرست، ایماندار اور عبادت گزار بندے تھے۔ خدمت خلق کا جزبہ بھی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اطہر پرویز اور ان کے ساتھیوں کا آخیر تک ساتھ دیا یعنی (اسکول تعمیر کروانے تک دیا) جہاں تک ممکن تھا مالی امداد بھی کرتے اور کسی کے سامنے اطہر پرویز اور ان کے ساتھیوں کو ہاتھ بھی پھیلانے نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ نواب صاحب کے کچھ دوستوں نے بھی اطہر پرویز کی بہت مدد کی سریندر کمار جو کہ علی گڑھ ٹائگرس لاکس کے مالک تھے انہوں نے بھی اسکول کے لیے چندہ دیا۔ ان احباب کی مدد سے بالآخر نواب صاحب کی زمین پر ہی ''ذاکر حسین ماڈل ہائیر سکنڈری'' اسکول کی عمارت پائے تکمیل کو پہنچی۔ اور جنوری ۱۹۷۳ء کو اس میں بچوں نے پڑھنا شروع کیا۔ ذاکر حسین اسکول میں انگریزی زبان میں بھی بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔

الغرض ڈاکٹر اطہر پرویز نے بحیثیت مدیر، مدوّن، مدرس اور ادیب کے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے جامعہ ملیہ کی ملازمت کے دوران ہی لکھنا شروع کیا اور آخری عمر تک تصنیف و تالیف کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ آخری عمر تک جاری و ساری رہا۔ ان کی زیادہ تر تصانیف چوں کہ ادب اطفال پر مبنی ہیں۔ جن پر حکومت ہند نے انہیں انعامات سے بھی نوازا ہے۔

---

[۱] اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اردو گھر علی گڑھ، ۲۰۰۷، ص:۸۱

ڈاکٹر اطہر پرویز کی انعام یافتہ کتابیں

☆ نجومی آپا
☆ گلیلی گلیلیو
☆ مصنوعی چاند
☆ خلا کا سفر
☆ ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے
☆ توانائی کا راز
☆ ادب کا مطالعہ
☆ انمول رتن
☆ ہمارا ہندوستان
☆ پودوں اور جانوروں کی دنیا
☆ چارلس ڈارون
☆ اوڈیسی
☆ فاطمہ کی بکری

حکومت ہند کی طرف سے مصنف کو ان کتابوں پر انعامات سے نوازا گیا ہے۔

اطہر پرویز کی تصانیف

کتابوں کے نام	اشاعت	سن
۱- افغانستان	یونیسکو اور منسٹری آف ایجوکیشن	۱۹۵۳ء
۲- چین	نے یہ تین کتابیں شائع کیں	۱۹۵۳ء
۳- روس		۱۹۵۳ء
۴- ایوریسٹ کی فتح	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۵۳ء
۵- شرابی	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۵۳ء
۶- گلیلی گلیلیو (ڈراما)	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۷- بچوں کے حالی	ترقی اردو بورڈ	۱۹۵۹ء
۸- مصنوعی چاند	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۵۹ء
۹- باپو کے قدموں میں	ترقی ردو بورڈ	۱۹۵۹ء
۱۰- خلا کا سفر	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۷۱ء
۱۱- ادب کا مطالعہ	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۶ء
۱۲- ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے	اردو گھر علی، گڑھ	۱۹۶۴ء
۱۳- ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۳ء
۱۴- ایٹم کیا ہے	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۳ء
۱۵- ہمارے بن ہماری دولت	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۳ء
۱۶- توانائی کا راز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۱۷- ہمارا ذہن	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۱۸- نیا تیرتھ	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۱۹- انمول رتن	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء

۲۰-	نجومی آپا	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۵۷ء
۲۱-	چار درویش	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۲۲-	روشنی کے مینار	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۲۳-	ہمارا گھرانا	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۲۴-	اردو کے تیرہ افسانے	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۲۵-	ہمارا ہندوستان	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۸ء
۲۶-	بدن کی کہانی	اردو گھر علی گڑھ	۱۹۶۶ء
۲۷-	اردو کی نئی کتاب	اے ایم یو پبلیکیشن	۱۹۶۷ء
۲۸-	ایک اچھوت کی کہانی	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۷ء
۲۹-	نیا ادبی نصاب	اے ایم یو پبلیکیشن	۱۹۶۷ء
۳۰-	سورج کا گھرانا	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۸ء
۳۱-	فسانہ عجائب (مرتب)	سنگم پبلیشنگ ہاوس، الہ آباد	۱۹۶۹ء
۳۲-	قصہ حاتم طائی	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۷۳ء
۳۳-	ہمارے پسندیدہ افسانے	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۳۴-	پنچ تنتر کی کہانیاں	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۷۳ء
۳۵-	دیس دیس کی کہانیاں	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۵ء
۳۶-	ادب کسے کہتے ہیں	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۳۷-	علی گڑھ سے علی گڑھ تک	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	۱۹۷۷ء
۳۸-	الف لیلیٰ کی کہانیاں	(تین جلدوں) ترقی اردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۳۹-	ایک دن کا بادشاہ	ترقی اردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۴۰-	مشینی گھوڑا	ترقی اردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۴۱-	ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ	ترقی اردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۷۷ء

۴۲-	پودوں اور جانوروں کی دنیا	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۴۳-	بچوں کے اقبال	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
۴۴-	چارلس ڈارون	مجلس اشاعت ادب (رجسٹرڈ) دہلی	۱۹۸۱ء
۴۵-	منٹو کے نمائندہ افسانے	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۴۶-	راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۴۷-	اوڈیسی	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۸۳ء
۴۸-	کرشن چندر اور ان کے افسانے	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۴۹-	فاطمہ کی بکری	نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا	۱۹۸۶ء
۵۰-	محلے کی ہولی	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۵۱-	چراغ سے چراغ جلتا ہے	اردو گھر، علی گڑھ	
۵۲-	اسکول کی فیس (ایک مزاحیہ ڈرامہ)		
۵۳-	بچوں کے نظیر	اردو گھر، علی گڑھ	
۵۴-	آیئے غالبؔ سے ملیں		
۵۵-	ہولی اور چراغ	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۵۶-	شہر اور گاؤں	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۵۹-	چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو	براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۷ء

باب سوم

اطہر پرویز اور ادب اطفال

(الف) بچوں کے حوالے سے اطہر پرویز کی تحریریں

☆ اطہر پرویز کی سائنسی طرز کی تحریریں

☆ تراجم

☆ داستانوی طرز کی تحریریں

☆ ڈرامے

☆ متفرق ادبی تحریریں

☆ انتخابات

اطہر پرویز اور ادب اطفال

انگریزی میں ادب کے لیے لٹریچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لفظ لٹریچر جس مادے سے ماخوذ ہے اس کے معنی لکھے ہوئے حروف کے ہیں۔ یعنی لفظ لٹریچر ادب کے ظاہری اور خارجی روپ کو واضح کرتا ہے۔ ہندی اور سنسکرت میں ادب کے لیے 'ساہتیہ' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے اصلی معنی اجتماعی اور مجلسی شعور کے اظہار کے ہیں۔ یعنی صداقت و شرافت کے ساتھ مل جل کر رہنے کا سلیقہ اور عربی زبان میں ادب کے لیے لفظ 'ادب' ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ مختلف النوع مفہوم کا حامل ہے۔ ظہور اسلام سے قبل یہ لفظ عربی زبان میں ضیافت اور مہمانی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور بعد میں ایک اور مفہوم بھی شامل ہوا جسے ہم مجموعی لحاظ سے شائستگی کہہ سکتے ہیں۔ عربوں کے نزدیک مہمان نوازی لازمہ شرافت سمجھی جاتی ہے، چنانچہ شائستگی، سلیقہ اور حسن سلوک بھی ادب کے معنوں میں داخل ہوئے۔ جو مہمان نوازی میں شائستہ ہوگا وہ عام زندگی میں بھی شائستہ ہوگا اس سے ادب کے لفظ میں شائستگی بھی آ گئی۔ اس میں خوش بیانی بھی شامل ہے اسلام سے قبل خوش بیانی کو اعلیٰ ادب کہا جاتا تھا۔ گھلاوٹ، گداز، نرمی اور شائستگی یہ سب چیزیں ادب کا جزو بن گئیں۔ (بنوامیہ کے دور میں بصرہ اور کوفہ میں زبان کے سرمایہ تحریر کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں گرامر اور صرف ونحو کی کتب لکھی گئیں تاکہ ادب میں صحت انداز بیان قائم رہے۔ جدید دور میں ادب کے معنی مخصوص قرار دیے گئے۔ ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تخیل اور جذبات ہوں ورنہ ہر تحریری کارنامہ ادب کہلا سکتا ہے۔) اس اعتبار سے اس کو ادب اس لیے بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ادب کے لیے لفظ 'ادب' کا ہی مستعمل ہے۔ ادب انسان کو اخلاقی اقدار، سلیقہ شعاری اور مذہبی رواداری کا پابند بناتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری اپنی تصنیف ''ادب اور زندگی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ادب انسان کی تہذیب کی علامت اور اس کی ضمانت ہے۔ ادب کا

مقصد یہ ہے کہ اس کے اثر سے انسان بغیر وعظ و تبلیغ کے خود بخود پہلے سے زیادہ مہذب، زیادہ شریف، زیادہ نیک ہوتا جائے۔ فنکاری بالخصوص ادب انسان کے کردار سے نفس پرستی، خود غرضی، بغض وحسد، کینہ وعناد ،مکاری، عیّاری دوسروں کو فریب اور سازش کا شکار بنانے کے وحشانہ اور رکیک میلانات کو سلب کرتا رہتا ہے'' [۱]

اصطلاحی طور پر کسی بھی خیال کو بہترین الفاظ میں بہترین ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ادب کہلاتا ہے۔ ادب کی تشکیل ادیب کرتا ہے۔ یہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ بھی عام انسانوں سے بہت وسیع ہوتا ہے اسی لیے جب وہ مناظر فطرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو اس پر ایک الگ کیفیت طاری ہوتی ہے۔

اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کیفیت کی تصویر ہو بہ ہو دوسروں تک منتقل کی جائے۔ اس کے اظہار کے لیے وہ ایسے الفاظ کا سہارا لیتا ہے جو معمولی اور عام بول چال سے قدر مختلف ہوں ۔خیال کی شدت اور احساس کی کیفیت میں کسی طرح کی کمی نہ آئے۔ اس طرح منتخب الفاظ کے ذریعے دلکش اسلوب بیان میں کیے گئے اظہار خیال کو ادب کہتے ہیں۔

ادب میں انسانی زندگی اور مناظر قدرت کا بہترین اظہار ہوتا ہے۔ ادب ہر طرح کے جذبات غم، خوشی کو پیش کر کے انسان کو ذاتی خوشی، تسکین اور تفریح طبع کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ادیب کا کمال یہ ہے کہ معمولی سے معمولی چیز کو بھی تخیل کی آمیزش سے غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ ادیب کسی واقعے کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ اس واقعے سے خواہ کوئی بھی فرد دوچار رہا ہو لیکن جب کوئی اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو خود اس کے دل کی کیفیت ہے۔ اس احساس سے تو وہ بھی دوچار ہوا ہے۔ اصل میں ادیب کے دل و دماغ پر خارجی واقعے کے اثرات اس کی شخصیت میں جذب ہو کر زبان و بیان کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس عمل میں ادیب اس کیفیت کو مکمل طور پر اپنے اوپر طاری کرتا ہے اور قاری تک اس کیفیت کی ترسیل کرتا ہے۔ اس کیفیت کے حصول کے لیے فنکار کو خود انہیں حالات و تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ:

---

[۱] مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، اردو گھر علی گڑھ، ۱۹۴۸ء، ص: ۴۱

''جب تک موجود میں ممکن، واقعہ میں تخیل، حال میں مستقبل کا عنصر
داخل نہ ہو ادب وجود میں نہیں آتا۔'' [۱]

اطہر پرویز اپنی مشہور کتاب ''ادب کا مطالعہ'' میں ادب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں روزمرّہ کے خیالات سے بہتر خیالات
اور روزمرّہ کی زبان سے بہتر زبان کا اظہار ہوتا ہے۔ ادب انسانی
تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ انسان دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، ....جو
سوچتا سمجھتا ہے اس کے ردّعمل کا اظہار ادب کی شکل میں ہوتا ہے، یہی
وجہ ہے کہ ادب زندگی کے وسیع ترین مسائل کا احاطہ کرتا ہے اور اس کے
ذریعہ پروان چڑھتا ہے۔'' [۲]

ادیب وشاعر بہت ہی عمیق نظری اور گہرائی سے معاشرے کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کی اچھائی اور برائی، کمی اور خوبی، کثرت اور قلت کا عکس صاف صاف اپنی تحریروں میں پیش کردیتا ہے۔ کیوں کہ ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ ادیب ادراک کی صلاحیت سے بھرپور اور اس کے قوتِ اظہار کے فن سے بھی واقف ہوتا ہے۔ اس کے ادراک اور اظہار میں اتنی داخلی اور خارجی وسعت اور تہ داری ہوتی ہے کہ ادب انفرادی وذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہوتا ہے جتنا بڑا ادیب ہوگا اس کے تجربے کا تنوع، اس کا شعور وادراک اور اس کا اظہار اتنا ہی بڑا اور آفاقی ہوگا۔ جمیل جالبی نے ادب کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے کہ:

''ادب چونکہ لفظوں کی ترتیب وتنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں
میں جذبہ وفکر بھی شامل ہوتے ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہے لفظوں کے
ذریعے جذبے، احساس یا فکر وخیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں'' [۳]

ادب میں بہترین خیالات اور روزمرّہ کی زبان سے بہتر الفاظ کا انتخاب ہوتا ہے یعنی ادب میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ خیال کو بہتر سے بہتر بنا کر ایسی زبان اور الفاظ میں پیش کیا جائے جو پرکشش

---

۱ مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، ص:۳۸، اردو گھر علی گڑھ ۱۹۸۴

۲ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، اردو گھر، علی گڑھ، ص:۳۰

۳ ادب وکلچر اور مسائل، ڈاکٹر جمیل جالبی، مرتبہ خاور جمیل، ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸ء، ص:۱۵

اسلوب اورمنفرد خیالات کا حامل ہو۔اسے پڑھنے والامحظوظ ہو۔

بچے کھلتی کلیاں اورانمول موتیکے مانند نازک ہوتے ہیں۔جن کے رنگ،مہک،چمک اورنور سے کسی قوم میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے اور ملک کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔جمہوری ملکوں میں بچوّں کوانمول آئینہ مانا جاتا ہے جس میں ایک اچھے شہری کا عکس جھلکتا ہےانہیں ملک کی ترقی وتعمیر کاسنگِ بنیاد مانا جاتا ہے۔یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ خاندان ملک وقوم کے روشن مستقبل کا انحصار بچوں سے ہی وابستہ ہوتا ہےاسی لیے بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت اشد ضروری ہے چونکہ آج کا بچہ ہی کل کا شہری ہوتا ہےاس اعتبار سے دیکھا جائے تو بچے قوم کی امانت ہوتے ہیں اور یہ امانت تحفظ کا تقاضا کرتی ہے۔معاشرے کے ہرفرد سےادب ہی وہ اہم آلہ ہے۔جس سے ہم اس امانت کی حفاظت کماحقہ کرسکتے ہیں۔یہ ازل سے ہی ثابت ہے کہ بچے معصوم ہوتے ہیں چاہےان کاتعلق کسی بھی قوم ملک ومعاشرے سے کیوں نہ ہوں یہ بھی حقیقت ہے کہ بچوں سے ہی سماج بنتا اور بگڑتا ہےاسی لیےضروری ہے کہ بچوں کی صحیح تعلیم موزوں مناسب تربیت اور پرورش ونگہداشت ہو۔اورتعلیم ہی وہ واحد زریعہ ہےجس سے بچوں کے عادات واطوار اوراخلاق وکردار کی تربیت وتشکیل صحیح طریقے سے ہوسکتی ہےبچپن کا زمانہ تجسس اوراستفسار کا زمانہ ہوتا ہے۔بچہ اپنے اردگرد ماحول اورآس پاس کے اشخاص واشیاء کو جاننے کا خواہاں ہوتا ہے۔اور یہ خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ اسکول کی نصابی کتب سے اسے تشفی حاصل نہیں ہو پاتی کیوں کہ نصابی کتابوں کوتعلیمی نقطۂ نظر سے مرتب کیا جاتا ہےلہذا درسی کتب میں فراہم کردہ مواد بھی محدود ہوتا ہےبچوں کواس کےسوابھی کچھ مطلوب ہوتا ہےجس سے وہ اپنے ذہن ودل کوتسکین پہنچا سکے۔بچپن کےمتعلق مشیر فاطمہ کا خیال ہے کہ:

> ''بچپن کا زمانہ تعجب۔استفسار کا زمانہ ہے۔بچّے کا متحرک اوروسیع ذہن صرف ایک اچھی کتاب ہی کے ذریعے اپنے تجربات کو بڑھا سکتا ہے۔ بچے کے محدود ماحول میں کتاب کی بڑی اہمیت ہے بچّے کے لیےاس کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ کتاب میں کیا ہوتا ہے۔بچہ انفرادیت پسند ہوتا ہے۔کتاب کے معاملے میں بھی وہ اپنی ذاتی رائے کواہمیت دیتا ہے۔''[۱]

---

[۱] مشیر فاطمہ،بچوں کےادب کی خصوصیات،انجمن ترقی اُردو(ہند)علی گڑھ،مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی ص:۶۸/۶۹

جب ہم عالمی ادب اطفال کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں۔ تو اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے کہ قوم کے سب سے قیمتی خزانے کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ دراصل کئی صدیوں پہلے بچوں کا سماجی اعتبار سے کوئی وجود ہی نہیں گردانا جاتا تھا بلکہ ان کو معاملاتِ زندگی میں بڑوں پر ہی موقوف سمجھا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے متنوع سائنسی اختراعات وانکشافات سامنے آئیں اور ماہرین تعلیم نفسیات نے ترقی کی تو یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ بچے اپنی ایک منفرد دنیا رکھتے ہیں۔ جو بڑوں کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ بچوں کے احساسات وجذبات اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی طرف بھی توجہ مرکوز کی گئی اور بچوں کو بڑوں کی ہی مانند ایک اکائی تسلیم کیا گیا۔ اس طرح سماجی اعتبار سے بچے کی حیثیت بھی مستحکم ہوگئی۔ بیسویں صدی میں بچوں کی ذات اور مسائل کو باقاعدہ قبول کرتے ہوئے جب ادب اطفال کی جانب توجہ مبذول کی گئی تو ایک سوال پیدا ہوا کہ ادب اطفال میں کس قسم کا مواد پیش کیا جائے کیوں کہ بچے بڑوں سے الگ فطرت اور مختلف نفسیات کے مالک ہوتے ہیں دونوں کی زندگی کے تقاضے بھی منفرد نوعیت کے حامل ہیں۔ یوں تو انیسویں صدی میں جہاں ادب اطفال کا باقاعدہ آغاز ہوا وہیں بیسویں صدی میں ادب اطفال میں زبردست انقلاب رونما ہوا۔ جس کا ذکر ڈاکٹر خوشحال زیدی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''اردو میں بچوں کا ادب'' کیا ہے:

> ''صدیوں تک بچے کو کوئی سماجی مقام حاصل نہیں تھا۔ وہ ہر معاملے میں بڑوں کا ہی محتاج تھا۔ انیسویں صدی میں سائنس اور ماہر تعلیم نفسیات نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اور جدید سائنسی ایجادات سامنے آئیں۔ چنانچہ بچے کے احساسات، جذبات اور نفسیاتی رجحانات کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی نیز بچے کو بڑے کی ایک اکائی تسلیم کیا گیا۔ سماج میں بچے کی ایک حیثیت مستحکم ہوگئی۔ اس کی حیثیت بیسویں صدی میں پوری طرح اُبھر کر سامنے آئی۔ بچے کا موجودہ تصّور (concept) بیسویں صدی ہی کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ادب کا تصّور بھی بیسویں صدی میں ہی اُبھر کر سامنے آیا۔'' [1]

---

[1] ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، کلر پرنٹنگ پریس دہلی، سن اشاعت ۱۹۸۹ء ص: ۱۴۸

بچوں کے ادب کی تعریف:

انسان دنیا کی سب سے عظیم ترین مخلوق ہے۔کائنات کی ساری رحمتیں انسان کے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں اوراس دنیا میں انسان کا ظہور بچہ کی شکل میں ہوتا ہے۔جس کی آمد پر پورا گھر کھل اٹھتا ہے جس طرح گھر والے بچوں کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ان کے کھانے ، پینے ، رہن وسہن، کھیل کود اور سیر وتفریح میں ان کی پسند، خواہش اور شوق کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح ہمیں بچوں کے ادب کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے۔اردو میں عموماً بڑوں کے ادیب وشاعر جو ادب بڑوں کے لیے لکھتے ہیں اسی کو بچوں کے سر پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔نہ ہی انہیں بچوں کے ادب کے متعلق جانکاری حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی وہ بچوں کی نفسیات سے آگاہ ہوتے ہیں چوں کہ بچوں اور بڑوں کی فطرت اور ذہنی کارکردگی الگ الگ ہوتی ہے۔عمر میں فرق کے ساتھ ان کی زندگی کے تقاضے بھی مختلف ہوتے ہیں۔بچوں اور بڑوں کی نفسیات میں بھی فرق ہوتا ہے۔اسی لحاظ سے ان کے موضوعات بھی الگ الگ ہوتے ہیں لہذا لازمی ہے کہ بچوں کا ادیب بچوں کی نفسیاتی نشیب وفراز اوران کی ضرورتوں سے اچھی طرح واقف ہو کیوں کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لیے ادیب کو بچوں کی فطرت کا راز دار بننا پڑتا ہے تا کہ اپنے ادب پارے کو موضوع اور اسلوب بیان کے لحاظ سے بچوں کی فطرت سے ہم آہنگ کر سکے۔یعنی وہ ادب جو زبان وبیان اور مواد کے لحاظ سے خالصتاً بچوں کے لیے تخلیق کیا گیا ہو اسے ادب اطفال کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔جیسا کہ زیب النساء بیگم لکھتی ہیں کہ:

> ''ہر وہ شخص جو اس منصب کا دعویدار ہو، بچوں کا ادیب نہیں کہلایا جاسکتا ہے اور نہ ہی ہر کتاب جس پر بچوں کے نام کا ٹھپہ لگا ہوا ہو بچوں کے ادب کی کتاب سمجھی جاسکتی ہے''۔[۱]

لیکن ادیبوں کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہو کہ وہ ایک عظیم واہم کام سرانجام دے رہے ہیں۔اورانھیں پوری لگن ،سنجیدگی ،تیاری اور جذبے کے ساتھ اس کام کو انجام دینا چاہیے۔کیوں کہ ملک وقوم کا

---

۱ اقبال اور بچوں کا ادب، زیب النساء بیگم، ترقی اردو بیورو، ص:۱۵

مستقبل انہی کے ہاتھوں کا پروردہ ہے۔ادب اطفال کی دیگر تعریفیں۔خوشحال زیدی بچوں کے ادب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ادب اطفال'' اس ادب کو قرار دیا گیا جو محض بچّوں کی درس وتدریس کے لیے نہیں بلکہ ان کی تفریح طبع ان کی دلچسپیوں اوران کے فطری رجحانات کی نشوونما کے لیے ہو'' ۱؎

دوسری جگہ وہ بچوں کے ادب کے بارے میں کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

''بچوں کے ادب سے مراد تین قسم کی کتابیں ہیں۔پہلی وہ مختلف قسم کی کہانیاں جو خاص طور پر بچوں اور بچیوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔دوسرے اساطیری اور پریوں کی کہانیاں اور تیسرے قسم کی وہ کتابیں جو بڑوں کے لیے لکھیں گئیں لیکن موضوع اور اسلوب کی وجہ سے بچوں نے انھیں اپنالیا اور وہ کتابیں بچوں کے ادب کا ایک حصہ ہوکر رہ گئیں'' ۲؎

بچوں کے ادب کے بارے میں بچوں کے ادیب شفیع الدین نیّر لکھتے ہیں کہ:

''بچوں کے ادب سے مراد نظم ونثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے موزوں ہو یا یوں سمجھیے کہ جو ادب چار یا پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ برس تک کے بچوں کے لیے مخصوص ہو اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔بلاشبہ بچوں کے ادب کو بھی زبان کی نظم ونثر کو اوسط درجہ بخشتی ہیں۔ان تحریروں میں خیال کی وسعت، جذبہ کی صداقت، زبان کی لطافت اور بیان کا حُسن شامل ہیں'' ۳؎

۱؎ ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، مطبوعہ کلر پرنٹنگ پریس دہلی، مارچ ۱۹۸۹ء، ص:۱۴۸

۲؎ ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، مطبوعہ کلر پرنٹنگ پریس دہلی، مارچ ۱۹۸۹ء، ص:۱۴۲

۳؎ اردو میں بچوں کا ادب، شفیع الدین نیّر، سیمینار اردو میں بچوں کا ادب (جامعہ ملیہ اسلامیہ) بحوالہ اردو میں بچوں کا ادب، ڈاکٹر خوشحال زیدی، ۱۹۸۹ء ص:۲۸

ڈاکٹر عادل حیات بچوں کا ادب کس طرح کا ہونا چاہیے اس سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ تعریف عصری تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کی گی ہے:

(۱)۔ جو بچوں کی حقیقی زندگی پر مبنی ہو اور جس میں فکر و عمل کے دروازے کھولنے کی قدرت پائی جائے۔

(۲)۔ جسے لکھتے ہوئے بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی سطح اور ان کے تدریجی ارتقاء کا خیال رکھا جائے۔

(۳)۔ جو بچوں کی تفریح طبع کے ساتھ اُن کے فکر و عمل کا ساتھ دے، اُن کے شعور کو کو بیدار کرے، ان میں اچھے برے کی تمیز پیدا کرے، اُن کے نفس کی تہذیب کرے اور جس میں بچوں کو ایک اچھا شہری اور نیک انسان بنانے کی قوت پائی جائے۔'' [۱]

یہ بات سچ ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنا آسان کام نہیں ہے کیوں کہ بچوں کا ادب چند شرائط کا پابند اور مخصوص روایات کا متقاضی ہوتا ہے۔ بچوں کے ادب میں بڑوں کے مقابلے میں زیادہ محنت و مشقت، غور وفکر اور عرق ریزی کی ضرورت پیش آتی ہے کیوں کہ بچوں کے شعراء و ادباء بچوں کے لیے ادب پارہ تخلیق کرتے وقت احساس و تجربے کی اُس کیفیت سے آشنا نہیں ہو پاتے جس کیفیت سے عموماً بالغوں کے ادیب و شاعر دوچار ہوتے ہیں۔ نہ ہی جذبے کی وہ شدّت پیدا ہو پاتی ہے جو بچوں کی طبیعت کے مطابق ہو کیوں کہ بچوں کے تخلیق کار کو بچہ بن کر تخلیقی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو یقیناً ایک مشکل امر ہے۔ اس حوالے سے ''اقبال اور بچوں کا ادب'' میں زیب النساء بیگم لکھتی ہیں کہ:

> ''بچوں کا ادب اس وقت تک بچوں کا ادب کہلانے کا مستحق نہیں جب تک لکھنے والا خود اپنے آپ کو بچہ ہی نہ بنالے اور اسی انداز میں سوچنے سمجھنے لگے اور بچوں کے لیے لکھے'' [۲]

ادب اطفال کے بارے میں ظ انصاری کا یہ خیال غیر معمولی نوعیت کا ہے کہ:

> ''بچوں کے لیے لکھنا آدمی کے مستقبل سے بات کرنا ہے'' [۳]

---

[۱] رسالہ ادبی میراث، شمارہ دسمبر، ۵، ۲۰۲۰، بچوں کا ادب: کل، آج اور کل، ڈاکٹر عادل حیات

[۲] اقبال اور بچوں کا ادب، زیبا النساء بیگم، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۲۰۰۰، ص ۱۵

[۳] اردو میں بچوں کا ادب: ایک جائزہ، پروفیسر اکبر رحمانی، مشمولہ مضمون بچوں کے لیے لکھنا، ظ انصاری، ایجوکیشنل اکادمی، اسلام پورہ، جلگاؤں ۱۹۹۱ء ص: ۱۲

بچے فطرتاً گیلی مٹی کے مانند ہوتے ہیں ان کو ابتداء سے ہی جس ساخت و ہیئت میں ڈالا جاتا ہے وہ بعد میں وہی شکل وصورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے سانچوں کی تعمیر جس مواد یا خمیر سے ہوتی ہے وہ اسی میں ڈھل جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے والدین، اساتذہ، تخلیق کار پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کے سرمایے کی پرورش وپرداخت کس فکری نہج پر کرنا چاہتے ہیں۔ اوران کی ساخت کس قسم کے مواد سے تشکیل دینا چاہتے ہیں یہ قطعاً ہمارا فیصلہ ہوگا۔ اگر یہ مواد صحت مند روایات، ذہنی استعداد، جبلی ضروریات اور نفسیاتی تقاضوں کے عین مطابق ہوگا تو یقیناً بچے کی تعلیمی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور وہ تعلیمی زیور سے آراستہ ہوتے ہوئے ملک وقوم کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرے گا۔ مولانا آزاد کی رائے پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالرزق فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے، جو انسان کی بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے سکے تا کہ بچہ ارتقاء کی منزلوں میں پیچھے نہ رہ جائے بلکہ انقلاب کا امام بنے، البتہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ تاروں کی تلاش میں انسان کے پاؤں زمین سے اکھڑ جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے چند بنیادی اصولوں پر جو ازلی اور ابدی ہیں پابند رہ کر انسان ارتقاء کے منازل طے کرے'' [1]

لہذا اشد ضروری ہے کہ ادیبوں وشاعروں کو بچوں کی نفسیات کا مکمل علم ہوتا کہ وہ بچوں کو ان مزاج سے مطابقت رکھنے والی کتابیں فراہم کر سکیں۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے بچوں کا ذہن بہت تیزی سے متحرک ہوتا ہے۔ اوراس کی شخصیت سازی میں مسلسل تبدیلی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے خوشحال زیدی نے اپنی مشہور تصنیف ''اردو میں بچوں کا ادب'' میں مطالعے کے سلسلے میں ولیم گرے کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''روز مرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے رہن سہن اور زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لیے شہریت اور انسانی افکار کی وسعت کے لیے دنیا کو سمجھنے کے لیے مذہبی ضروریات کو

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات، (ان کے سماجی، سیاسی اور مذہبی افکار کے پس منظر میں) از محمد عبدالرزاق فاروقی (انجمن حیات نوشاہ پور گلبرگہ) ۱۹۸۵ء، ص:۱۵۶-۱۵۷

بڑھانے اوران کو پورا کرنے کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔زندگی
کورنگین بنانے میں کتابوں کی بہت اہمیت ہے۔'' [۱]

بچوں کی ادبی نوعیت کے رموز ونکات سے واقفیت کے علاوہ بچوں کی نفسیات سے مکمل آگاہی لازمی ہے جس کے بغیر صحت مند ادب مہیا نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے ویسے ہی نفسیاتی رجحانات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بچوں کی کتابیں بھی نفسیاتی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر تیار کی جائیں۔)اسی ضرورت کے پیش نظر ماہرین تعلیم نفسیات نے بچوں کی عمر کو مختلف منزلوں میں منقسم کیا ہے تاکہ بچوں کی نفسیات کو سمجھنے میں آسانی ہو پہلی منزل پانچ سال سے کم عمر کے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔اس منزل کو قبل مدرسہ منزل بھی کہتے ہیں۔عمر کے اس مرحلے میں ادب سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا وہ چھوٹی، سادہ اور عام فہم کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں۔نقالی کا شوق بھی اس عمر میں پایا جاتا ہے۔ بچہ اپنے آس پاس کے ماحول اور اپنے بزرگوں سے اثر قبول کرتا ہے۔اس عمر میں بچہ کی سیکھنے کی قوت بہت تیز ہوتی ہے، وہ اپنے بڑوں کی نقل کرتا ہے۔ انسان کی جبلت میں نقالی کا عمل موجود ہے اسی لیے جو چیزیں وہ اپنے بڑوں میں پاتا ہے اسے من وعن قبول کر لیتا ہے۔اس کے متعلق ڈاکٹر خوشحال زیدی کا خیال ہے کہ:

''بچوں میں تخیل کے ساتھ اخذ کرنے نقل کرنے اور اس سے متاثر ہونے
کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے'' [۲]

اس عمر میں بچے کو زیادہ ترصوتی آہنگ، مترنم آواز اور لفظی تکرار سے بھری ہوئی نظمیں پسند آتی ہیں۔ دوسری منزل چھ سے بارہ سال کی عمر تک کے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔اور یہی عمر پرائمری تعلیم کی منزل ہوتی ہے اس عمر کے بچے خیالی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں قدم جمانے میں کوشاں ہوتے ہیں۔اور اپنے بڑوں کے عادات واطوار، ان کے رہن سہن کو جاننے میں دلچسپی لیتے ہیں۔عمر کے اس مرحلے میں بچہ آزادی اور خودمختاری کو پسند کرتا ہے۔اس عمر میں بچہ ذخیرۂ الفاظ کی قوت میں اضافہ تخیّل کی رفعت، تجربات کی وسعت اور اعتماد کی پختگی کے ساتھ زندگی کی نئی امنگوں وآرزوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔عمر کے اس منزل میں ہمیں بچوں کو

---

[۱] ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، کلر پرنٹنگ پریس دہلی، سن اشاعت ۱۹۸۹ء ص:۹۶

[۲] ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، کلر پرنٹنگ پریس دہلی، سن اشاعت ۱۹۸۹ء ص:۶۷

ایسی کتابیں دستیاب کرنی چاہئیں جس میں سچائی، دیانتداری اور بصیرت ہو جو ذہنی سکون' تفریح طبع' زبان کی پختگی اور حیرت واستعجاب کو آسودہ کرنے میں معاون ثابت ہوں تا کہ ان کی دلچسپی کا عنصر بھی باقی رہے۔اور ان کی ذہنی نشوونما بھی مثبت طریقے سے ہو بچے چوں کہ سیماب صفت ہوتے ہیں۔وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے اسی لیے ضروری ہے کہ یہ کتابیں بچوں کو ذہنی طور پر متحرک اور جسمانی قوت کو برقرار رکھنے کی سکت رکھتی ہوں ۔اس حوالے سے پروفیسر معین الدین لکھتے ہیں کہ:

''بچوں کی عمر ایک تعمیری اور تشکیلی عمر ہوتی ہے۔یہ ذہنی، جسمانی اور سماجی نشوونما کی عمر ہوتی ہے ۔اس عمر میں تصورات جنم لیتے ہیں ۔تخیل کے سوتے پھوٹتے ہیں ،اور نئے رویوں کی داغ بیل پڑتی ہے ۔اس لیے بچوں کے لیے ایسا ادب مہیا کرنا چاہیے، جس میں زندگی خوشی سے جھومتی نظر آئے ۔ایسی زندگی جس پر دکھ، درد، مایوسی اور پست ہمتی کا سایہ بھی نہ پڑا ہو۔وہ زندگی جو بچوں میں جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دے اور انہیں حقیقی مسرت سے ہم کنار کرے'' [۱]

بچوں میں نشوونما کی خواہش بھی بڑی شدید ہوتی ہے ایک تندرست بچہ صرف ان اشیاء کو پسند کرتا ہے۔ جو اس کی داخلی وخارجی تسکین کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں اسی طرح ایک اچھی اور کامیاب کتاب کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ بچے کو ذہنی اور جسمانی طور پر آگے بڑھانے میں معاون ہو۔تیسری منزل ۱۲ سے ۱۸ سال کی عمر پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ دور انسان کی تشکیل وتکمیل کا دور کہلاتا ہے۔ یہ بہت نازک دور ہوتا ہے کیوں کہ اس عمر میں بچوں میں جو عادتیں پڑ جائے اس کو بدلنا مشکل ہوتا ہے عمر کے اس مرحلے میں بچے کے عادات واطوار پختہ ہوتے ہیں اور ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بھی بچہ مضبوط ہوتا ہے ۔اس عمر میں بچے کے سامنے ایسا نصب العین پیش کرنا چاہیے جس کے ذریعے وہ اپنی آئندہ آنے والی زندگی کا مطمح نظر متعین کرسکیں تا کہ جس طرح بچہ جسمانی اعتبار سے مختلف منزلیں طے کرتا ہے ٹھیک اسی طرح جب وہ اپنے مطالعاتی مراحل کو عبور کرتا ہوا آگے

---

۱ اردو میں بچوں کا ادب :ایک جائزہ، پروفیسر اکبر رحمانی ،مشمولہ مضمون بچوں کا ادب ، پروفیسر معین الدین ، ایجوکیشنل اکادمی، اسلامپورہ، جلگاؤں ۱۹۹۱ء ص:۵۲

بڑھتا ہے تو اس کو بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ لہذا ادب اطفال کے بنیادی عناصر وہی نفسیاتی موضوعات ہیں جن کو ملحوظ رکھ کر بچوں کو صحت مند ادب مہیا کیا جا سکتا ہے تا کہ بچوں کی شخصیت سازی اور سیرت سازی کی تعمیر صحیح نہج پر ہو سکے۔ اردو میں بچوں کی نفسیات کے بارے میں ڈاکٹر خوشحال زیدی جنہیں ادب اطفال کے پہلے محقق ہونے کا شرف حاصل ہے اس کے علاوہ وہ بچوں کے کامیاب ادیب و کہانی کار کے لحاظ سے بھی شہرت رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

''بچہ زیادہ تر ایسی کہانیوں کے پڑھنے میں دلچسپی لیتا ہے جن میں مافوق الفطرت واقعات اور کردار ہوں، جیسے پری، دیو وغیرہ۔ وہ ایسی کہانیوں کا دلدادہ ہوتا ہے کہ جن میں جنگل اور پہاڑوں کا تذکرہ ہو، ایسے بہادروں اور سچے انسانوں کا ذکر ہو جو مصائب اور پریشانیوں کو بہادری سے برداشت کرتے ہوں، ہولناک اور خوں خوار جانوروں کا مقابلہ کر کے ان کی شکست دیتے ہوں مہمّات سر کرتے ہوں، اور انسانوں کو برائی اور ظلم سے نجات دلاتے ہوں'' [۱]

جب ہم تاریخی اعتبار سے اردو ادب اطفال کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو امیر خسرو، میر تقی میر، نظیر اکبرآبادی اور غالب کے یہاں ادب اطفال کے ابتدائی نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر میں بچوں کے ادب پر کافی توجہ مبذول کی گئی اور باقاعدہ ادب اطفال کا آغاز ہوا۔ دہلی اور پنجاب میں اردو کا بازار خاصا گرم تھا۔ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، مولوی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور پیارے لال آشوب، اسماعیل میرٹھی جیسے نامور ادباء و شعراء نے اردو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے نہایت ہی منظّم طریقے پر کتابیں لکھیں ہیں۔ اس دور کے شاعروں اور ادیبوں نے اردو میں اپنی نظموں، کہانیوں اور مضامین سے بچوں کے ادب کو خوب روشن کیا۔ اس دور میں تخیلی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے انھیں حقیقی دنیا سے آشنا کیا گیا۔ ان ہی معروف شعراء نے سب سے قبل قصے کو باقاعدہ اخلاقی تربیت کے طور پر استعمال کیا۔ دورِ اول کے ان شعراء نے اپنی تحریروں میں بچوں کے جذبات و خیالات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ایسی تخلیقات پیش کیں جن میں ان کے

---

[۱] ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، کلر پرنٹنگ پریس دہلی، سن اشاعت ۱۹۸۹ء ص: ٦٧

لیے نہ صرف دلچسپی کا سامان مہیا کیا گیا بلکہ نظم ونثر کے ننھے قارئین کے سن وسال اور مزاج و مذاق سے مطابقت رکھنے والا ادب بھی تخلیق کیا۔اس دور کے ادیبوں کے ادب میں ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے ایک ہی مقصد کے تحت اپنی تحریریں پیش کیں۔اور اپنی تخلیقات کو بنیاد بنا کر بچوں کو زندگی کی دشواریوں اور پیچیدہ مسائل سے آگاہ کیا اور نئی نسل کو زندگی کی صحت مند قدروں کا احساس دلایا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ادب اطفال کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہو چکا تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں تخلیق واشاعت کا کام بہت تیزی سے شروع ہوا اور بچوں کے لیے عمدہ کتابیں شائع ہونے لگیں۔اس سلسلے میں کتابوں کے بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے۔دارالاشاعت پنجاب،انڈین پریس الہ آباد، فیروز اینڈ سنز لاہور،نسیم بک ڈپو لکھنئو،عبدالحق اکادمی حیدرآباد، مکتبہ جامعہ نئی دہلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ایک اہم کام یہ بھی ہوا کہ حکومت نے بھی بچوں کے ادب کے فروغ کے تحت اپنی زمہ داریوں کو محسوس کیا۔اور بعض اداروں کا قیام عمل میں آیا نیشنل بک ٹرسٹ کا قیام ملک کے پہلے وزیراعظم جواہرلال نہرو کی قیادت میں ہوا۔جس کا مقصد بچوں میں مطالعہ کی عادت کو فروغ دینا تھا۔اس کے علاوہ قومی اردو کونسل N.C.E.R.T اور اردو کی مختلف اکادمیوں کے زیرسایہ بچوں کے لیے کتابیں بھی نئے طرز پر شائع کی گئیں اور ادب اطفال کا وسیع پیمانہ پر ترجمے کا کام بھی شروع ہوا۔یہ ترجمے زیادہ تر اردو کے جانے پہچانے قلمکاروں نے سرانجام دیے۔جن میں قرۃ العین حیدر،اطہر پرویز،مسعود حیات،رضیہ سجاد ظہیر،انور کمال حسینی اور سراج انور وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے جنہوں نے ترجمے کے ذریعے ادب اطفال میں خوشگوار اضافہ کیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بچوں کا ادب صحافت سے روشناس ہوا اسی لیے بچوں کے ادب کی ترویج واشاعت میں اخبار ورسائل کا بھی اہم رول رہا ہے۔یہ رسائل وجرائد بچوں کے لیے ادبی ذخائر کا درجہ رکھتے ہیں۔بچوں کو تفریح طبع کا سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی پیدا کرتے ہیں۔اس ضمن میں لاہور سے ''پھلواری''،''پھول'' اور ''بچوں کا اخبار'' لاہور سے ''کلیاں''، لکھنئو سے ''کرنیں'' ناگپور سے ''غنچہ'' بجنور سے ''ننّھا'' حیدرآباد سے ''نور'' اور ''نونہال'' حیدرآباد سے ،رامپور سے ''ننھّا'' ''اتالیق'' حیدرآباد سے ''کھلونا'' اور جامعہ مکتبہ نئی دہلی سے ''پیام تعلیم'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''پیام تعلیم'' کا شمار اردو کے اہم رسائل میں ہوتا ہے۔ذاکر حسین اس رسالے کے روح رواں تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے بچوں میں تعمیری ذہن اور تخلیقی رو۔جحان پیدا کرنے کے لیے اور بچوں کی شخصیت کی تعمیر کے غرض سے اپریل ۱۹۲۶ء کو ''پیام تعلیم'' کا اجراء کیا ۔جب جامعہ نے ذاکر حسین کی قیادت میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو اس وقت ادب اطفال کا شعبہ تہی دامن تھا، بچوں کی تعلیم اور اس کے مسائل میں دلچسپی لینے والے گنے چنے افراد تھے ۔اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بچوں کے ادب کی ترویج واشاعت کو ایک اہم تعلیمی ضرورت قرار دیا گیا۔ بچوں کے لیے نظمیں تو لکھی جارہی تھی لیکن بچوں کے ادب کا نثری گوشہ توجہ طلب تھا''پیام تعلیم'' نے بچوں کے نثری گوشے کی جانب توجہ کی ۔اواردور کے نامور ادیبوں نے بچوں کے لیے نثری تخلیقات میں اپنی قیمتی تحریروں سے اردو ادب اطفال میں بیش بہا اضافے کیے ہیں ۔

جامعہ کی سرگرمیوں کو ملک سے باخبر کرنے کے لیے ،اور باہر کے ملکوں میں تعلیم کے جو نئے نئے تجربے کیے جاتے تھے۔شروع میں ان احوال کا بھی اس رسالے میں ذکر کیا جاتا تھا۔اس رسالے کو مشاہیر قلم کاروں کا تعاون بھی حاصل تھا۔شروع میں یہ پندرہ روزہ تعلیمی رسالے کی شکل میں جاری ہوا۔لیکن پھر ماہنامہ بن گیا۔ پیام تعلیم بچوں میں خاصا مقبول رہا اس کی مقبولیت کا اندازاس کی اشاعت کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے ۔۱۹۴۱ء میں اس تعداد اشاعت سولہ سو تھی ۱۹۴۴ء میں یہ تعداد(۲۵۰۰) ڈھائی ہزار کے قریب تھی اور ۱۹۴۷ء میں تین ہزار کے آس پاس تھی اور موجودہ دور میں آٹھ ہزار سے دس ہزار کے درمیان پہنچ چکی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ واحد بچوں کا رسالہ ہے جو یو پی ،سی پی ،میسور، برار، حیدرآباد اور کشمیر کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ تھا۔اس رسالے کے سرورق پر'' جاگو اور جگاؤ '' پرُ خیز معنوی عبارت لکھی ہے۔اداریے کا تخاطب بچے ہوتے تھے۔اور بچوں کی ضروریات ومسائل اور مشکلات موضوع بحث ہوتے تھے اسی لیے بچوں کی نظر میں اہمیت کا حامل ہے۔موضوعات کے حوالے سے بھی تنوع سے کام لیا گیا تھا۔معلوماتی اور مفید فیچرس کی وجہ سے اس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی ۔کشیدہ کاری ،باغبانی ،فوٹوگرافی اور دیگر کئی دلچسپ موضوعات پر مضامین کی اشاعت ہوتی تھی ۔سب سے بڑا کام یہ انجام دیا کہ بچوں کی عمر کے لحاظ سے بھی اس رسالے نے بچوں کے ادب میں اہم تجربے کیے گئے تھے۔اس کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالے کے ایک حصے میں ننھے بچوں کے ذوق ذہنی ومیلان طبع کے مطابق مضامین ملتے ہیں۔ دوسرے گوشے میں بڑوں کے مناسب مزاج اور تیسرے حصے میں بچیوں کے نام تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔لیکن پھر رفتہ رفتہ پورے

رسالے پر بچوں کا قبضہ ہوگیا۔

ذاکر حسین کے حلقہ احباب اور جامعہ کے اساتذہ نے اپنے علمی اقدامات سے رسالے کو بہت کم عرصے میں چار چاند لگادیے۔ ذاکر صاحب خود بھی بہت شوق سے رسالے کے لیے لکھتے اور دوسرے ادیبوں کو بھی لکھنے پر اکساتے تھے اصل میں جامعہ اور مکتبہ جامعہ کا تعلق بہت گہرا تھا، جس کی وجہ سے ''پیام تعلیم'' کی رسائی بہت کم وقت میں نامور ادیبوں تک ہوگئی۔ اور کثیر تعداد میں اردو کے معروف فنکاروں کی نگارشات شائع ہوتی رہیں۔ جن میں ذاکر حسین، جواہر لال نہرو، مختار احمد انصاری، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، برج نارائن چکبست، عبدالماجد دریابادی، پروفیسر مسعود حسین خان، کنہیالال کپور، منشی پریم چند، رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر امیر حسن، پروفیسر سید عطاء اللہ، عبدالواحد سندھی، عبدالغفار، حفیظ جالندھری، شفیع الدین نیّر، غلام ربانی تاباں، محمد حسن، مسلم ضیائی، الیاس مجیبی، اطہر پرویز، ہاجرہ بیگم، محمد امین، دیوندر ستیارتھی، حامد علی خان، صالح عابد حسین اور سید منیر الحسن وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ جو پابندی کے ساتھ پیام تعلیم کے لیے لکھتے رہیے۔

بچوں کے اس رسالے کو بہت سے کامیاب ومعروف ادیبوں ڈاکٹر عابد حسین خان، غلام ربانی تاباں، حامد علی خان، اطہر پرویز، محمد حسین حسان، شاہد علی خان وغیرہ کی ادارت نصیب ہوئی۔ محمد حسین حسان بچوں کے معروف کہانی کار اور ادیب تھے۔ ''دنیا کے بچے'' ''چھوٹا چھو'' اور ننھا پپی'' کے علاوہ انہوں نے ''پیام تعلیم کی کہانی'' کے عنوان سے بھی ایک کہانی لکھی جس میں رسالے کے آغاز وارتقاء کی پوری داستان قلم بند کی گئی ہے۔ یہ رسالہ کئی بار بند ہو کے دوبارہ منظر عام پر آیا۔ پہلی بار ۱۹۴۷ء کے فسادات کی وجہ بند ہوا۔ جب دھیرے دھیرے حالات بہتر ہوئے تو ۱۹۴۹ء میں اس کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی لیکن کچھ سالوں کے بعد پھر سے بند ہوگیا۔ آخر کار غلام ربانی تاباں کی نگرانی میں تیسری بار ''پیام تعلیم'' کا اجراء ہوا اور ایک بار پھر اس رسالے کو اہل علم کی قدردانی اور سرپرستی حاصل ہوئی جن کی بدولت بہت جلد اس رسالے نے اپنا کھویا ہوا وقار واپس حاصل کرلیا۔ الغرض پیام تعلیم نے اردو کے تمام بڑے ادیبوں سے بچوں کے لیے نظمیں، کہانیاں وغیرہ لکھوائے۔ اور ادب اطفال میں بیش قیمت اضافہ کیا۔

جب ادب اطفال کے مفکرینِ شعراء، ادباء اور ماہرِ تعلیم نے اپنی دلچسپی سے ایسی چیزیں تحریر کیں جن

سے ادب اطفال کو عروج حاصل ہوا۔ اور ترجمہ و ترتیب کا کام بھی زور و شور سے شروع ہوا تو بعض ادیبوں نے ترجمہ کر کے ادب اطفال میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ان مترجموں میں قرۃ العین حیدر کا نام سرفہرست ہے اور یہ ادب اطفال کی خوش قسمتی ہے کہ اردو ادب میں بڑے بڑے شعراء و ادباء نے بچوں کے ادب میں خامہ فرسائی کی۔ گیان پیٹھ انعام یافتہ قرۃ العین جیسی ممتاز فکشن نگار بھی حیدر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، انہیں بالغوں کے ادب میں ہمہ گیر شخصیت سے جانا جاتا ہے۔ ناول، افسانے، ڈرامے، خاکے، رپورتاژ، ترجمہ، سفرنامے، صحافت وغیرہ ہر صنف پر طبع آزمائی کی اور ہر میدان میں کامیاب و کامران نظر آتی ہیں۔ البتہ ادبی تخلیقات میں سب سے زیادہ شہرت ناول نگاری میں حاصل ہوئی، مشرقی و مغربی افسانوی ادب پر یکساں عبور حاصل تھا۔ اردو داں طبقہ انہیں ادروکی ورجینا ولف کہتے ہیں۔ آگ کا دریا، آخری شب کے ہمسفر، میرے بھی صنم خانے، کار جہاں دراز، سفینۂ غم دل، پت جھڑ کی آواز، ستاروں سے آگے، ستمبر کا چاند، کوہ دماوند وغیرہ اہم شہ پارے ہیں۔

بچوں کے ادب میں موصوفہ نے ترجمہ نگاری کے ذریعے بلند و بالا مقام حاصل کیا ہے۔ دراصل انہیں ترجمہ نگاری سے بے حد شغف تھا۔ ترجمے کی اہمیت سے واضح ہوتا ہے ایک قوم کے علمی خزانے، تہذیبی، سماجی، ثقافتی، لسانی، تخیلی، فکری وغیرہ پہلوؤں سے ایک زبان اور تہذیب کا دوسری زبانوں اور تہذیبوں سے تعارف ہوتا ہے۔ عینی آپا بھی اس صنف کی اہمیت و افادیت سے مکمل آگاہی رکھتی تھی اسی لیے انہوں نے اپنی قوم کے ننھے قارئین کے لیے اس صنف کو منتخب کیا۔ اور اپنے اہم تراجم سے بچوں کو مستفید کیا۔ مزید برآں سائنسی دنیا سے بھی بچوں کو روشناس کرایا اصل میں عینی آپا کو احساس تھا کہ تخیلاتی، سحر افسوں اور طلسماتی دور کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ آج کا بچہ حقیقت پسندی کے جدید تقاضوں کے تحت زندگی کو دیکھتا اور سمجھتا ہے اب وہ مافوق الفطرت واقعات، بادشاہ وزیر کے قصے، پریوں اور جنات کی کہانیاں سننے کے بجائے روبوٹ جیسی نئی نئی ایجادات اور خلائی معلومات حاصل کرنے والی کہانی کو سننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے آج کا بچہ خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی خلاؤں کی سیر کرنا چاہتا ہے قرۃ العین حیدر کا معروف و مقبولِ عام ناول ''جن حسن عبدالرحمٰن'' بچوں کے سائنسی فکشن کی اولین کڑی ہے۔ اس ناول میں موصوفہ نے اپنے ننھے قارئین کو سیاروں کی فرضی سیر، مافوق الفطرت واقعات اور عجیب و غریب کرداروں کے قائم مقام سائنٹفک انداز میں بچوں کے حیرت و استعجاب کا جذبہ ابھارنے کی مکمل سعی کی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار جو کہ نہایت ذہین، ذی لیاقت اور جدید سائنسی

دورِ ترقی یافتہ اشترا کی ملک کا باسی ہے دوسری طرف جن حطا بچ کا کردار اس ترقی یافتہ سائنسی دور کی نئی اختراعات اور سائنس کی روز افزوں ایجادات کو دیکھ کر متحیر ومبہوت رہ جاتا ہے یہ ناول قدیم کہانیوں اور فوق العادت کرداروں کی بے مثال پیروڈی ہے۔

روس کے معروف فنکار او پیروف سکایا کی بعض کتابیں ہندوستان ترجمے کے لیے آئی تھیں۔اس عظیم کام کا بھیڑا ''پیام تعلیم'' نے اٹھایا یہ کل چھ کتابیں تھیں۔ پیام تعلیم نے ان کتابوں کے ترجمہ کا کام قرۃ العین حیدر کے سپرد کیا۔اورانہوں نے احسن طریقے سے اس جام کو انجام دیا۔اور اردو کے معصوم قارئین کے لیے غیر ملکی زبانوں کی کہانیاں، ناولوں اور معلوماتی مضامین کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھالا کہ ترجمہ کا گمان نہیں گزرتا بلکہ طبع زاد ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔اوران کتب کو بہت شہرت حاصل ہوئی بھیڑے کے بچے ،لومڑی کے بچے ،میاں ڈھینچو کے بچے ، ہرن کے بچے ،شیر خان اور بہادر قابل ذکر ہیں۔قرۃ العین حیدر کو ترجمہ نگاری پر مہارت حاصل تھی انہوں نے ایسا بے ساختہ طرز تحریر اور رواں دوان زبان اور دلکش اسلوب بیان استعمال کیا ہے جو معصوم قارئین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔قرۃ العین حیدر کا کمال یہ ہے کہ ان کہانیوں پر ترجمے اور طبع زاد کی تمیز کرنا ممکن نہیں ہے اسلوب بیان میں غضب کی روانی شیرنی نغمگی ہے جو بچوں کے ذوق سے عین مطابقت رکھتی ہے۔

اطہر پرویز کی تحریریں بچوں کے ادب کے حوالے سے:

۱۹۴۷ء کی ہنگامہ آرائی نے جہاں سماجی ،سیاسی ،معاشی اور ادبی زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کیا وہیں ادب اطفال بھی بری طرح متاثر ہوا۔انحطاط پسندی کے اس ماحول میں ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں ڈاکٹر عابد حسین ،قدسیہ زیدی، شفیع الدین نیّر ،حسین حسان ، پروفیسر محمد حبیب ،کوثر چاند پوری ،اطہر پرویز ،عبدالغفار، ولی اللہ بخش قادری نے ادب اطفال کی نوک پلک سنوارنے میں اہم رول ادا کیا وہیں ان ادیبوں وقلمکاروں نے نئے فنکاروں کے لیے راہ ہموار کی ،ساتھ ہی بچوں کی دلچسپی اور شوق کو مدّنظر رکھتے ہوئے بچوں کے لیے ایسی کتابیں شائع کیں ،ان میں کہانی اور موضوع کے مطابق تصویریں بھی شائع ہوئیں۔ان تصویروں کو اس وقت کے مشہور آرٹسٹوں سے تیار کروایا جاتا تھا اس عمل نے ادب اطفال میں مثبت رول ادا کیا۔اس صدی میں بچوں

کی فلاح و بہبود کے لیے کئی تنظیمیں اور منصوبے بنائے گئے ۔ بچوں کی جانب خصوصی توجہ کرتے ہوئے ، کئی مشہور اداروں نے ان کے لیے رسالے بھی شائع کیے ساتھ ہی اردو ادب کے نامور فنکاروں نے بھی بچوں کے لیے قلم اٹھایا، اور اپنی تخلیقات سے بچوں کے نثری ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسوی صدی میں بچوں کا ادب خوب پھلا پھولا خاص طورر پر نثری شعبہ کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ گر چہ اس سے قبل بھی بچوں کے ادب میں نظمیں اور دیو، جن، بھوت اور پریوں کی بے شمار قصے کہانیاں ملتی ہیں، لیکن تقسیم ہند کے بعد بچوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں ،قصوں کی کتابیں پڑھنے کا رواج خاصا عام ہو گیا تھا اسی لیے بچوں کے ادب میں موضوعات کی سطح پر تنوع سے کام لیا گیا۔ اور سائنس‘ ٹکنالوجی‘ زراعت‘ معاشیات‘ اخلاقیات‘ حب الوطنی اور قومی یکجہتی جیسے موضوعات نے قصے کہانیوں میں جگہ لے لی۔ ادیبوں نے بچوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو شدت سے محسوس کیا اسی لیے ان موضوعات کو نئے نئے انداز میں پیش کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں بچوں کی نفسیات سے مطابقت رکھنے والی ایسی کہانیاں سامنے آئیں جن میں بچے شوخیوں اور شرارتوں سے بھرپور، اپنی اصل زندگی کی طرح کھیلتے کودتے نظر آتے ہیں ۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی ادب اطفال کے لیے ایک خوشگوار صدی ثابت ہوئی ۔ اس دور کو ادب اطفال کا سنہرا دور کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

اس عہد میں بچوں کے ادب میں افسانوی ادب (کہانی، ناول) اور غیر افسانوی ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا غیر افسانوی ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں درسی کتب کے علاوہ سائنس، سماجی، طبی اور ہر طرح کی معلوماتی کتب شامل ہیں ۔ مزید برآں سوانح عمریاں، مکاتیب، سائنٹفک اور عام معلومات پر مبنی کتابیں اسی دائرے کے تحت آتی ہیں۔ دور جدید میں جہاں سائنس کی ترقی آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی اور نئے ایجادات اور انکشافات سامنے آرہے تھے ، علم کی بنیاد پر انسان خلاف عقل باتوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا تو سائنسی معلومات کی کتب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اردو ادب اطفال کے ادیبوں نے سائنس فکشن اور سائنسی معلومات کے مختلف موضوعات پر توجہ صرف کی ۔ جن میں کرشن چندر، عصمت چغتائی ، قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین ، عبدالغفار مدھولی، سراج انور اور اطہر پرویز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ اس عہد زریں میں مہماتی اور سائنسی کہانیوں و کتب کا بول بالا ہوا۔

یوں تو اردو زبان و ادب میں بہت سے فکشن نگار، شاعر، ادیب گزرے ہیں جنھوں نے اردو و ادب کو

ایک خاص مقام واعتبار دینے اوراس کے تعمیری مزاج کی محافظت میں اپنی زندگیوں کا زیادہ عرصہ صرف کیا ہے۔اُن ادیبوں کے صف میں اطہر پرویز کا نام بھی بڑی اہمیت کے حامل ہے۔اطہر پرویز نے اردوادب میں ہمہ جہت زندگی گزاری ہے کیوں کہ آپ کی ذات جہاں کہانی نویس،تنقید نگار،انشائیہ نگار،ترجمہ نگار،ترتیب نگاراور مدیر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں ابھر کر سامنے آئی ہے وہیں اردوادب اطفال میں اپنے فنی کمالات سے مثبت تحریروں،سنجیدہ فکر پاروں اور پرُخلوص سرگرمیوں کے ذریعے بچوں کے ادبی کینوس پر اپنی امتیازی حیثیت قائم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کی ادب دوستی اورادبی خدمات کی مثال دوردور تک کے ادبی حلقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ادب اطفال کی دنیا میں آپ کے تخلیقی کارناموں کا مطالعہ کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے بچوں کی سوچ وفکر کو مدّنظر رکھتے ہوئے ادب اطفال کی دنیا میں متعدد دلچسپ علمی وادبی مضامین اور بہترین معلوماتی وسائنسی موضوعات پر کتابیں تخلیق کی ہیں کیوں کہ آپ کی ذات خود استاد اور شاگرد کے سفر میں مسافر بنی رہی ہے۔آپ کئی سال جامعہ ملیہ میں اورکئی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں درس وتدریس کے ناتھ منسلک رہے جس کی وجہ سے آپ نے نوجوانوں اور بچوں کی نفسیات،دلچسپیوں کو باریک بینی سے پرکھااور سمجھا یہی تجربے آپ کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اطہر پرویز بچوں کے محسن،ہمدرداورغم گسار تھے ان کے نزدیک ملک وقوم کا اصل سرمایہ بچے ہی تھے چوں کہ ملک وقوم کا روشن مستقبل بچوں سے ہی وابستہ ہوتا ہے۔اورادب ہی وہ اہم آلہ ہے جس سے ہم اس عظیم سرمایے کی بہترین تعلیم وتربیت اورصحیح نہج پر نگداشت کر سکتے ہیں۔ان کے نزدیک ادب ایک ایسا عنصر ہے جو بچوں میں بچپن سے ہی شجاعت پسندی،جراعت مندی،منصفانہ سلوک اور مجاہدانہ زندگی گزارنا سکھاتا ہے تاکہ بچے اپنے آنے والے مستقبل کے چیلنجوں کا ڈہٹ کر مقابلہ کرسکیں۔انہوں نے سائنٹفک طریقہ کار اپناتے ہوئے بچوں کے ذہنی نشوونما کے لیے دلکش اسلوب اور سادہ وسلیس زبان میں کتابیں تخلیق کی ہیں۔

اطہر پرویز نے اپنی تحریروں کے ذریعے بچوں کواعتمادنفس،ہوشیاری،سلیقہ شعاری،حق وباطل میں فرق کرنا،اخلاقیات٬انسانی مساوات اور مذہبی رواداری کا درس دیتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ادب بچوں میں جہالت،غفلت اورتوہم پرستی سے دور رکھ کران میں مستقل مزاجی اورقوت عمل پیدا کرتا ہے ساتھ ہی ماضی اور حال کے احوال سے واقف کرواتے ہوئے مستقبل کا عکس دکھاتا ہے جیسا کہ انہوں نے اپنی معروف تصنیف

''ادب کسے کہتے ہیں''میں اپنے خیال کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کو بہترین لفظوں میں، بہترین ترتیب کے ساتھ محفوظ کر لیتا ہے۔اس میں سچ پوچھیے تو اپنے زمانے کے نہ صرف بہترین خیالات، الفاظ، اور ترتیب ہوتی ہے بلکہ اس میں اپنے زمانے کی سچی روح ہوتی ہے'' [۱]

انہوں نے بچوں کے لیے بعض کہانیاں لکھی، بعض دوسری زبانوں کے ادیبوں سے ماخوذ کیں اور بعض کہانیوں کا ترجمہ پیش کیا، علاوہ ازیں بچوں کے لیے علمی، ادبی، اخلاقی اور معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے اردو کے ننھے قارئین کو دستوری و رسمی قصے کہانیوں سے آزاد کر کے ایک نئے طرز بیان سے متعارف کیا اس کے علاوہ جدید موضوعات پر غیر ملکی زبانوں سے ماخوذ کہانیاں کا ترجمہ کر کے ادب اطفال کو عروج بخشا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے معلم تھے اس کے علاوہ ماہر سیاستداں بھی تھے۔تمام تر مصروفیات کے باوجود ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ ادب اطفال کی خدمات میں صرف ہوا جس میں ان کی بہترین عقلی وفکری استعداد کا اظہار ملتا ہے۔

ادب اطفال سے شغف کے علاوہ ان کی ذمہ داریوں نے بھی انھیں بچوں کے لیے مسلسل لکھتے رہنے پر مجبور کیا کیوں کہ ''پیام تعلیم'' جیسے بچوں کے مقبول رسالے کے جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی زیر سرپرستی کام کرنے والا' مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ کی نگرانی میں شائع ہونے والا بچوں کا مقبول رسالے کے ایڈیٹر اور منیجر دونوں کے عہدوں پر فائز کیے گئے اور ۱۹۹۵۰ء سے ۱۹۹۵۶ء تک کے طویل عرصے تک انہوں نے اس رسالے کی ادارت کی۔اور بڑی ہی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور باقاعدگی سے اپنے رسالے کے لیے کہانیاں اور علمی، ادبی، اخلاقی، معلوماتی مضامین لکھتے رہے جنہیں لوگ شوق سے پڑھا کرتے تھے انہوں نے ''پیام تعلیم'' کو معیاری بنانے اور سنوارنے کے ساتھ بچوں کے ادب کی ترقی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے خود بھی بچوں کے لیے لکھا اور دوسرے ادیبوں کو بھی ''پیام تعلیم'' کے لیے لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کا مطمع نظر یہ تھا کہ ''پیام تعلیم'' میں بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلیس سادہ اور عام فہم طرز بیان میں

---

[۱] اطہر پرویز، ادب کسے کہتے ہیں، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، سن اشاعت ۱۹۷۶ء، ص:۱۳

دلچسپ، فرحت بخش اور شگفتگی سے لبریز کہانیاں و مضامین اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کی جائیں کہ بچے بے اختیار انہیں پڑھنے پر مجبور ہو جائیں اور ان میں کم سنی ہی سے مطالعے کی عادت پختہ ہو جائے وہ مستقبل میں درسی و معلوماتی کتب پڑھنے کے لیے اپنے ذہن کو وہ بہ آسانی ہموار کر سکیں۔ بچوں کے ادب پر انہیں مکمل دست رس حاصل تھی۔ نیز دور جدید میں سائنٹفک اسلوب بیان کے طرز پر بچوں کے ذہنی نشو و نما کے حوالے سے دلکش اسلوب بیان اور آسان زبان میں کتابیں تخلیق کرنے میں وہ بہت مہارت رکھتے تھے۔ اطہر پرویز پیشے سے معلم تھے اسی لیے بچوں کے نبض شناس بھی تھے جب کوئی کہانی لکھتے تو پہلے اپنی چھوٹی بیٹی کو پڑھاتے پھر دیکھتے کہانی کے مطالعے سے بچی پر کیا تغیّر ہوتا ہے اس کے بعد اپنی تحریر شائع کرواتے۔ موصوف کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب اطفال کو روایتی قصے کہانیوں سے ہٹ کر ایک نئے سائنٹفک اسلوب بیان سے اردو داں بچوں کو روشناس کیا ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''پیام تعلیم'' نے ان کے انتقال پر ۱۹۸۴ء میں اطہر پرویز نمبر شائع کیا تھا۔

اطہر پرویز ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ (لیکن اس کے باوجود) وہ کہانی نویس، مترجم نگار، ڈرامہ نگار، معلم اور ماہر سیاستداں بھی تھے تمام تر مصروفیت کے باوجود ان کی زندگی کا قابل قدر گوشہ ادب اطفال کی خدمت میں گزرا ہے جس میں ان کی بہترین عقلی و فکری استعداد کا اظہار ملتا ہے۔ موصوف نے شروع سے ہی تقریباً نوع بہ نوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی تحریروں اور کہانیوں میں دنیا کو بچوں کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور چیزوں کو بھی ان کے ہی زاویے سے سمجھنا چاہتے تھے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ جدید دور کے تقاضے کے مطابق بچوں میں سائنسی و معلوماتی افکار و اذہان کی نشو و نما پیدا کرنا چاہتے تھے چوں کہ بچے جب اپنے گرد و نواح کے منظر نامے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ تو اکثر یہ سوال کرتے ہیں یہ کیا؟ کیسے؟ اور کیوں ہو سکتا ہے۔ بچوں کے پر تجسس ذہن کے لیے اور خصوصاً ان کے سوالوں کا صحیح جوابات اخذ کرنے کے حوالے سے اپنی تخلیقات کے ذریعے معلومات کا بہترین مواد پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جہاں ''پیام تعلیم'' کے لیے اہم کہانیاں لکھی ہیں وہیں انہوں نے اخلاقی، ادبی، سائنسی اور معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جو ''پیام تعلیم'' کے مختلف شماروں میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہے ہیں مثلاً ''انڈونیشیا کی کچھ رسمیں''، جولائی ۱۹۵۱ء ''ہنگری کے بچے'' اگست ۱۹۵۲ء ''ہندوستانی

ریلوں کی کہانی'' جون ۱۹۵۳ء ''کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو'' جولائی ۱۹۵۳ء ''تبّت کے رسم و رواج'' مارچ ۱۹۵۱ء ''اقوام متحدہ'' نومبر ۱۹۵۴ء ''ننّھے منے پودے'' جون ۱۹۵۵ء ''کابل'' نومبر ۱۹۵۳ء ''فاہیان کا سفر'' اپریل ۱۹۵۴ء ''چائے'' مئی ۱۹۵۴ء مندرجہ بالا مضامین مفید معلومات کا بہترین خزانہ ہیں۔

اطہر پرویز نے ادب اطفال کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہ بنا کر اس کو کارآمد بنانے کی بہترین کوشش کی ہے ان کی تحریریں اس جدوجہد سے پُر نظر آتی ہیں۔ ان کی خاصیت یہ تھی بچوں کی نفسیات پر ان کا گہرا مطالعہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں اور باقی تخلیقات چاہے طبع زاد ہوں یا ماخوذ وہ بچوں کی نفسیات دماغی قوہ اور ذہنی استعداد کے عین مطابق رقم کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کے معروف رسالے ''پیام تعلیم'' میں وقتاً فوقتاً نشر ہوتی رہی ہیں۔ ''ہمدردی'' فروری ۱۹۱۵ء ''خوبوں کی حقیقت'' ستمبر ۱۹۵۲ء ''مرغی چور'' جنوری ۱۹۵۲ء ''ایک تھے نجومی'' جنوری ۱۹۵۲ء ''جیسے کو تیسا'' جنوری ۱۹۵۲ء ''ایماندار لکڑ ہارا'' اپریل ۱۹۵۲ء ''خالہ بلی'' ستمبر ۱۹۵۲ء ''دو دوست'' اکتوبر ۱۹۵۲ء ''بھید کی بات'' جنوری ۱۹۵۲ء ''نیکی اور سچائی'' اپریل ۱۹۵۳ء ''کیا خوب آدمی تھے شیخ چلی'' جون ۱۹۵۳ء ''چالاک شہزادہ'' ستمبر ۱۹۵۳ء ''چینی تھیٹر'' سالنامہ ۱۹۵۶ء مذکورہ کہانیاں مختلف موضوعات پر اطہر پرویز کی قابل ذکر طبع زاد شاہکار ہیں۔)

اطہر پرویز کی سائنسی طرز کی تحریریں:

یوں تو اطہر پرویز نے گوناگوں موضوعات پر کہانیاں، مضامین اور کتابیں تحریر کی لیکن ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ تمام سکولوں خاص طور پر اردو میڈیم میں سائنسی فکر و شعور کو بیدار کیا جائے تا کہ لوگ شعر و ادب اور زبان پر مبنی کتابوں کے ساتھ ساتھ سائنس، علم طب، علم نجوم اور سماجی علوم کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی اپنی ماردی زبان میں کر سکیں اور بیش قیمت استفادہ حاصل کریں۔ بچوں اور سائنس میں مماثلت تجسس ہے سائنسی نقطۂ نظر کسی اصول کو اسی شکل میں قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے پس پشت ان وجوہات کو جاننے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ واقعات رونما ہوئے ہیں ٹھیک اس طرح بچے بھی جب اپنے گرد و نواح کے مناظر کو دیکھتے ہیں تو کیا؟ کیسے؟ کیوں؟ جیسے سوالات ان کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ جب تک صحیح جواب معلوم نہ کر لیں وہ بے چین رہتے ہیں سائنسی علم ہی بچوں کو صحیح جواب دے کر ان کی بے چینی کو دور کرتا

ہے ۔اور انہیں توہم پرستی کا شکار ہونے سے بچاتا ہے لہذا ضروری ہے کہ بچوں میں سائنسی فکر وشعور پیدا کیا جائے ۔اور انہیں معلوماتی کتب بھی مہیا کی جائیں لیکن اردو ادب اطفال میں معلوماتی اور سائنسی موضوعات کے حوالے سے کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ انھیں اس کمی کا شدت سے احساس تھا۔ انہوں نے اپنی معروف کتاب ''بچوں کی معلومات'' میں اس بات کا شکوہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ہماری زبان میں معلومات اور سائنس کی کتابوں پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ بچوں کے لیے قصے کہانیوں کی کتابیں تو کافی تعداد میں مل جاتی ہیں لیکن ایسی کتابیں جس سے بچوں کی معلومات میں اضافہ ہو بہت کم پائی جاتی ہیں ۔تعلیم کا مقصد لکھنا پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ انسان کو زندہ رہنے کے آداب بھی سکھانا ہے ۔ ہمارے ملک میں توہم پرستی عام ہے ۔اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اول تو تعلیم ہی بہت تھوڑی ہے اور جو لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے ہیں وہ بھی اپنی تعلیم کو صرف زبان جاننے تک محدود رکھتے ہیں ۔اسی لیے ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اس بات کا خیال رکھا جائے کی زبان سکھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو دنیا کے بارے میں بھی کچھ بتایا جائے ۔'' [۱]

اطہر پرویز نے اردو بچوں میں سائنسی رجحان کو پیدا کرنے کے غرض سے اردو ادب اطفال میں سائنس کے مختلف النوع موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہیں اس ضمن میں انہوں نے نجوی آپا ، پودوں اور جانوروں کی دنیا، توانائی کا راز، ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے، گلیلی گلیلیو ،خلا کا سفر، مصنوعی چاند، چارلیس ڈارون اور بچوں کی معلومات جیسی گراں قدر تصنیفات سرانجام دیں ہیں جو نا قابل فراموش معلوماتی خزانہ ہیں ۔ جسے اردو ادب اطفال میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا ۔ یہ کتابیں نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ نوجوانوں کی معلوماتی اضافے کے لیے بھی اہم ذریعہ ہیں انہیں مذکورہ بالا تمام تر تصنیفات پر تعلیمات حکومت ہند کی طرف سے انعامات سے نوازا گیا ہے ۔

---

[۱] اطہر پرویز، بچوں کی معلومات، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵، ۲۰۰۱، ص: ۴

اطہر پرویز کا ماننا تھا کہ ابتدائی ایام سے ہی بچوں میں سائنس اور معلومات کی ایسی کتابیں فراہم کی جانی چاہیے جن میں موضوع کے مطابق تصویروں کے ذریعے ان کے اندر معلومات اور اشتیاق و میلان طبع پیدا کیا جائے دراصل ایسے سائنسی و معلوماتی مضامین اور کتب بچوں کے اندر تعجب و حیرت ،تجسس و جستجو، تلاش و تفتیش پیدا کرتے ہوئے بچوں کے ذہن میں کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کہاں جیسے سوالات پیدا کرتے ہیں جو کہ بچوں کی فطرت کا خاصہ ہے ویسے بھی بچوں کا ذہن عمر کے اس مرحلے میں کورے کاغذ کے مانند ہوتا ہے، لحاظہ جو بھی انہیں اس عمر میں پڑھایا جائے وہ سیاہی کی طرح ان کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے وہ ان کے ذہن میں از بر ہو جاتا ہے۔اسی لیے ادیبوں کو سائنسی موضوعات کو سادہ اور سلیس زبان، خوش طبع و موثر انداز، بذلہ سنج ،چھوٹے چھوٹے نفیس جملے، نئی اور نو بنوع معلومات ،مشکل الفاظ کا کم استعمال اور دلچسپ مکالماتی انداز میں مواد پیش کیا جائے تا کہ بچوں اسے شوق سے پڑھیں اور ان تک صحیح طریقے سے سائنسی معلومات کی رسائی ہو سکے۔اسی لیے موصوف نے سائنس کے مختلف النوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

علم نجوم اجرام و نقاط فلکی بشمول کواکب کی بروج اور بیوت میں حالت و حرکات کا مطالعہ اور ان سے پیش گوئی کے لیے ممکنہ نتائج کا استخراج علم نجوم کہلاتا ہے۔علم نجوم کا تعلق تاریخ انسانی کے قدیم ترین علوم سے ہے ۔یہ علم صدیوں تک علم طب ،علم ہیت ،ریاضی اور فلسفے کا لازم جز رہا ہے۔اور دنیا کے حکیم ،شاعر، سائنسداں اور جید فلاسفر اس کے طالب علم رہے ہیں۔لہذا بچوں کو اس علم سے آگاہ کرنا چاہیے تا کہ بڑے ہو کر ان کا شمار بھی دنیا کی عظیم ہستیوں میں کیا جائے ’’نجومی آپا‘‘،علم نجوم (Astrology) پر مبنی اہم معلوماتی انعام یافتہ کتاب ہے جو ادب اطفال میں اہم شہرت کے حامل رہی ہے۔۵۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مارچ ۱۹۵۷ء کو اردو گھر علی گڑھ سے شائع ہوئی اس کتاب کے کم و بیش دس سے زائد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں جو اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

علم نجوم ایک مشکل ،خشک اور سپاٹ موضوع ہے چھوٹے تو چھوٹے بڑے بھی اسے خال خال ہی پڑھتے ہیں، لیکن اطہر پرویز کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مشکل سے مشکل موضوع کو بھی اپنے منفرد انداز بیان سے دلچسپ اور شیریں بناتے ہیں۔مکالماتی انداز بیان کو اس خوبصورتی سے آگے بڑھایا ہے کہ کوئی بھی دلچسپی کا پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس کتاب کی اہم بات یہ ہے کہ موصوف نے کتاب کے موضوع اور

کرداروں کے ناموں میں مناسبت اختیار کی ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے اسی لیے بچوں کے ذوق کے مطابق انہوں نے کتاب میں جگہ جگہ موضوع کتاب کی نسبت سے تصاویروں کا استعمال کیا ہے جس سے کتاب کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔اور بچے بھی تصویروں سے سجی کتاب کا مطالعہ زیادہ شوق سے کرتے ہیں۔کتاب کے شروع میں امریکہ کی رصدگاہ کی تصویر دکھائی ہے جس میں چالیس انچ کی دربین نصب کی گئی ہے دربین علم نجوم کا اہم آلہ ہے اسی لیے انہوں نے شروع میں ہی بچوں کو اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ وہ اس نے کتاب میں زمین کے ساتھ ساتھ بقیہ آٹھ سیاروں کے بارے میں بھی تفصیل سے معلومات پیش کی گئی ہے۔زمین سورج کے گرد کتنی مدت میں گردش کرتی ہے دوسرے سیاروں کے نام وغیرہ کے بارے میں معلومات دی ہے۔سورج کی زمین سے دوری،سورج کی روشنی کتنی مدت میں زمین تک پہنچتی ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح اپنی تحریر کو دلکش بناتے ہیں:

انجم آپا! کیا تمہیں معلوم ہے کہ جیسے ہماری زمین ہے ایسی زمین کہیں اور بھی ہے۔

نجومی آپا انجم بی بی! ہماری زمین ایک سیارہ ہے اور اس طرح کے آٹھ سیّارہ اور بھی ہیں جو سورج کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔

خالد ان کے کیا نام ہیں؟۔۔۔۔۔۔۔

انجم آپا اچھا تو سنو! ان کے نام ہیں۔عطارد،مریخ،زحل،زہرہ،مشتری،یورینس،نیچون،پلوٹو اور ہماری زمین۔یہ کل ملا کر نو سیّارے ہوئے۔

صفحہ نمبر ۱۳ پر ایک تصویر میں سورج اور بقیہ سیاروں کے نام مع قد وقامت دکھائے گئے ہیں تاکہ بچوں کو بہ آسانی ان سیاروں کے نام،سیّاروں کی بناوٹ،سورج اور ان سیّاروں کے مابین دوری کا علم حاصل ہو اور ساتھ ہی بچوں کو سیاروں اور ستاروں کے مابین فرق کو بھی بہت ہی آسان زبان میں موثر انداز بیان کے ساتھ سمجھایا ہے مثلاً:

''خالد ستاروں اور سیّاروں میں کیا فرق ہے؟

نجومی آپا بھیّا! ابھی تو بتایا تھا کہ ستارے کسی کے گرد نہیں گھومتے اور

سیّارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ ستارے بھٹی کی طرح دہکتے ہیں اور روشن ہوتے ہیں لیکن سیّارے ٹھنڈے ہوتے ہیں اور ان کی اپنی روشنی نہیں ہوتی۔'' ۱؎

اس کتاب میں دیگر سیّاروں کے فوائد بتاتے ہوئے بچوں کو یہ بھی باور کروایا گیا ہے کہ زمین سب سے اہم اور آباد سیّارہ ہے اور جس طرح ہم زمین پہ سانس لے سکتے ہیں ویسے کسی اور سیّارے پر ممکن نہیں پہلے یہ تصوّر عام تھا کہ زمین چپٹی ہے لیکن بعد میں جب سائنس نے ترقی کی تو معلوم ہوا کہ زمین گول ہے گیند کے مانند گول اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے زمین کی طرح باقی آٹھ سیّارے بھی سورج کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں اور سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ صفحہ نمبر ۲۹ پر زمین اور باقی سیّاروں سے سورج کی دوری کو دکھایا گیا ہے زمین کے علاوہ دوسرے سیّاورں سے ایک سے زائد چاند نظر آتے ہیں اس کے بارے میں بھی معلومات دی ہے مثال کے طور پر کہ:

''خالد ان سیّاروں میں سے بھی چاند نظر آتا ہوگا۔

نجومی آپا ہمارا چاند وہاں نظر نہیں آتا۔ یہ تو ان سیّاروں سے بہت دور ہے۔ مریخ سے دو چاند نظر آتے ہیں۔ عطارد سے گیارہ چاند نظر آتے ہیں۔ زحل سے نو چاند نظر آتے ہیں یورنیس سے پانچ چاند دکھائی دیتے ہیں بس مشتری، زہرہ، اور پلوٹو ایسے سیّارے ہیں جن کا اپنا کوئی چاند نہیں ہے'' ۲؎

چاند سے واقفیت کے بعد موصوف نے بچوں کو آسمان کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کرایا گیا ہے اور ہوا کے فوائد کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔

''خالد آپا چاند کے بارے میں تو خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا۔ اب ذرا یہ بتاؤ کہ آسمان ہماری زمین سے کتنے فاصلے پر ہے۔

۱؎ اطہر پرویز، نجومی آپا، اردو گھر علی گڑھ ۱۹۹۲ء، ص: ۱۳ تا ۱۴

۲؎ اطہر پرویز، نجومی آپا، اردو گھر علی گڑھ ۱۹۹۲ء، ص: ۳۰ تا ۳۱

''نجومی آپا آسمان دراصل کوئی چیز نہیں ہے.......یہ جو نیلا نیلا آسمان نظر آتا ہے۔ یہ کچھ بھی تو نہیں بس ہوا کا رنگ ہے.......اگر تم اس ہوا کے اوپر جاؤ تو ہر طرف سیاہی نظر آئے گی۔ یہ جو نیلا آسمان نظر آتا ہے یہ بل کالا دکھائی دے گا۔ بس سورج اور دوسرے ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہوا کا کمال یہ ہے کہ وہ سورج کی روشنی کو ہر طرف بکھیر دیتی ہے۔ اگر ہوا نہ ہو تو یہ روشنی ایک ہی جگہ نظر آئے۔'' [1]

صفحہ ۳۷ پر اطہر پرویز نے یورپ کے مشہور سائنسداں گلیلیو سے بچوں کو متعارف کیا ہے اور اس کی بنائی ہوئی دربین کی تصویر بھی دی گئی ہے دربین کی اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے راقم طراز ہیں:

''خالد لیکن آپا لوگوں کو چاند اور سورج کی باتیں کس طرح معلوم ہوئیں۔
نجومی آپا بھئی سائنس برابر ترقی کرتی رہی ہے تم نے گلیلیو کا نام تو سنا ہوگا۔
گلیلیو یورپ کا مشہور سائنس داں گزرا ہے۔ جواب سے ساڑھے تین سو سال پہلے اٹلی کے ایک شہر میں رہتا تھا۔ اُس نے دربین کی ایجاد سے انسان کی معلومات کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ آدمی گھر بیٹھے ستاروں کی دنیا کا حال جانتا ہے۔ اور اب تو بڑی طاقتور دربینیں بن گئی ہیں اگر تم ان دربینیوں سے دیکھو تو تم کو چاند پر پہاڑ نظر آئیں گے۔ تم نے اخباروں اور کتابوں میں چاند کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ چاند کی یہ شکل دربین سے نظر آتی ہے۔'' [2]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ وہ بچوں کو سائنس کی نئی اختراع کے بارے میں نیز کس طرح سائنس نے ترقی کی اور دوربین ایجاد کی جس سے ہم میلوں دور چیز کا مشاہدہ گھر بیٹھے کر سکتے ہیں اور ہم سے لاکھوں میل دوران چھوٹے چھوٹے تاروں کو بھی آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

---

[1] اطہر پرویز، نجومی آپا، اردو علی گھر، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص: ۳۳ تا ۳۴

[2] اطہر پرویز، نجومی آپا، اردو علی گھر، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص: ۳۶، تا ۳۷ تا ۳۸

زیرنظر مسودے کے آخری حصے میں انہوں نے روس اور امریکہ کے ان سائنس دانوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے بہت محنت ومشقت کر کے مصنوعی چاند بنا کر راکٹ کے ذریعے اصلی چاند تک بھیجا تاکہ وہ خلا کے کے بارے میں معلومات حاصل سکے مصنوعی چاند بھی اصلی چاند کے مانند زمین کے چاروں اطراف میں چکر لگانا میں کامیاب ہوا۔اس کامیابی کے بعد روس اور امریکہ کے سائنس دانوں نے ایک کے بعد دیگر کئی مصنوعی چاند اڑائے اور کامیاب بھی ہوئے۔اس طرح بچوں کو سائنس دانوں کے کارناموں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہے جس کو پڑھ کر بچے مستفید ہوں اور ان کے کارناموں سے متاثر ہو کر وہ بھی بڑے بڑے کام انجام دینے کا عزم کریں گئے۔

کتاب ’’جانوروں اور پودوں کی دنیا‘‘ سائنس کے اہم موضوع بائیلوجی (حیاتیات) پرمبنی ایک شہرت یافتہ کتاب ہے اس کی شہرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ حکومت تعلیمات ہند کی طرف سے مصنف کو انعام بھی دیا گیا تھا۔۵۸صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں ترقی اردو بورڈ دہلی نے شائع کی۔یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے اس سے پہلے اس موضوع پر اردو ادب اطفال میں نہیں لکھا گیا۔ نیز دور جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اطہر پرویز نے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا کہ اردو پڑھنے والے بچوں کو مختلف علوم وفنون کی کتابیں مہیا کی جائے جن کو پڑھ کر ان کے علم میں اضافہ ہو،تاکہ وہ آنے والی زندگی کے ہر امتحان کے لیے کمر بستہ رہے اور حوادثاتِ زمانہ کا ڈٹ کر سامنا کرسکیں۔یہی وجہ ہے کہ جہاں انہوں نے اردو داں بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں اور رنگین مضامین لکھے وہیں انہوں علوم سائنس کے بہت سے مشکل موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے اور اپنے قلم سے ان موضوعات کو دلچسپ بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مذکورہ کتاب بھی ایسی ہی ایک کوشش کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے بچوں کو علم حیاتیات سے بہت ہی دلکش اسلوب اور آسان زبان میں روشناس کرایا ہے۔

علم بیائلوجی وہ علم سائنس ہے جو دو مختلف شعبوں یعنی علم نباتات (Botany) اور علم حیوانات (zoology) پرمبنی ہے۔علم نباتات وہ علم ہے جس میں پیڑ پودوں کے متعلق علم حاصل کیا جاتا ہے اور علم حیوانات وہ علم ہے جس میں کیڑے مکوڑوں اور جانورں سے متعلق جانکاری حاصل کی جاتی ہے اور ان دونوں کو علم حیاتیات (biology) کہتے

ہیں۔ بیالوجی (حیاتیات) وہ علم ہے جو تمام جانداروں کی زندگی کی نشوونما کے متعلق باتوں کو واضح کرتا ہے۔ کتاب ''جانورں اور پودوں کی دنیا'' میں اطہر پرویز نے بچوں کو علم حیاتیات سے عام فہم اور دلچسپ انداز میں روشناس کرایا ہے اطہر پرویز نے ''جانوروں اور پودوں کی دنیا'' کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ علم نباتات اور علم حیوانات کتاب کے شروع میں موصوف نے علم حیاتیات کا مختصر سا تعارف کرواتے ہوئے بچوں کو جاندار (Living things) اور بے جان (non living things) چیزوں کے درمیان فرق، زندگی کیا ہے، دنیا میں زندگی کی نشوونما کس طرح ہوئی ہے، کس طرح سے ایک جاندار کے وجود سے دوسرے جاندار وجود میں آتے ہیں یعنی سیل کے متعلق معلومات، ہر جاندار کی غذا اور ابتدائی زندگی کے متعلق سائنس دانوں کی کیا رائے رہی ہے ان کے بارے میں مختصراً بتایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہماری زمین پر زندگی بڑے سادہ طریقے سے شروع ہوئی زندگی کی سب سے پہلی نشانی پانی پر ظاہر ہوئی۔ ان میں سے کچھ پودے تھے اور کچھ جانور پھر ان میں سے کچھ نے زمین پر قدم رکھا اور ان کی نشوونما شروع ہوئی۔ پودوں اور جانوروں کی بتدریج نشوونما اصل میں ایک ارتقائی عمل ہے۔''[۱]

صفحہ نمبر ۷ پر اطہر پرویز نے جاندار چیزوں کی خصوصیات کے متعلق معلومات دی ہے:

۱۔ تمام زندہ چیزیں چاہے وہ پودے ہوں یا جانور

۲۔ غذا لیتے ہیں اور بڑھتے ہیں۔

۳۔ وہ سانس لیتے ہیں۔

۴۔ وہ سب سیل سے بنتے ہیں سیل کو خانہ یا خلیہ بھی کہتے ہیں.... بعض زندہ چیزیں ایک ہی سیل کی ہوتی ہیں لیکن زیادہ تر ایک سے زیادہ سیل کی ہوتی ہیں۔

۵۔ وہ سب اپنی جیسی جاندار چیزیں پیدا کر سکتے ہیں۔

۱۔ اطہر پرویز، جانوروں اور پودوں کی دنیا، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص:۶

۶۔ جو ایک سیل کے ہوتے ہیں وہ ایک سے دو اور دو سے چار اور چار سے آٹھ ہو جاتے ہیں اور اسی طرح سے بڑھتے ہیں۔ [1]

ہر جاندار کے اندر توانائی (Energy) قدرتی طور موجود ہوتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت وہ اپنے آپ کو بڑا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر جاندار کو پانی، ہوا اور غذا کی اشد ضرورت ہوتی ہے ان تینوں عناصر کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ پودے اپنی غذا ہوا، پانی اور دھوپ سے حاصل کرتے ہیں۔ جانور اور انسان کھانے کے ذریعے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ سادہ زبان میں بچوں کو ان چیزوں کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں ہیں جن کے استعمال سے انسان اور جانور توانائی حاصل کر سکتے ہیں۔

کتاب کے پہلے حصے یعنی علم بناتات میں اطہر پرویز نے بچوں کو پیڑ پودوں کی مختلف اقسام کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے پودے کس طرح نشو ونما پاتے ہیں، پودے غذا کس طرح حاصل کرتے ہیں، پودے سانس کس طرح لیتے ہیں، بکٹیریا کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں بہت تفصیل سے سادہ زبان میں بچوں کو سمجھایا ہے۔ بکٹیریا یہ پودوں کی ایک ایسی قسم ہوتی ہے جو بظاہر تو نظر نہیں آتے بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ انہیں خوردبین سے ہی دیکھا جاسکتا ہے یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے اور دوسرے وہ جو انسان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کیوں کہ ان سے مہلک بیماریاں پھیلتی ہیں ان سے کس طرح بچا جائے اور یہ کن کن چیزوں میں اور کن جگہوں پر پائے جاتے ہیں اس کے متعلق بچوں کو بھر پور معلومات دی گئی مصنف لکھتے ہیں:

> ”جو بیکٹیریا نقصان پہچاتے ہیں ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ہوا، مٹی اور پانی میں ہوتے ہیں اور بڑی مشکل سے مرتے ہیں یہ بیکٹیریا اندھیری اور گیلی سیلی جگہوں میں زیادہ پنپتے ہیں۔ اس لیے مکان ایسے بنانے چاہیں جن میں خوب روشنی اور ہوا آسکے بیکیٹر یا دھوپ اور روشنی پسند نہیں کرتے۔ اگر کہیں کوڑا کرکٹ ہو، گڑھا ہو، جس میں پانی کا نالہ ہو تو گویا بیکٹیریا کی بن آئی۔ بیکٹیریا سے بچنے کے لیے گھر

---

[1] اطہر پرویز، جانوروں اور پودوں کی دنیا، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص: ۳۵

میں ہمیشہ صفائی کرتے رہنا چاہیے۔ بیکٹیریا سے اپنے جسم کو بچانے کا
بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہمیشہ ناک سے سانس لینے کی عادت ڈالنا چاہیے۔
ناک کا رواں محافظ کا کام کرتا ہے اور بیکٹیریا اس میں پھنس جاتے ہیں
اور اپنے چھینک کے ذریعے نکل جاتے ہیں۔ اگر کبھی جسم کے کسی حصے
میں چوٹ لگ جائے تو پھر اس جگہ دوا لگا کر پٹی باندھ لینا چاہیے۔ ورنہ
پھر زخم کے ذریعہ بیکٹیریا جسم میں داخل ہو جائیں گے۔ جب کبھی کھانے
کی کوئی چیز خریدیں تو اُسے دھو لینا چاہیے جیسے ترکاری اور پھل وغیرہ کھلی
ہوئی مٹھائی نہ کھانا چاہیے۔'' [۱]

انسانی شعبہ حیات میں پیڑ پودوں کی بہت اہمیت ہے کیوں کہ پیڑ پودوں سے انسان براہ راست اور بالواسطہ طور پر توانائی حاصل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پودوں سے ہمیں صاف و تازہ ہوا میسّر ہوتی ہے طرح طرح کے پھل، پھول اور سبزیاں بھی ان ہی کے ذریعے سے حاصل کی جاتی ہیں مزید یہ کہ بہت سے پیڑ پودے ایسے بھی ہیں جن سے مختلف قسم کی دوائیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ پودے دوسرے جانداروں کے بامقابل اپنی غذا خود تیار کرتے ہیں۔ اور کچھ پیڑ پودے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کیڑے مکوڑوں کو کھاتے ہیں جیسے پچر پلانٹ (picher plant) وینس فلائی ٹریپ (venus flytrap) سن ڈیو پلانٹ (sundew plant) وغیرہ کی تمام تر تفصیلات دی گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں انہوں نے علم حیوانات سے بچوں کو واقف کرواتے ہوئے مختلف النوع جانورں کے بارے میں بتایا ہے عمومی طور پر ریڈ کی ہڈی والے جانور اور بغیر ریڈ کی ہڈی والے جانور پائے جاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے جس طرح سے ان جانوروں کی ان دونوں قسموں کو بتایا ہے اس کے متعلق بہت ہی عمدہ طریقے سے معلومات دی گئی ہے۔ ہمارا ملک مختلف قسم کے جانوروں کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے تعداد کے لحاظ سے افریقہ کے بعد سب سے زیادہ جانور ہندوستان میں ہی پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ایک طرف علم حیاتیات کے عمل سے بچوں کو واقفیت حاصل ہوتی ہے وہیں دوسری جانب

---

[۱] اطہر پرویز، جانوروں اور پودوں کی دنیا، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص: ۲۷ تا ۲۸

جانوروں اور پیڑ پودوں کی مختلف اقسام کے بارے میں بھی علم حاصل ہوتا ہے لہذا یہ کتاب دوہری اہمیت کے حامل ہے۔

اطہر پرویز نے ہمیشہ بچوں میں سائنسی صلاحیتوں اور کھوج کرنے والے ذہن کے لیے لکھتے ہوئے کھولنے کی کوشش کی ہے اس میں چاہے ان بچوں کے لیے کہانیاں ہوں یا معلوماتی مضامین کا ذخیرہ ہو۔آپ اس نقطے سے بخوبی واقف تھے یہ بچے ہی ہمارا کل کا مستقبل ہیں ان ہی کے ہاتھوں ملک کی بھاگ دوڑ ہوگی۔ اس تناظر میں انہوں نے ہمیشہ بچوں کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق لکھا ان کی تحریروں میں معلوماتی فکر پاروں کو اولیت بخشی۔آپ نے بچوں کو سائنسی و معلوماتی اور فکری تحریروں میں اس انداز سے معلومات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جہاں ایک طرف ان کی معلومات میں اضافہ ہو وہیں دوسری طرف ان کا ذہن محنت ومشقت کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں ہارنے کے بعد بھی ہمیشہ کامیابی کا جنوں طاری رہے اسی نقطہ نظر کو مدّنظر رکھتے ہوئے موصوف نے بچوں میں ہمت واستقلال کی عمارت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ایسا ہی تخلیقی تحفہ کتاب ''ایورسٹ کی فتح'' کی صورت میں اردو ادب اطفال کو عطا کیا ہے۔جس کے مطالعہ سے بچوں میں معلوماتی ذخیرہ اچھا خاصہ جمع ہوسکتا ہے اور ان کا ذہن وفکر ہمیشہ محنت ولگن کی طرف مائل رہے گا۔ ''ایورسٹ کی فتح''صرف بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ نوجوانوں کے لیے بھی معلومات کے ساتھ ساتھ احساس برتری پیدا کر کے کامیابوں کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں اہم ثابت ہوسکتی ہے۔

''ایورسٹ کی فتح''میں مصنف نے ایورسٹ پہاڑ کی پوری داستان کو الگ الگ اسباق کے ذریعے اس طرح متعارف کراوایا ہے کہ ایورسٹ کی کہانی (انسانی عزم واستقلال کی داستان)،ایورسٹ کی مختصر تاریخ، ایورسٹ کے مسائل، چڑھائی ابتدائی تیاریاں اور ضروریات، پچھلی دس مہموں کا جائزہ، ۱۹۵۳ء کی مہم کے ممبران اُن کے مختصر حالات زندگی، نئی مہم کی پیش بندیاں، گیارھویں مہم ۱۹۵۳ء کامرانی اور فتح ہیں۔یہ کتاب ۱۹۵۵ء کو مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوئی ہے۔۱۱۰ صفحات پر مشتمل نایاب معلوماتی کتاب ہے۔

اس کتاب میں اطہر پرویز نے ایورسٹ پہاڑ کے مشکل راستوں اور اس کی لمبائی کا حال بیان کرتے ہوئے اس کی چوٹی پر پہنچ کر جھنڈا لہرانے والوں کے سفری دشواریوں اور مشکل منزلوں کی بڑے موثر انداز میں داستان تحریر کر کے بچوں میں ہمت اور جرت مندی کے نقطے کو قائم کرنے کی ہر وہ کوشش کی ہے جس سے

نونہالوں کے اندر ہر محاذ پر کامیابی کا عشق طاری رہے کیوں کہ ناکامی ہی کامیابی کی اصل شرط ہے ناکامی ہی انسان کو اپنے مقصد میں محنت اور لگن کے ساتھ جوڑ کر رکھتی ہے موصوف نے ایورسٹ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے والوں کی زندگی اور ان کی جدوجہد کو بچوں کے سامنے ایک نمونے کے طور پر پیش کر کے بچوں اور احساس کمتری کے شکار نوجوانوں کے ذہن میں یہ نقطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے محنت ہی کامیابی کی اصل کنجی ہے اسی حوالے سے انہوں نے کتاب کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''زندگی میں مشکلات کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے، لیکن مشکلات نہ ہوں تو شاید انسانی زندگی پژمردہ ہو جائے۔اس میں کوئی تڑپ باقی نہ رہے۔ انسان وہی ہے جو ان مشکلات کو اپنی لئے کار آمد بنالے۔وہ ان حوصلوں سے جدوجہد کے سبق سیکھے اور یہی اس کی کامیابی وکامرانی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔''[۱]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ کسی مقصد میں ناکامیابی کے بعد ہی کامیابی کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔اطہر پرویز کا ایورسٹ پہاڑ کو بچوں کے لیے موضوع منتخب کرنے کا یہی مقصد تھا کہ معلومات کے ساتھ بچوں کا ذہن بچپن سے ہی احساسِ برتری کا حامل رہے۔اور ایورسٹ پہاڑ پر چڑھ کر فتح کے جھنڈے کولہرانا انسانی تاریخ کی سرگرمیوں میں ایک بڑی فتح رہی ہے جو بچوں میں کامیابی کا بہترین جذبہ وشوق پیدا کرسکتی ہے۔ایورسٹ پہاڑ پر کامیابی حاصل کرنا انسان کی محنت اور کامیابی کی بہترین مثال ہے کیوں کہ انسانی زندگی میں بھی اس طرح کی مشکل منزل آتی ہے جن کو عبور کرنا بھی ایورسٹ پہاڑ پر چڑھنے والوں کی سفری داستان سے کم نہیں اس لیے اطہر پرویز نے اس نایاب موضوع پر خامہ فرسائی کر کے بچوں میں جہاں معلوماتی خزانے کی کھیپ جمع کرنے کی کوشش کی ہے، وہیں ایورسٹ پہاڑ پر چڑھنے والے قافلوں کی سفری داستان تحریر کر کے اپنے مقصد میں ہر حال میں کامیاب ہونے کی طرف راغب کیا ہے۔موصوف اس کے علاوہ انسانی کی کامیابی کے حوالے سے کتاب کے صفحہ نمبر ۸ پر لکھتے ہیں:

> ''ہمالہ کی فتح کی تاریخ، انسان کی جدوجہد کی ایک بڑی مثال ہے۔ہمالہ

---

۱ یورسٹ کی فتح، اطہر پرویز، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۵ء، ص:۸،۱

کی فتح اور اس مثال کی کہانی ہمارے اندر حوصلہ اور اُمنگ پیدا کرتی ہے۔
یہ کہانی کوہ پیاؤں اور قلیوں کی موت سے شروع ہو کر انسان کی فتح پر ختم
ہوتی ہے۔ انسان اپنے علم اور عمل کی قوت سے وہاں پہنچا جہاں پہنچنا
پہلے ناممکن سمجھا جاتا تھا۔'' [۱]

اطہر پرویز نے ایورسٹ کی روداد تخلیق کرتے ہوئے جہاں مشکل سے مشکل منزلوں کا سفر عبور کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کی تلقین کی ہے، وہیں اس داستان کو رقم کر کے بچوں میں اتفاق کی برکت کے نقطے کو بھی اجاگر کیا ہے کیوں کہ جب ہم ایک ساتھ مل کر کسی مقصد کو فتح کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کامیابی لازمی ہوتی ہے لہٰذا مل جل کر رہنا چاہیے۔ کیوں کہ اتفاق میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ایورسٹ کی فتح نے بتایا کہ جماعتی طور پر تنظیم کے ساتھ کام کرنا بھی کتنا
ضروری ہے۔ اور جب انسان مل جل کر کام کرے تب ہی منزل مقصود پر
پہنچتا ہے۔ اس طرح منزل پر ایک آدمی کا پہنچنا صرف ایک آدمی کا نہیں
بلکہ پوری جماعت کا پہنچنا ہے۔ قلیوں، ڈاکٹروں، کوہ پیاؤں میں سے ہر
ایک کا کام اپنی جگہ پر اہم ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے کام کو
سلیقے سے نہ کرتا تو کامیابی نہ ہو سکتی۔'' [۲]

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہ انہوں نے بچوں میں محنت ،لگن ،آپسی بھائی چارے کے ساتھ ساتھ ہمدردی کے نقطے کو بھی ابھارنے کی بھرپور کوشش کی ہیں اور اتفاق و اتحاد کی برکت کو بھی اجاگر کیا ہے۔

اُس وقت تک ایورسٹ پہاڑ پر چڑھنے کی کل گیارہ مہمیں گئیں تھیں اس طرح اطہر پرویز نے ان تمام مہموں کی سفری دشواریوں، پریشانیوں کے منظرنامے کو پیش کرتے ہوئے انسانی عزم و استقلال کی کہانی کو بڑے موثر انداز میں پیش کر کے بچوں کے ذہن میں ہمت نہ ہارنے اور مستعدی کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنے

---

[۱] یورسٹ کی فتح، اطہر پرویز، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۵ء، ص:۸

[۲] یورسٹ کی فتح، اطہر پرویز، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۵ء، ص:۹

کی تلقین کی ہے۔اور ایورسٹ پہاڑ کی مختصر تاریخ کے حوالے سے شگفتہ وشیریں زبان اور ان کی باریک بینی کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔جس کا انہوں نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''ہمالہ پہاڑ ہمارے ملک کے شمال میں ہے اس کا سلسلہ سیام سے ہوتا ہوا مغرب میں پامیر اور ہندوکش تک چلا جاتا ہے۔اس کی لمبائی تقریباً دو ہزار میل ہے۔جغرافیہ دانوں کا کہنا ہے کہ اب سے تین کروڑ سال پہلے ہماری زمین میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ زمین کی بنیادیں ہل گئیں اور کمزور حصّہ بیٹھ گیا۔اس کے بیٹھنے سے یہ ہوا کہ سارے کا سارا پہاڑی حصہ سطح زمین سے اُبھر آیا اور اُسی اُبھرے ہوئے حصّے کا نام ''ہمالہ'' پڑا۔جو ہمارے ملک کے شمال میں ہے اور دنیا کا سب سے نیا پہاڑ ہے۔دنیا میں کوئی ایسا برّ اعظم نہیں ہے، جہاں قدرت نے اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلے قائم نہ کیے ہوں۔جنوبی امریکہ میں کوہستان انڈ نیز،شمالی،امریکہ میں کوہستان راکی،یورپ میں الپس۔افریقہ کے مشرقی علاقے کلمن جارو لیکن لمبائی،چوڑائی اور اونچائی میں ایک بھی ہمالہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔'' [۱]

نیز پہاڑ کے تاریخی خدوخال سے واقف کروانے کے لئے اپنے فنی کمالات سے بہترین مورخانہ فکر سے بے مثال تاریخی واقعات تحریر کیے ہیں۔

اطہر پرویز کی ذات دوسرے ادیبوں سے اسی نقطے پر انفرادیت کے لباس میں نظر آتی ہے کہ انہوں نے ادب اطفال میں بچوں کو بنیادی معلومات کے ساتھ ساتھ ان کے اذہان کو سائنسی نقطہ نظر کے قریب تر لا کر ایسی ذہنیت پیدا کی ہے کہ وہ ہر معاملات کو ہر اعتبار سے سمجھ کر زندگی کو کامیاب بنا کر ایسا کارنامہ انجام دیں جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بن جائے۔بچوں میں سائنسی شعور پیدا کرنے کا اہم طریقہ یہ بھی ہے کہ بچوں کو سائنس دانوں کے متعلق بھی معلوماتی کتابیں فراہم کی جائے چوں کہ سائنس کے عجوبات جو ہم روزمرّہ

---

[۱] یورسٹ کی فتح،اطہر پرویز،مکتبہ شاہراہ،دہلی،۱۹۵۵ء،ص:۲۰ تا ۲۱

کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔دراصل ہزاروں سائنس دانوں کی طویل جدوجہد اور کاوشوں کے بعدان کی ایجاد ہو پاتی ہےاوراس جدوجہد میں جوسائنسداں جانفشانی کرتے رہے ہیں ان کے حالات کوقوم کے نونہالوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ شروع سے ہی بچوں کے ذہن میں سائنسی افکار وجود پذیر ہوں۔اس حوالے سے اطہر پرویز نے بھی بعض کتابیں تخلیق کی ہیں مثلاً ''چارلس ڈارون''اور''گلیلی گلیلیو''اس ضمن کی معروف ومشہور کتابیں ہیں۔''چارلیس ڈارون''انگلستان کا مشہور سائنسدان تھا یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں مجلس اشاعت ادب دہلی نے شائع کی۔اطہر پرویز نے بچوں کو چارلیس ڈارون کے حالات زندگی اوراس کی نظریے سے متعارف کروایا ہے۔

چارلیس ڈارون انگلستان کا مشہور سائنسداں تھا ابتدائی تعلیم کے بعدان کے والد نے ان کو ایڈنبرا یونیورسٹی میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کے لیے داخلہ دلایا لیکن دوسال کے بعدان کے والد نے انہیں پادری بنانے کا فیصلہ کیا اور ڈارون کو کیمرج یونیورسٹی میں داخل کروایا گیا اور کیمبرج میں ہی ڈارون کی ملاقات پروفسر جے۔ایس۔ہنسلو سے ہوئی انہیں کے مشورے پرڈارون نے گریجویشن کے بعدعلم طبقات الارض(geology) کا کورس کیااوران کی ہی ایماپرڈارون نے لاییل lyell کی معروف کتاب principles of geology کا بہت ہی انہماک سے مطالعہ کیااسی کی وجہ سےان کواپنی تحقیق کے لیےعلم طبقات الارض کے حوالے سے مواد جمع کرنے میں مددملی۔ہنسلو کاڈارون کی زندگی پرغیرمعمولی اثر تھابرطانیہ کی امیرالبحری(ADMIRALITY) نے H.M.S Beagl نامی سمندری جہاز کوجنوبی امریکہ کےساحلوں کا سروے کرنے کے لیے رابرٹ فٹز رائے کی راہنمائی میں روانہ کیا گیا تھا تاکہ امیرالبحری کے نقشوں کوصحیح معلوم کیا جائے۔رابرٹ رائے اپنے ساتھ علم طبیعات کےایک ماہرکوبھی لے جانا چاہتے تھے تاکہ جانوروں اور پودوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائے۔تو پروفسر ہنسلو کی سفارش پرڈارون کوہی اس سفر پر جانے کا موقعہ ملا۔اس سفر کے بدولت چارلیس ڈارون کی شہرت نصیب ہوئی۔کیوں کہ اس سفر کے ذریعے ہی ڈارون کواپنی تحقیق کے لیے مواد جمع کرنے کاسنہراموقعہ ملا۔موصوف نے اس کتاب میں ڈارون کےان اسفار کاتفصیلی ذکر کیا ہےجن سےانہوں نے اپنے نظریےکوتقویت بخشی ہے پانچ سال کی طویل مدت پر مشتمل یہ سفرڈارون کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔وہ اپنے اس سفر کےمتعلق خودلکھتا ہے کہ :

''اس سفر میں اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا اگر کوئی بیس ہزار پونڈ سالانہ دے کر بھی اس علم کو لینا چاہے تو میں دینے کے لیے تیار نہیں ہوں''۔[۱]

''کتاب ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے'' اطہر پرویز کی انعام یافتہ کتاب ہے۔ جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے بہت ہی دلچسپ اور عام فہم انداز میں بچوں کو چاند، سورج اور مختلف ستاروں اور سیاروں کی دنیا سے بچوں کو واقف کرایا ہے۔ یہ کتاب سن ۱۹۶۴ء کو اردو گھر علی گڑھ سے اشاعت پذیر ہوئی۔ علم فلکیات سائنس کی قدیم شاخ ہے۔ اس علم میں اجرام فلکی یعنی چاند، سورج، ستارے، سیارے کہکشاں وغیرہ کے علاوہ کرۂ ارضی کے باہر رونما ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ کوکب عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سیّارہ کے ہیں مگر قدیم زمانے میں علم نجوم میں کواکب کے گروہ سے مراد نظام شمسی کے پانچ قدیم معلوم سیّارے اور دو نیرین یعنی شمس وقمر لیے جاتے تھے۔ لیکن پھر سائنس نے ترقی کی اور یورینس، نیپچون اور پلوٹو کو دریافت کر کے علم نجوم میں شامل کیا گیا۔ اس کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں کہ:

''ستاروں اور سیاروں کی سائنس، دینا کی سب سے قدیم سائنس ہے اگر اسے تمام سائنسوں کی ملکہ کہا جاتا ہے تو بے جا نہیں ہے۔ انسان جنگلوں میں رہتا تھا۔ وہ تہذیب کے نام سے بھی واقف نہ تھا لیکن ستاروں سے دلچسپی لیتا تھا۔ وہ انھیں محض حیرت سے دیکھتا ہی نہ تھا انھیں مقدس بھی سمجھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض قدیم پجاریوں نے تو اونچے اونچے مینار جیسے مندر بنوائے جہاں سے وہ انھیں دیکھتے اور ان کی عبادت کرتے'' [۲]

کتاب کے پہلے دوسرے اور تیسرے باب میں بچوں کو ستاروں کی دینا سے متعارف کروایا ہے کہ کس طرح سے انسان نے ترقی کر کے دربین ایجاد کی ستاروں، سورج اور دوسرے سیّاروں کو دیکھا، ان کی آمدرفت اور ان کے نفع نقصان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ چوتھے اور پانچویں باب میں موصوف نے بچوں

---

۱ چارلیس ڈراون، اطہر پرویز، مجلس اشاعت ادب (رجسٹرڈ) دہلی، ص: ۲۳

۲ اطہر پرویز، ستاروں کی دنیا، اردو گھر، علی گڑھ، ی ۱۹۶۴ء ص: ۸/۷

کوسورج کی بناوٹ،سورج کی ہماری زمین سے دوری،سورج انسانوں اورحیوانوں کے لیے کتنا ضروری ہے، سورج کی گرمی،سورج کی طاقت،سورج کےفوائد کے بارے میں تفصیل سے معلومات دی ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہم اورآپ اپنے گھرانے میں رہتے ہیں۔ہمارااپنا کنبہ ہوتا ہے۔اسی طرح سورج کا بھی اپنا ایک کنبہ ہےاس کنبے کا بڑا یہی سورج ہے۔ سورج کے کنبے کےلوگ اُس کےفرمانبردار ہیں۔گویا اس کاحکم بھی ایسا ویسا نہیں۔یہ سب سورج کے چاروں طرف ناچتے ہیں۔ہماری یہ زمین بھی سورج کے کنبے سے تعلق رکھتی ہےاور یہ بھی سورج کے کنبے پر چلتی ہے۔اس کنبے میں زمین کے علاوہ آٹھ اور بھی ہیں۔گویا سورج کے گھرانے میں یہ نو بچے ہیں۔سورج کے ان نو بچوں کوہم سیّارہ کہتے ہیں۔ انھیں سیّارہ اس لئے کہا جاتا ہےکیونکہ ہروقت سیر کرتے رہتے ہیں۔ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھتے۔بس ان کا کام ہروقت سورج کے گرد گھومنا اور چکر لگانا ہے۔'' [۱]

صفحہ نمبر ۴۳ پر ایک تصویر میں تمام سیاروں کو نام وقدوقامت کے لحاظ سے دکھایا ہےاس طرح سے انہوں نے سورج کے سارے خاندان کے فائدے اور نقصان سے ان کے کاموں سے بچوں کو بہت آسان زبان میں سمجھایا ہے۔

چاندکوزمین کا سب سے زیادہ قریب ہونے کے باعث علم نجوم میں خاص مقام حاصل ہےاسی لیے موصوف بچوں چاند کےمتعلق مکمل معلومات دی گئی ہے۔مثلاً چاند کی بناوٹ،چاند کا زمین کے گرد چکر لگانا،چاند کی کشش،چاند کا سمندر کو اپنی طرف کھینچنا اور چاند کا دوسرا رخ وغیرہ،اس کےعلاوہ انہوں نے سیّاراتِ صغیرہ سے بھی متعارف کیا ہے۔وہ بچوں کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے کتاب میں جگہ جگہ تصویروں سے مزین کرتے ہیں۔

---

[۱] اطہر پرویز،ستاروں کی دنیا،اردو گھر،علی گڑھ،ی ۱۹۶۴ءص:۴۲

''خلا کا سفر'' اطہر پرویز کی نامور انعام یافتہ کتاب ہے ۱۹۷۱ء کو اردو گھر علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے یہ کتاب بائیس فصلوں پر مشتمل ہے اس کتاب میں تحیّر واستعجاب سے تخیلات وحادثات کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے اور تفریح کے پردے میں اطہر پرویز نے بچوں کو جدید سائنسی ایجادات اور کائنات کے اسرار و رموز سے روشناس کرایا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے آس پاس کی چیزوں کو جاننے کی کوشش کرتا ہے کائنات کے رازوں سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ جیسا کہ مصنف نے ہوا کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر سے بھر پور معلومات عطا کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''دنیا کو جو حلقہ گھیرے ہوئے ہے اسے فضا کہتے ہیں۔ ہم جیسے جیسے اوپر جاتے ہیں ہوا کم ہوتی جاتی ہے۔ سائنس دانوں نے اسے تین طبقوں میں بانٹا ہے۔ پہلا طبق تقریباً دس میل کی بلندی تک پھیلا ہوا ہے اسے 'ٹرد پوس فیر' کہتے ہیں۔ طوفان، بدلیاں، اور دھند لکے اسی دس میل کے اندر اندر ہوتے ہیں۔ اس طبق میں ہوائی جہاز سفر کرتے ہیں۔ دو میل تک فضا میں خوب آکسیجن ہوتی ہے۔ وہی آکسیجن جس کی بدولت ہم زندہ رہتے ہیں۔ آکسیجن نہ ہوتی تو ہمارا دم گھٹنے لگتا اور ہم مرجاتے دو میل تک آکسیجن بہت کم ہے۔ اس لئے جو ہوائی جہاز دو میل کے اوپر اُڑتے ہیں، وہ اپنے ساتھ آکسیجن رکھتے ہیں۔ پہلا طبق، ٹروپوس فیر، کہلاتا ہے۔ دوسرا طبق ''اسٹروٹوس فیر'' کہلاتا ہے۔ یہی طبق دس میل سے پچاس میل کی بلندی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس طبق میں نہ گرد ہے نہ بادل، نہ پانی ہے نہ بھاپ۔ اس طبق کے اوپر ایک اور طبق ہے جسے'' آئی نوس فیر'' کہتے ہیں۔ آپ کو رات کے وقت شہاب ثاقب نظر آتے ہیں انھیں عام طور پر لوگ ستاروں کا ٹوٹنا کہتے ہیں یہہ'' آئی نوس فیر'' میں نظر آتے ہیں۔ آئی نوس فیر میں ہوا برائے نام ہوتی ہے۔ اتنی ہوا میں کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہوا کا صرف فائدہ نہیں ہے کہ ہم اس کے

ذریعے آکسیجن حاصل کرتے ہیں بلکہ اگر یہ ہوا نہ ہوتی تو سورج کی گرمی
سے لوگ جل بھن کر رہ جاتے۔ یہ ہوا سورج کی روشنی کو فضا میں بکھیرتی
ہے۔''آئی نوس فیر'' چونکہ ہوا بالکل نہیں ہے اس لئے سورج کی روشنی
اس پر پوری تیزی سے پڑتی ہے۔'' [۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ بچوں کو ہوا کی مختلف اقسام اور اس کے فوائد سے متعلق جانکاری دی گئی ہے منظر کی پیشکش میں جزئیات نگاری سے خوب کام لیا ہے اور خلا کے سفر میں موصوف نے بچوں کو نئے نئے جہانوں کی گھر بیٹھے سیر کروائی گئی ہے۔ جب کہ بچوں کو مناظر قدرت کی ان اشیاء سے واقف کروانا مشکل امر ہے جن کو وہ دیکھ نہیں سکتا کیوں کہ بچہ عموماً چیزوں کو چھو کر محسوس کر کے ان سے واقف ہوتا ہے۔ لیکن اطہر پرویز کا کمال یہ ہے کہ ایسی ہزاروں چیزوں کے بارے میں ہلکی پھلکی اور عام فہم زبان میں بچوں کو معلومات دی ہیں جن کو پڑھ کر بچے محظوظ ہوتے ہیں۔ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ کائنات کی ہر ہر چیز کو دیکھنا اور سیر کرنا چاہتا تھا اور خلا کی سیر کرنے کا خواب کب سے آنکھوں میں لیے ہوئے ہے اس حوالے سے سائنس دانوں نے بہت کوششیں کی۔ کونستنتن سیال فسکی روم کا مشہور اور پہلا سائنس داں تھا جس نے انسان کی خلا میں اُڑان بھرنے کی آرزو کو پورا کیا۔ مذکورہ کتاب میں ان طویل جدو جہد کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے جن کی بدولت انسان کا خلا میں قدم رکھنا ممکن ہو سکا ہے کہ کس طرح روس اور امریکہ کے سائنس دانوں نے انسان کو خلا میں بھیجنے سے پہلے وہاں کے ماحول سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کئی مہموں اور سرگرمیوں کو سرانجام دیا کئی مصنوعی چاند، مصنوعی ستاروں کو خلا میں اڑایا گیا۔ اس طرح سائنس دانوں کی محنت کے سبب انسان خلائی اڑان بھرنے میں کامیاب و کامران ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس طرح انسان خلا میں اُڑان کی تیاری برسوں سے کر رہا تھا لیکن اسے
پہلی بار اس وقت کامیابی ہوئی جب روسی سائنس دانوں ۴۔ اکتوبر ۱۹۵۷ کو
پہلا مصنوعی چاند چھوڑا۔ خلا کی تاریخ میں یہ ایک انوکھا دن تھا جب
ستاروں اور سیّاروں کی بستی میں ایک نیا مہمان داخل ہوا۔ اس کا وزن

---

[۱] خلا کا سفر، اطہر پرویز، اردو گھر، علی گڑھ، ۱۹۷۱ء ص: ۷، ۸، ۹

دومن نو سیر تھا۔اس نقلی چاند نے ذرا سی دیر میں اصلی چاند کی طرح دنیا
کے چکرّ لگانے شروع کر دیے۔ اصلی چاند زمین کا ایک چکر ۲۱۹۹ دن
میں کرتا ہے۔ ہمارا یہ مصنوعی چاند ایک گھنٹہ، ۳۶ منٹ اور ۲ سکنڈ یعنی
ڈیڑھ گھنٹے سے کچھ دیر میں ایک چکرّ لگا لیتا تھا۔اس مصنوعی چاند کا فاصلہ
۵۹۹ میل ہے۔بس اس سے کچھ کم ہی فاصلہ پر مصنوعی چاند چکرّ لگاتا تھا۔یہ
چاند المونیم میں کچھ اور دھاتوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔اس کی سطح خوب چکنی
اور چمکدار تھی اور اس کے اندر بہت سے سائنسی آلات تھے۔اس میں دو
ریڈیو ٹرانسمیٹر لگے تھے جو ہماری زمین پر فضائی کیفیت کی اطلاع بھیجتے
تھے۔ٹرانسمیٹر بیٹری کی بجلی سے کام کرتے تھے۔'' [۱]

مذکورہ اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ اطہر پرویز کو جزئیات نگاری میں کمال حاصل تھا۔کسی معاملے یا واقعہ کا بیان کرتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتی۔اور معمولی سے معمولی چیزوں کے بیان سے وہ واقعہ کو نہایت جاندار اور حقیقی بنا کر پیش کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔

انسان کا خلا میں سفر کرنے کا خواب اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانی تہذیب۔اس سفر میں معاونت کرنے کے لیے روس اور امریکہ کے سائنس دانوں نے کئی راکٹس بنائے اور کئی مصنوعی چاند اور سیارے خلا میں بھیجے اور آخر کار انسان کو خلا کی اُڑان بھرنے سے پہلے ایک کتیا کو خلا میں بھیجا گیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ خلا کے ماحول کا جاندار کے جسم پر کیا اثر ہوتا ہے۔

''پہلے مصنوعی چاند کی بعد ۳ نومبر ۱۹۵۷ء کو روس کے سائنس دانوں نے
ایک اور مصنوعی چاند پھینکا، جو زمین کی سطح سے ۹۳۰ میل کی بلندی پر پہنچا
۔۔۔۔اس کے اندر ایک کتیا تھی، جو آزمائش کے لیے اس کے اندر رکھی
گئی۔اس کتیا کا نام لائیکا تھا۔اس مصنوعی چاند نے انسان کی ایک بڑی
خوہش کا صاف صاف اعلان کر دیا تھا۔انسان اپنے خلائی سفر کی تیاریاں

---

[۱] خلا کا سفر، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، سن اشاعت ۱۹۷۱ء، ص: ۱۶/۱۷

کر رہا تھا اور اور کتیا کو بھیجنے کے بعد خود جانا چاہتا تھا۔اس کتیا کو مصنوعی
چاند میں بھیجنے سے پہلے فضائی سفر کی خوب مشق کرائی گئی تھی۔مصنوعی
چاند کے اندر ایک ہفتے کا کھانا بند کر دیا تھا جو اسے وقت پر مل جاتا تھا۔
اس کے اندر ایسے آلات تھے جن سے کتیا کے سانس کی رفتار، دل کی
دھڑکن، خون کا دباؤ معلوم ہوتا تھا اور پھر ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعہ یہ
اطلاع زمین پر آجاتی تھی۔اور یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کہ جاندار کے جسم
میں پر کس قسم کا اثر ہوتا ہے سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ ۵ میل فی سکینڈ
کی رفتار پر چلنے کے باوجود کتیا نے گردش اور فضا کے غیر معمولی اثرات کو
برداشت کر کے انسانی سفر کے امکانات پیدا کئے۔'' [1]

اس طرح سے سائنس دانوں کی لاکھوں کاوشوں کے بعد انسان کی صدیوں پرانی خواہش پائے تکمیل کو پہنچی اور انسان خلا میں اُڑان بھرنے میں کامیاب ہوا۔اطہر پرویز نے بچوں کی دلچسپیوں اور ان کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے انہیں جہد مسلسل اور مستعدی عمل کی تعلیم دیتے ہوئے محنت و مشقت کرنے کی تلقین کی ہے۔

اطہر پرویز نے جہاں بچوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہانیاں لکھی ہیں جن کو پڑھ یا سن کر وہ مزاح محسوس کرتے ہیں، وہیں آپ نے بچوں کی تحریروں میں ڈرامائی انداز کو قائم رکھ کر ایسا معلوماتی اور سبق آموز منظر نامہ پیش کیا ہے کہ جس سے بچے مزاح کا لطف لیتے ہوئے ایسے نکتوں سے واقف ہوتے ہیں کہ ان کی آنے والی زندگی خوشحال بن سکے۔انہوں نے اپنی کہانیوں اور معلوماتی تحریروں کے ذریعے بچوں کو ایسی معلومات فراہم کرنا چاہتے تھے جن میں ایسے نکتے ہوں جو بچوں کو استفسار کی جانب راغب کریں اور سائنسی ذہن کی نشو و نما ہو سکے اسی حوالے سے ان کی کتاب ''بچوں کی معلومات'' ایک ایسا معلوماتی نایاب تحفہ ہے جو نہ صرف بچوں بلکہ نوجوانوں کی معلومات کے اضافے کے لیے بھی اہم ذریعہ بن سکتا ہے۔اس کتاب میں کل گیارہ اسباق ہیں جن کو اطہر پرویز نے بہت ہی موثر انداز میں تحریر کیا ہے۔اور ایسی معلومات فراہم کی ہے کہ جب ہم اپنے گردنواح کے منظر نامے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں یہ کیا؟

---

[1] خلا کا سفر، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، سن اشاعت ۱۹۷۱ء، ص: ۲۴/۲۵

کیوں؟ کیسے ہوسکتا ہے۔ جب تک ہم اس کی پوری تحقیق کر کے جواب نہ اخذ کرلیں سکون نہیں ملتا سائنسی نشو ونما والا ذہن ہی اس بے چینی کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ بچے اکثر اس طرح کے سوال کرتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب ان انجان اذہان اور بالخصوص بچوں کے ان سوالات کے صحیح جوابات کے حوالے سے بہترین معلومات کا ذخیرہ ہے اس کتاب کے حوالے سے انہوں نے ''دو باتیں'' کے عنوان سے اس طرح لکھا ہے کہ:

> ''یہ اس معنوں میں سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ اس کے اندر دنیا کے بارے میں ایک عام معلومات دے دی گئی ہے اور پڑھنے والے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس ہوگا کہ ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے اور وہ وجہ تلاش کرنے پر معلوم ہوسکتی ہے اس کتاب میں بچوں کی کوئی معلومات پہلے سے فرض نہیں کر لی گئی ہے۔ ہر بات کو سادہ اور سلیس زبان میں سمجھانے کی کوشش ہے ۔ یہ کتاب ان معنوں میں سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ ان کے اندر سائنسی علوم کے بارے میں ٹیکنیکل معلومات نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو بات کہی ہے وہ بنیادی ہے اور آگے چل کر اسی بنیاد پر سائنس کی عمارت رکھی جاسکتی ہے۔ میری کوشش ہے کہ یہ بنیاد اتنی اچھی ہو جائے کہ بالائی عمارت کا بوجھ برداشت کر سکے۔'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ اس کتاب میں کوئی سائنسی تجربہ کرنے کا کوئی ایسا ٹیکنیکل مواد نہیں ملتا ہے بلکہ بچوں کی نگاہوں کے سامنے جو زمین، آسمان، سورج، چاند اور دیگر ستارے ہیں ان کے متعلق معلومات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اطہر پرویز کا یہ تخلیقی کارنامہ صرف بچوں کی معلومات کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے بھی ایک بہترین معلوماتی تحفہ ہے، پس یہی وجہ ہے کہ اطہر پرویز کی شخصیت ادب اطفال میں انفرادیت کے لباس میں ملبوس نظر آتی ہے کیوں کہ انہوں نے جہاں ادب اطفال میں دلچسپ کہانیوں کا ذخیرہ اپنے فنی کمالات سے پیش کیا ہے، وہیں بچوں کی معلومات میں

---

[1] بچوں کی معلومات، اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵، سن اشاعت ۲۰۰۱ء، ص: ۶۵

اضافے کے لیے سائنسی نقطہ نظر کی بنیادی معلومات سے بھی واقف کروانے کے لیے اہم تخلیقات پیش کی ہیں جو انہیں ادب اطفال کی دنیا میں دوسرے ادیبوں و تخلیق کاروں سے الگ کرتی ہیں۔

''بچوں کی معلومات'' اطہر پرویز کا بظاہر مختصر کارنامہ نظر آتا ہے۔لیکن اس کتاب میں جامع معلومات پر مبنی گیارہ اسباق ہیں۔ہماری زمین، جانور، پودے، پانی، صاف ہوا، مکان کی صفائی، اچھی غذا، ورزش، ہمارا جسم، کھیتی باڑی اور ہوائی جہاز کتاب کی فہرست سے یہی نکتے عیاں ہو رہے ہیں کہ انہوں نے انسانی شعبہ حیات میں پیش آنے والے ان تمام نکتوں کو پیش کیا ہے جن سے بچے اور نوجواں واقفیت حاصل کر کے زندگی کے مشکل سوالات کو بھی اپنے عملی وجدان سے حل کر سکیں۔کتاب کے پہلے سبق پر طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اطہر پرویز نے اپنی فنی صلاحتیوں سے زمین کی ایسی بنیادی معلومات سائنسی نقطۂ نظر سے پیش کی ہے جس پر اکثر نوجواں بالخصوص بچے استفسار کرتے ہیں۔موصوف زمین کی اصل حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اس میں جو تبدیلیاں پیش آئی ہیں اس حوالے سے مختصر جامع معلومات فراہم کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہماری زمین پہلے سورج کا حصہ تھی۔پھر اچانک سورج سے علاحدہ ہوئی۔چنانچہ شروع شروع میں یہ آگ کی طرح دہکتی تھی پھر دھیرے دھیرے اُس کی روشنی کم ہوئی اور آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوئی ہوتے ہوتے اُس کی آج کی شکل بنی۔آخر کار اس کا اوپر کا حصہ ٹھوس ہو گیا'' [۱]

مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''ہماری زمین کتنی بڑی ہے۔یوں تو یہ سورج اور دوسرے ستاروں کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے لیکن پھر بھی یہ بہت بڑی ہے، اتنی بڑی کہ اگر آپ موٹر ۳۰۰ میل روزانہ کے حساب سے چلیں تو آپ کو زمین کا چکّر لگانے میں تین مہینے لگیں گے۔'' [۲]

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے یہ عیاں ہے کہ زمین کی اصل شکل کیا تھی اس کے بعد کیا روپ اختیار کیا ہے اس کے علاوہ وہ اس سبق میں سورج اور بقیہ ستاروں سے زمین کی دوری کی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔

---

۱ بچوں کی معلومات، اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵، سن اشاعت دوم، ۲۰۰۱، ص:۸

۲ بچوں کی معلومات، اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵، سن اشاعت دوم، ۲۰۰۱، ص:۸

ہوااور پانی یہ دوعنصر انسان کی زندگی میں بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ زمین پر رہنے والے جانداروں کے لیے ہوااور پانی دونوں ہی بہت ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ اگر انسان کچھ دن نہ کھائے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے، لیکن ہوا کے بغیر چند لمحے بھی زندہ رہنا مشکل ہے اسی لیے انہوں نے صاف وشفاف ہوا میں رہنے کی تلقین کرتے ہوئے سانس لینے کے صحیح طریقے سے بھی بچوں کو واقف کروایا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب آپ سانس لیں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ ناک سے سانس لیں۔لیکن اگر آپ منہ سے سانس لیں گے تو آپ کو نقصان پہنچے گا جو لوگ مستقل طور پر منہ سے سانس لیتے ہیں ان کو گلے اور چھاتی کی بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں، جیسے نزلہ، زکام، کھانسی اور گلا خراب ہو جاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ناک سے سانس لینے میں ہوا کو آڑے ترچھے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔اس درمیان میں اگر ہوا کے اندر کوئی جراثیم ہوتے ہیں تو وہ راستے ہی میں چھن کر رہ جاتے ہیں۔مٹی کے ذرے ناک کے بالوں میں پھنس جاتے ہیں اور اندر نہیں جا سکتے۔اور اگر کچھ ناک سے نکل کر حلق میں پہنچ جائیں تو پھر وہ حلق میں رُک جاتے ہیں اور اس سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔اس طرح یہ راستہ آڑا ترچھا ہونے کی وجہ سے ہوا کو اچھی طرح چھان دیتا ہے لیکن منہ سے سانس لینے میں یہ خرابی ہے کہ ایک دم سے منہ سے پھیپھڑے تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔''[۱]

اس طرح قدرت کے نایاب تحفوں میں سے پانی انسانی شعبہ حیات کے علاوہ ہر جاندار کی زندگی میں بہت اہم شے ہے۔اس لیے انہوں نے اس کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

''پانی ہماری زندگی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ ہوا انسان ہی

---

۱ بچوں کی معلومات، اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۵۲، سن اشاعت دوم، ۲۰۰۱، ص:۲۱

نہیں بلکہ ہر جاندار کو زندہ رہنے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے تمام
پیڑ پودے، اور گھاس پوس پانی سے ہی ہرے بھرے رہتے ہیں۔ اگر
پانی نہ ملے تو پودے مرجھا جائیں۔'' ۱؎

اس کے علاوہ وہ بچوں کی سوچ و فکر کو ذہن میں رکھتے ہوئے پانی پینے کے فائدے اور نہ پینے کے نقصانات سے بھی اچھی طرح واقف کرواتے ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں کہ:

''تندرستی کے لیے پانی بے حد ضروری ہے۔ ہم جو کھانا کھاتے ہیں،
جب وہ ہضم ہوتا ہے تو اس کا بہتر حصہ گھل کر خون میں ملتا ہے۔ پانی
ہمارے جسم کی گندگی کو بھی دور کرتا ہے۔ اگر ہم کم پانی پئیں گے تو قبض
ہوجائے گا اور پیشاب بھی کم آئے گا اور پسینہ بھی کم نکلے گا۔ اس طرح
جسم کی گندگی باہر نہیں نکل سکے گی اور سر میں درد رہنے لگے گا۔ اس لیے
ہمیں کافی پانی پینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔'' ۲؎

مختصر یہ کہ اس کتاب کے ہر سبق میں بچوں کو معلومات کا بہترین ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ انہوں نے بچوں کو زندگی میں پیش آنے والے روزمرّہ کے معاملات مثلاً مختلف غذاؤں کے فوائد، کھیتی باڑی، روزش، صفائی ستھرائی وغیرہ کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کر کے ایسی تلقین کی ہے کہ جن پر عمل کر کے زندگی کو خوش گوار بنایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ان موضوعات کا انتخاب کر کے اردو ادب اطفال میں ایک نئے گوشے کا اضافہ کیا ہے جو بچوں کی معلوماتی نشوونما کے لیے نہایت ہی قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں توانائی کا راز بھی اطہر پرویز کی اہم سائنسی معلومات کی کتاب ہے۔

تراجم:

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے کسی ایک زبان کی کوئی تحریر، تصنیف کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ دنیا میں بہت سی زبانیں ہیں اور بہت سی بولیاں ہیں جن میں فکر و احساس کا تخلیقی ادب موجود ہوتا

۱؎ بچوں کی معلومات، اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۵۲، سن اشاعت دوم، ۲۰۰۱، ص: ۱۷

۲؎ بچوں کی معلومات، اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۵۲، سن اشاعت دوم، ۲۰۰۱، ص: ۱۷/۱۸

ہے اس خزانے سے مستفید ہونے کے لیے ترجمہ کا سہارا لینا پڑا۔ بنیادی طور پر ترجمہ لسانی اور تہذیبی مفاہمہ ہے زمانہ چاہے قدیم ہو یا جدید اگر ہمیں کسی تہذیب وثقافت اور مختلف النوع مواد سے اپنی قوم کے نونہالوں کو واقف کرانا ہے تو اس کے لیے ترجمہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ چاہے وہ مواد عملی ہو، ادبی، سائنسی یا معاشرتی ترجمے کے بدولت ہی دوسرے اقوام کے لوگوں تک منتقل ہوتا رہا ہے اس طرح سے دیکھا جائے تو مختلف قومیں وتہذیبیں ایک دوسرے کے علوم اور تجربے سے ترجمے کے ذریعے ہی آشنا ہوتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ترجمہ نہ اصل کی لذت سے پوری طرح لطف اندوز کراتا اور نہ ہی اسے مکمل محرومی کو قبول کرتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ:

> ''ترجمہ نگاری ایسا دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں''۔[۱]

زندگی کے ہر شعبہ میں ترجمہ انسانیت کی خدمت کررہا ہے۔ دنیا بھر میں علوم وفنون کی منتقلی ہو یا تہذیب وثقافت کی اس کے پھیلاؤ میں ترجمہ کا کردار نہایت اہمیت کے حامل رہا ہے۔ ترجمے کی اہمیت وضرورت ہر دور میں مسلم رہی ہے کیوں کہ ترجمہ دراصل ایک تہذیبی معنویت کو دوسرے تہذیبی معنویت میں ڈھالنا ہے اسی سے ایک قوم کے لوگ دوسرے ملک کے رہن سہن، رسوم ورواج اور تہذیب وتمدن سے آشنا ہوتے رہے ہیں۔ ترجمے کی بدولت ہی کوئی بھی زبان نئی اصناف سے آشنا ہوتی ہے، ترجمہ زبان میں وسعت وگہرائی پیدا کرتا ہے نئے اسالیب جنم لیتے ہیں اسی اہمیت کے پیش نظر فن ترجمہ نگاری کو تخلیق کا درجہ حاصل رہا ہے جیسا کہ ڈاکٹر قمر رئیس اپنی تصنیف ''ترجمہ کا فن اور روایت'' میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعے علوم وفنون کے خزانے سب کے لیے کھل جاتے ہیں اسی لیے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پالیا ہے''۔[۲]

---

۱ رشید امجد، فن ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتب اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص: ۴۱

۲ ترجمہ کا فن اور روایت، ڈاکٹر قمر رئیس، تاج پبلشنگ ھاؤس ۵۸۹، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی، ۱۹۷۶ء ص: ۲۶

قمر رئیس دوسری جگہ ترجمے کے بارے میں کچھ اس طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''ترجمہ نے ہی ایک قوم کے ذخیرہ علم وادب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے'' ۱

اطہر پرویز ترجمے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''اگر ہم کسی زبان کے اول درجے کی تصانیف کو اپنی زبان میں منتقل کرلیں اور اس سے استفادہ کریں تو کیا یہ ہمارے لیے قابل قدر اور قابل فخر نہ ہوگا۔ دانشوری اسی طرح نشونما پاتی ہے'' ۲

ترجمہ کی روایت بہت قدیم ہے۔ شروع میں فارسی اور عربی کی قدیم داستانوی، قصوں اور کہانیوں کی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اس کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور مختلف کالجز بنائے تو ترجمہ کا کام زور وشور سے شروع ہوا۔ اس حوالے سے فورٹ ولیم کالج، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ عثمانیہ اور دہلی رونا کولر سوسائٹی کے تحت بہت مفید ترجمے منظر عام پر آئے۔ اردو ادب اطفال کو فروغ دینے کے غرض سے ملک کے پہلے وزیر اعظم نے جواہر لال نہرو کے تحت نیشنل بک ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا تا کہ بچوں میں عادت مطالعہ کو فروغ دیا جائے اس نظریے کے تحت قومی اردو کونسل N.C.E.R.T اور اردو اکادمیوں نے بھی ادب اطفال کے لیے ترجمے کروائے ان مترجموں کی زیادہ تر تعداد اردو ادب کے نامور قلمکاروں کی تھی۔ قرۃ العین حیدر، مسعود حیات، رضیہ سجاد ظہیر، انور کمال خان، سراج انور اور اطہر پرویز وغیرہ نے اپنے ترجموں کے ذریعے اردو ادب اطفال میں خوشگوار اضافہ کیا ہے۔

اطہر پرویز نے بھی طبع زاد کہانیاں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کی کہاینوں کو اردو کے قالب میں اس خوش اسلوبی سے ڈھالا ہے کہ کہانی پر طبع زاد ہونے کا گماں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایسی رواں دواں زبان اور بے ساختہ طرز بیان اختیار کیا ہے کہ کہیں بھی ترجمے کا احساس تک نہیں ہوتا ان ہی خوبیوں کے سبب اطہر پرویز کو اردو ادب اطفال کی بزم میں اچھے مترجم کی صف میں نمایاں مقام حاصل ہوا ہے۔ جن کہانیوں کو انہوں نے اردو لباس میں ملبوس کیا ان میں سومناتھ در کی کہانی ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' اکتوبر ۱۹۵۰ء ''درزی اور جن کی کہانی'' اپریل ۱۹۵۲ء ''شکیسپئیر کا ڈراما'' 'وینس کا سوداگر' مارچ ۱۹۵۳ء ''شیر خوار بچہ'' کوریا کی ایک لوک کتھا' اور میڈم

۱ ترجمہ کا فن اور روایت، ڈاکٹر قمر رئیس، تاج پبلشنگ ھاؤس ۵۸۹، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی، ۱۹۷۶ء ص: ۵

۲ اطہر پرویز، ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن، مشمولہ ترجمہ روایت اور فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء ص: ۲۷۵

صفیہ لیان فاس کی کہانی ''ظالم بادشاہ اور کتا'' مارچ ۱۹۵۱ء وہ قابل ذکر ترجمے ہیں جو باقاعدگی سے رسالے ''پیام تعلیم'' میں شائع ہیں۔

بچوں کے لیے دوسری زبانوں کے ادب سے اردو ادب میں ترجمہ کا عام رواج رہا ہے۔اس سے جہاں ہمارے سرمائے ادب میں اضافہ ہوتا ہے وہیں دوسری طرف ہماری معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے۔اطہر پرویز نے دیگر زبانوں کی کہانیوں کے علاوہ ایسی مقبول عام کتب کو بھی اردو زبان کے قالب میں ڈھالا ہے جس سے اردو داں بچے خوب مستفید ہوئے ہیں۔اس ضمن میں ہمارا ذہن ،ہمارا گھرانہ ،نیا تیرتھ (راجندر اوستھی ترشت مصنف)، ہمارے بن ہماری دولت (رام چندر تیواری)،پنچ تنتر کی کہانیاں (پہلا حصہ مصنف شیوکمار) پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ اول مصنف شکنتلا دیوی)،روشنی کے مینار (جے بھکّو) فاطمہ کی بکری اور بچپن کی ساتھی' یہ کتاب ملیالم زبان میں ہے (مصنف وکیم محمد بشیر) دیس دیس کی کہانیوں اور پنچ تنتر کی کہانیاں قابل ذکر ترجمے ہیں۔

''ہمارا ذہن'' وریجا اوڈ پا کی معروف ومقبول عام کتاب ہے جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ بچوں کے ذہن کو سمجھنے کے لیے اہم کڑی ہے اس کتاب کو پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔بچوں کی سوچ وفکر کے حساب سے ان ابواب کی تقسیم کی گئی ہے تاکہ والدین اور اساتذہ بھی بچوں کے ذہن کو بہ آسانی سمجھ سکیں اور بچے خود بھی اپنی ذہنی کیفیت سے آگاہ ہوسکیں۔کتاب کے شروع میں وریجا اوڈ پا کا قول منقول کیا گیا ہے جس سے اس کتاب کو تخلیق کرنے کا مقصد صاف عیاں ہوتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''نفسیات کے علم کی مدد سے ہم نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ دوسروں کو بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔قدیم ہندوستانی اور مغربی دونوں ہی نظریوں کے مطابق نفسیات کے علم نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔یہ چھوٹی سی کتاب ان دونوں طریقوں کی بنیاد پر کم پڑھے لکھے بالغوں کے لئے لکھی گئی ہے۔''[1]

یہ کتاب بچوں کی تعلیم وتربیت میں اہم رول ادا کرتی ہے۔اور انہیں ذہنی وجسمانی طور پر ایک صحت مند انسان بنانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے کیوں کہ کسی بچے کے ذہن کو سمجھ کر ہی ہم اسے اچھی تعلیم وصحیح نہج

---

[1] ہمارا ذہن،اطہر پرویز،ترجمہ،اردو گھر،علی گڑھ،ص:۱۴

پر تربیت دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

''نیا تیرتھ'' راجنداوستھی ترشت کی مشہور کتاب ہے جس پر حکومت نے ان کو انعام بھی دیا ہے اس کتاب میں موصوف نے بھلائی کے کارخانے کی حقیقی کہانی کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ دراصل شہر ناگ پور کے پاس ہی ایک سو بہتر میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بھلائی نام کا گاؤں ہے۔ ملک آزاد ہونے کے بعد سرکار نے کسانوں سے زمین لے کر وہاں کارخانہ بنانا چاہا بعض کسانوں نے زمین دینے سے انکار کیا اور بعض نے حکومت کا ساتھ بڑھ چڑھ کر دیا۔

کسی بھی ملک کے لوگ اگر مل جل کر کام کریں تو وہ اپنے ملک کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''آدمی کیا نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرح پہاڑ کو پگھلا سکتا ہے۔ لیکن یہ کام ایک آدمی کے بس کا کام نہیں، اسے تو سب کو مل کر کرنا ہوگا۔
> یوں تو آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے لیکن آج سارے آدمی دیش کے کام آرہے ہیں اور اس کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔'' [۱]

ہمارے بن ہماری دولت'' رام چندر تیواری کی انعام یافتہ کتاب ہے اس کتاب میں موصوف نے بچوں کو پیڑوں کے فوائد اور انسانی کی زندگی میں پیڑوں کی اہمیت وافادیت پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ پیڑ پودوں کا انسانی شعبہ حیات میں بہت اہم رول رہا ہے جس سے انسان کی ضروریات زندگی جڑی ہوئی ہے۔ اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اطہر پرویز نے اس کتاب کو ۱۹۶۳ء میں اردو زبان میں ترجمہ کیا تاکہ بچے شروع سے ہی پیڑ پودوں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ان کا خیال رکھ کر اپنے ماحول کو خوشگوار بنائیں۔ اس کتاب کے شروع میں موصوف نے یشپال جین کا قول نقل کیا ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے:

> ''جنگلوں کے پیڑ پودے ہمارے کیا کام آتے ہیں اور وہ ہمارے لئے

---

۱ نیا تیرتھ، اطہر پرویز، ترجمہ، اردو گھر، علی گڑھ، ۱۹۶۳ء ص: ۶۷

کتنے ضروری ہیں ۔پیڑ پودوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کو اور بھی
بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔'' [1]

کتاب '' دیس دیس کی کہانیاں'' میں روس ، جاپان ،آئرلینڈ ، یونان ،چیکوسلوا اور ہندوستان کی کہانیاں شامل ہیں یہ کتاب عقل مندوں،ظریفوں اور بے وقوفوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے اسے اطہر پرویز نے بہت ہی احسن طریقے سے اردو زبان کے قالب میں ڈھالا یہ کہانیاں تفریحی ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلو بھی رکھتی ہیں ۔ '' جیسے کو تیسا'' ایک ہرن اور گھوڑے کی کہانی ہے جو بہت اچھے دوست ہوتے ہیں دونوں میں کسی بات پر لڑائی ہوتی ہے اور ہرن گھوڑے کو زخمی کر کے بھاگ جاتا ہے اب گھوڑا ہرن سے بدلہ لینے کی تدبیر کرتا ہے چنانچہ ایک شکاری کو ہرن کا شکار کرنے کے لیے تیار کرتا ہے بدلے میں شکاری گھوڑے سے مدد مانگتا ہے اور وہ گھوڑے کے منہ میں لگام لگاتا ہے اور اس پر سوار ہو کر ہرن کا شکار کرنے جاتا ہے شکاری کے ہاتھوں ہرن کا شکار تو ہو جاتا ہے تاہم شکاری گھوڑے کے فوائد سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا قیدی بنا لیتا ہے گھوڑا گیا تو تھا ہرن کو مصیبت میں ڈالنے مگر خود ہمیشہ کے لیے پھنس جاتا ہے۔ کہانی کے ذریعے بچوں کو یہ سبق آموز نصیحت دی گئی ہے کہ دوسروں کو نقصان و تکلیف پہنچانے سے انسان خود مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے لہذا اگر آپ کے دوستوں سے غلطی بھی ہو جائے تو معاف کر دینا چاہیے۔

'' انوکھا تحفہ'' ایک سچے ایماندار اور خدا پرست آدمی کی کہانی ہے ۔ایک روز وہ اکیلا ہی کشتی میں سوار ہو کر سمندر کی سیر کرنے نکلا کشتی ساحل سے بہت دور نکل گئی اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بالکل سنسان جگہ دیکھ کر آدمی گھبرایا اور اس نے دعا مانگی '' اے میرے پروردگار میں پانی دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہوں ۔ مجھے خشکی پر پہنچا دے'' تھوڑی ہی دیر میں اس کی کشتی آگ کے پہاڑ سے گزر کر ریت پر پہنچ کر پھنس گئی ۔ وہ آگ کو دیکھ کر گھبرایا ، وہاں اس کی ملاقات ایک فرشتے سے ہوئی اس نے آگ کو بجھا دیا اور آگ کے بجھتے ہی چاروں سمت سرسبز و شاداب نظر آنے لگا۔ اور فرشتے نے کہا:

'' یہ سب خدا کی طرف سے ہے، اب اس ملک میں آرام سے رہو، اس

---

[1] ہمارے بن ہماری دولت، اطہر پرویز ترجمہ، اردو گھر، علی گڑھ، ص:۴

زمین میں بہت میٹھاس ہے،تم اس میں میٹھی چیزیں بونا،لیکن اس بات کا
خیال رکھنا کہ تم اس زمین سے محبت کرو اس کو اپنے پسینے سے سینچنا
،تمہاری محنت اس زمین میں بہت کھاد کا کام کرے گی اور تم دیکھو گے کہ
یہ زمین سونا اگلنے لگے گی ،خدا نے تمہارے نیک کاموں کو پھل دیا ہے۔''
یہ کہ کر فرشتے نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر پھرا کہیں کیلا اگا....... کہیں
اناس، کہیں لیچی تو کہیں نولگاں، کہیں تربوز، امرود اور آم۔
بچوں جانتے ہو یہ جگہ کون سی ہے۔ یہ موریشش بحر ہند کا موتی ،چھوٹا
سا ملک ، جہاں میٹھی چیزیں پھلتی پھولتی ہیں ۔زمین کی مٹھاس لوگوں کی
زبان پر بھی آ گئی ہے ۔ یہاں مختلف نسلوں ،قومیں اور مذہبوں کے لوگ
مل جل کر رہتے ہیں ۔موریشش اس خدا پرست آدمی کو دیا ہوا خدا کا
تحفہ ہے۔بیش قیمت تحفہ، بے مثال اور بے نظیر تحفہ، ایک انوکھا تحفہ'' ؎۱

کہانی ''انوکھا تحفہ'' میں بچوں کو خدا پر یقین رکھنے اور مناظر قدرت کا مشاہدہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے انسان اگر نیک دل ہے اور اس کا ایمان مظبوط ہو تو خدا اس کی ہر حالت میں مدد کرتا ہے۔

''آئینہ کی کہانی'' جاپان کی لوک کہانی ہے۔شوشو اور شیشی میاں بیوی ہیں ۔شوشو کو ایک آئینہ کہیں پڑا ہوا ملتا ہے۔اس میں اپنی شکل دیکھ کر اسے اپنے مرحوم والد کی یاد آ جاتی ہے اور وہ رونے لگتا ہے۔ بیوی سے شوشو کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی ۔ایک دن وہی آئینہ اسے مل جاتا ہے وہ اپنی شکل دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے علاوہ کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے،شاید اسی لیے روتا ہے۔دونوں آپس میں جھگڑتے ہیں۔ چنانچہ دونوں آئینے کو ایک (مہاپرش) کے پاس لے کر جاتے ہیں جب وہ آئینہ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں اس میں نہ تو کوئی لڑکی اور نہ ہی تمہارے والد، اس میں تو کوئی مہاپرش ہیں، بالا آخر آئینہ کو کنویں میں ڈال دیا جاتا ہے اور دونوں خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

؎۱ انوکھا تحفہ، اطہر پرویز، آج کل، جنوری ۱۹۷۹ء، ص:۴

''مفت کی روٹی'' روس کی کہانی ہے۔کسان کو گیہوں سے روٹی بننے تک کے جتنے بھی مراحل سے گزرنا پڑھتا ہے ان تمام مراحل کی اطہر پرویز نے بہت ہی خوبصورت طریقے سے منظر کشی کی ہے۔دراصل ایک بھیڑیا کسان کو روٹی کھاتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے پاس جا کر بھیڑیا اس سے روٹی مانگتا ہے اسے روٹی اچھی لگتی ہے اسی لیے اسے حاصل کرنے کا طریقہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہے اور کسان اسے بہت ہی آرام سے گیہوں کے بیج کو کھیت میں بونے سے آٹا گوندھ کر روٹی بنانے تک کے تمام تر مراحل سے باخبر کرتا ہے۔ بھیڑے کو یہ طریقہ کافی مشکل معلوم ہوتا ہے پھر اسے کسان ''مفت روٹی'' حاصل کرنے کے طریقے سے بھی باخبر کرتا ہے۔تو بھیڑے کو مفت طریقہ ہی آسان معلوم ہوتا ہے اور یہی طریقہ اپناتا ہے لیکن اسے مفت روٹی کے حصول میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔کئی مقامات پر بے وقوف بنایا جاتا ہے کئی جگہوں پر پیٹا جاتا ہے اس میں بچوں کو اس حقیقت سے روشناس کیا ہے کہ بغیر محنت کے کسی بھی شے کو حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے اور جو کوئی بھی بغیر محنت کے کوئی چیز حاصل کرے گا تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو بھیڑے کا ہوا۔

''پنچ تنتر کی کہانیاں'' یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے اطہر پرویز نے اسے سادہ اور سلیس زبان میں ترجمہ کیا۔

اطہر پرویز نے ان کہانیوں کو ہندوستانی رنگ میں رنگ کر پیش کیا ہے۔ان تراجم کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ترجمہ نگاری سے بے انتہا شغف رہا ہے اسی شوق نے ان سے بہت سی اہم تصنیفات اور کہانیوں کو اردو لباس میں ملبوس کروایا ہے۔ان تراجم میں انہوں نے ایسی سادہ و رواں زبان اور بے ساختہ انداز بیان اختیار کیا کہ کہیں بھی ترجمے کا احساس نہیں ہوتا۔ان کتابوں میں کرداروں اور مقامات کے علاوہ تمام عناصر میں مقامی روح سرایت کر گئی ہے رہن سہن ،بول چال ،نشت و برخاست ،تہذیب وتمدن تمام چیزوں میں ہندوستانیت رچ بس گئی ہے یہ ترجمے کی فن کی معراج ہے۔مختصراً یہ کہ اطہر پرویز نے دیگر زبانوں کے ادب کا بہترین ترجمہ کر کے اردو ادب اطفال کے گوشۂ ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

داستانوی طرز کی تحریریں:

حکومت ہند نے اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے اکیم اپریل ۱۹۹۶ء کو ایک ادارہ قائم کیا۔ادارہ کا مرکزی دفتر دہلی میں واقع تھا۔مقاصد اردو زبان کا فروغ ،ترقی اور نشریات اردو زبان کو سائنسی اور تکنیکی

شعبوں سے جوڑنا اور دورِ جدید کے جملہ شعبوں میں اردو کے موثر کردار کو بحال کرنا تھا۔حکومت ہند کو اردو کے سلسلے میں مشورے اور ہدایات دینا اردو تعلیم ،تعلیمی ادارے ،تعلیمی ترقی ،اردو کی کتابیں تیار کرنا اور دوسری زبانوں کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کروانا تھا، کیوں کہ انسانی تہذیب کی ترقی کا تصور بھی کتابوں کے بناء ممکن نہیں لہٰذا ترقی اردو بیورو نے اس ضرورت کے تحت بچوں کی کتابیں،سائنسی علوم پر مبنی کتب،،سماجیات، تجارت ،قانون ،طب ، جغرافیہ ،تاریخ ،سیاسیات ،زراعت ،لسانیات اور دوسرے علوم کے مختلف النوع شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کیں ۔اس ادارے کے فروغ میں ملک کے بہت سے عالموں' ماہروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل رہے۔ اس ضمن میں اطہر پرویز نے'' منشی گھوڑا ،ایک نائی اور رنگساز کا قصہ'' اور ''جانوروں اور پودوں کی دنیا'' وغیرہ کتابیں اسی ادارے کے شائع کی گئیں ہیں۔

اطہر پرویز نے ادرو ادب اطفال کو سائنٹفک اسلوب کے علاوہ قدیم کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ قصوں پر مشتمل بعض کتابیں تخلیق کی ہیں ،جو مکمل داستانوی طرز تحریر میں رچی ہوئی ہیں اس طرح کی اہم کتابیں''ایک دن کا بادشاہ''ایک نائی اور رنگساز کا قصہ'' اور'' منشی گھوڑا'' ہیں لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ داستانوی رنگ کے باوجود یہ کتابیں بچوں میں سائنسی فکر کو اجاگر کرتی ہیں۔ یہ کتابیں ترقی اردو بورڈ کے زیر اہتمام منظر عام پر آئیں ہیں۔معلم پیشہ ہونے کے سبب موصوف کو بچوں کی نفسیات کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔وہ بخوبی جانتے تھے کہ روایتی لوک کتھاؤں اور قدیم داستانوں کے مطالعہ سے بچہ کس طرح محظوظ ہوتا ہے۔اور وہ خود بھی اس قدیم سرمائے ادب کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اسی نظریے کے تحت وہ ''ایک دن کے بادشاہ'' میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''بہت سے ناسمجھ ماں باپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی طرح اپنے دس سال کے کے بچوں کو سقراط اور ارسطو بنا دیں انھیں علم وحکمت کی ساری باتیں سکھا دیں۔لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ عمر تاریخ پڑھنے کی نہیں ہے زندگی کی کھردری سچائیوں سے الجھنے کی نہیں ہوتی۔اس عمر میں بچوں کو خواب دیکھنے دیجیے۔جنوں اور پریوں کے خواب ہواؤں میں اڑتے ہوئے گھوڑوں اور بولتے ہوئے پرندوں کے خواب ان کے تصور کو اس عمر میں

جتنی اڑان بھی مل سکے، اُڑنے دیجیے۔اس طرح آپ کو بچوں کو بچہ
رہنے میں مدد دیں گے۔بچوں سے ان کا بچپن چھیننا بُری بات ہے'' [۱]

ان قصوں کی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں ہندوستان، ایران، اعراق، عرب اور مصران تمام ممالکوں کی تہذیب وثقافت، رسم رواج، موجود ہیں جن کو پڑھ کر بچے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان قصے کہانیوں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے ہیرو اکثر و بیشتر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں ان کردوراں کی یہ مستقل مزاجی دیکھ کر بچے مایوسی اور ناکامی کا شکار ہونے سے بچتے ہیں اوران کو پڑھ کر زندگی میں جدوجہد کرنا سیکھتے ہیں۔اور جب یہ کردار اپنے مقصد کو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو بچے بھی ان کی کامیابی سے خوش ہوتے ہیں۔''ایک دن کا بادشاہ'' میں انہوں نے شروع میں ''دو باتیں'' کے عنوان سے الف لیلیٰ کی روایتی قصے کہانیوں کی اہمیت وافادیت پر مختصر گفتگو کی ہے۔کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ان قصوں میں خواب تو ملیں گے، لیکن ان میں زندگی کی بڑی بڑی حقیقتیں بھی نظر آئیں گی۔ان کے ذریعہ ہم زندگی میں جدوجہد کرنا سیکھتے ہیں۔یہ مایوسی اور ناکامی کے برخلاف عمل پر زور دیتی ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اگر انسان اپنی دُھن کا پکا ہوتو اس کے راستے کا ہر روڑا اپنے آپ ہٹ جاتا ہے ہوئیں، اس کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتی ہیں، سمندروں میں اس کے لیے راستے بن جاتے ہیں اسی انسان کو جنگلی جانور تک راستہ دکھاتے ہیں اور زمین اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتی ہے۔ان داستانوں کے ذریعے بچے سچائی سے آشنا ہوتے ہیں وہ درد مندی سیکھتے ہیں۔پریوں کا حسن' اُن کے اندر خوبصورتی کا اعلیٰ ترین معیار پیش کرتا ہے۔'' [۲]

---

[۱] اطہر پرویز، ایک دن کا بادشاہ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص: ۸

[۲] ایک دن کا بادشاہ، اطہر پرویز، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن دسمبر ۱۹۸۶ء ص: ۹/۸

''ایک دن کا بادشاہ'' ۲۵۱صفحات پر مشتمل قدیم داستانوی طرز پر لکھی گئی ہے ترقی اردو بیور، نئی دہلی سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ اطہر پرویز نے اس کتاب کو اردو میں تحریر کرنے کے لیے انگریزی اور فارسی کی قدیم داستانوی کتابوں کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ اور کتاب کے شروع میں ان ماخذ کا بھی ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔ اس حوالے سے کتاب کے صفحہ نمبر ۹ پر وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے ان قصوں کو اردو کا لباس پہنانے میں انگریزی کی کتاب

The Thousand Nights and one Night

by power MATHERS کی چاروں جلدوں سے مدد لی ہے

اور فارسی کی ''ہزارویکشب'' برابر میرے سامنے رہا ہے'' [۱]

مذکورہ کتاب تینوں قصوں ''ایک دن کا بادشاہ'' علی بابا چالیس چور'' اور حسن بصری اور پریوں کا قصہ پر مشتمل ہے۔ لیکن بیچ میں چھوٹے چھوٹے کئی ضمنی قصے شامل ہیں جو ان تین قصوں کو مکمل کرتے ہیں۔

''ایک نائی اور رنگساز کا قصّہ'' بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس میں کل تین کہانیاں شامل ہیں اول ذکر'' الہ دین کا چراغ '' اور دوسرا '' قصّہ ہارون رشید'' یہ کتاب ۱۵۲صفحات پر مشتمل ۱۸۹۸ء کو ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

''مشینی گھوڑ'' اطہر پرویز کی تخیلاتی نوعیت کی کتاب ہے جو ۱۴۴صفحات پر مشتمل ترقی اردو بیورو نئی دہلی سے ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی ہے اس کتاب میں چار کہانیاں الگ الگ عنوان سے اطہر پرویز نے ننھے قارئین کے نام کی ہیں ''مشینی گھوڑا'' ''ایک موچی کے بادشاہ ہونے کا قصہ'' سند باد جہازی'' اور گاتا ہوا پیڑ اور سنہرا پانی 'ہیں کتاب کے پہلا قصہ یعنی مشینی گھوڑا'' کو مکمل داستانوی طرز پر تحریر کیا گیا ہے۔ مشینی گھوڑا میں بظاہر اردو کی قدیم داستانوں کی طرح ہی مافوق الفطرت واقعات اور تخیل کی کارفرمائی سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کے پس پشت بچوں میں سائنسی شعور کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ دورِ جدید میں بچہ مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کی بہ نسبت نئی نئی ایجادات اور خلائی معلومات میں زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے اب وہ بے بنیاد باتوں پر یقین کرنے پر آمادہ نہیں ہے سائنسی تحریریں جہاں بچوں کو جدید سائنسی معلومات فراہم

---

[۱] ایک دن کا بادشاہ، اطہر پرویز، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن دسمبر ۱۹۸۶ء، ص:۹

کرتی ہے وہیں انہیں خلائی مہمات، سیر و سیاحت اور اس نوع کے دلچسپ موضوعات پر تازہ بہ تازہ معلومات بھی فراہم کرتی ہیں تخیلاتی اڑن کھٹولہ اب پرانی چیز ہوگئی ہے اب بچے خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔کہانی ''مشینی گھوڑا'' کا آغاز ایک کاریگر کے بنائے ہوئے مشینی گھوڑے سے ہوتا ہے۔ کاریگر گھوڑے کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور اس کی خوبیوں کا بھی ذکر کرتا ہے کاریگر گھوڑے کا تعارف ان الفاظ میں کرواتا ہے کہ:

> ''کاریگر نے کہا۔'' عالیجاہ! آپ کا بول بالا ہو یہ گھوڑا لکڑی کا تو ہے لیکن یہ معمولی گھوڑا نہیں ہے۔اس کے اندر ایک مشین لگی ہوئی ہے، جس میں چھوٹے بڑے نہ جانے کتنے کل پُرزے لگے ہیں کہ ان کو چھونے سے گھوڑا ہوا میں اُڑنے لگتا ہے، اور پل بھر میں سوار کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے'' [۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازا ہوتا ہے کہ موصوف نے بچوں کو نئے زمانے کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے بچوں میں سائنسی (ایجاد سے واقف کروانا) فکر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کیوں کہ پہلے کی کہانیوں میں گھوڑا جن یا جادو کی مدد سے چلتا تھا لیکن یہاں موصوف نے مشین کا لفظ استعمال کر کے یہ بارو کرایا ہے کہ اب انسان نے کافی ترقی کر لی ہے گھوڑے کو ہوا میں اُڑنے کے لیے جن یا جادو کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اب انسان گھوڑے کو ہوا میں اُڑانے کا ہنر جانتا ہے۔

کاریگر اس گھوڑے کے بدلے میں بادشاہ سے شہزادی کا ہاتھ مانگتا ہے یہ سن کر بادشاہ اور شہزادہ دونوں بہت خفا ہوتے ہیں، لیکن بادشاہ چوں کہ مشینی گھوڑے کے فائدے سے بخوبی واقف تھا اسی لیے شہزادے کو سمجھا کر یہ حکم دیتے ہیں کہ گھوڑے کی سواری کر کے تجربہ کرلیں شہزادہ مشینی گھوڑے کو لے کر اُڑتا ہے لیکن گھوڑے کو واپس زمین پر اتارنے کا طریقہ اسے نہیں معلوم شہزادے کی بے چینی کا ذکر اطہر پرویز نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اس نے گھبرا کر گھوڑے کے پر ہاتھ چلانا شروع کر دیا اچانک اس کا

---

[۱] مشینی گھوڑا، اطہر پرویز، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی تیسرا ایڈیشن، ۱۹۹۲، ص: ۷

ہاتھ گھوڑے کے کان کے نیچے ایک بٹن پر پڑا۔شہزادے نے جو اس بٹن کو گھمایا تو گھوڑا پہلے تو آہستہ ہوا پھر اک بار رکا اور نیچے کی طرف اُڑنے لگا، اب وہ اور نیچے اور نیچے آتا جا رہا تھا۔ دیکھنے کے لیے وہ اس گھوڑے کو صحیح طور پر چلا سکتا ہے، اس نے پہلے بٹن دبایا اب یہ گھوڑا آہستہ ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بار رک کر پھر اوپر چلنے لگا۔ب تو شہزادے کی سمجھ میں آ گیا کہ کس طرح اس کو چلانا ہے'' [۱]

کہانی میں آگے شہزادے کو بنگال کی شہزادی سے عشق ہوتا ہے اور کاریگر شہزادے سے تعصب کی بناء پر شہزادی کو دھوکے سے دوسرے ملک لے کر جاتا ہے لیکن پھر شہزادہ بہت کوششوں کے بعد شہزادی کو واپس لے کر آتا ہے پھر دونوں کی شادی اور شہزادے کے ساتھ شہزادی کی اپنے ملک واپسی کے دلچسپ واقعات قلم بند کے گئے ہیں اس کہانی کا خمیر ایرانی قصوں سے تیار کیا گیا ہے۔سائنسی ترقی کو کہانی کے پیکر میں بیان کرنے کا ہنر اطہر پرویز کو خوب آتا تھا۔کہانی ایک موچی کے بادشاہ ہونے کا قصہ'' میں موصوف نے بچوں کو صبر کرنے کی تلقین کی ہے کیوں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے جیسا کہ معروف موچی کو ملا۔

ڈرامے:

اطہر پرویز نے کہانیاں، مضامین اور سائنسی کتابوں کے علاوہ بچوں کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں ان ڈراموں میں بچوں کی افتادہ طبع اور فطری رجحانات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔اور بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے مکالمے پیش کیے گے ہیں جو آسان اور عام فہم ہیں انہوں نے اپنے ڈراموں میں ماورائی اور تخیلی باتیں کرنے کے بجائے روز مرہ کے مسائل اور سائنسی دانوں کی کاوشوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔لیکن وہ اتنی خوبصورتی سے واقعات کا تانا بانا بنتے ہیں کہ کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔''گلیلی گلیلیو''، ''شرابی'' ''چراغ سے چراغ جلتا ہے'' اور ''محلے کی ہولی'' یہ ڈرامے ان کی فنی کمالات کا بہترین ثبوت دیتے ہیں۔

---

[۱] مشینی گھوڑا، اطہر پرویز، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی تیسرا ایڈیشن، ۱۹۹۲، ص:۹

''گلیلی گلیلیو'' اطہر پرویز کا بہت مقبول سائنسی نوعیت کا ڈرامہ ہے۔اس ڈرامے میں فرسودہ عقائد اور توہم پرستی پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔گلیلیو ایک اطالوی ماہر فلکیات اور مشہور فلسفی تھے۔انہوں نے سائنسی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے وہ شاقول اور دربین کے نامور موجد ہیں گلیلیو انے اشیاء کی حرکات ،دربین ،فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں ۔انہیں جدید طبیعیات کا فادر (باپ) کہا جاتا ہے مذکورہ ڈرامہ میں موصوف نے انہی مشہور سائنس دان گلیلی گلیلیو کے نظریے اور کاوشوں سے بچوں کو آگاہ کیا ہے کہ سائنس داں کس طرح کڑی محنت کے بعد پرانے نظریے کورد کرتے ہوئے دنیا والوں کو نئی سوچ سے آگاہ کرتے ہیں جیسا کہ گلیلیو نے کیا دراصل صدیوں سے یہی تصور عام تھا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے لیکن سترھویں صدی میں گلیلیو نے یہ ثابت کر دیا کہ سورج نہیں بلکہ زمین ہی سورج کے چاروں طرف گردش کرتی رہتی ہے۔لیکن ان کی یہ نئی تلاش قدامت پسندوں کے لیے عقیدہ شکنی کا سبب بنی وہ عتاب کا شکار ہوا اور انہیں اپنے نظریے کی تبلیغ کرنے سے منع کر دیا گیا۔

موصوف کا یہ ڈرامہ ''گلیلی گلیلیو'' اردو سائنسی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔موصوف نے پرانی تکنیک کا استعمال کر کے اردو ڈراموں میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔اصل میں سنسکرت ڈراموں میں نٹی اور سوتر دھار کردارں سے کام لیا جاتا تھا اور ان کرداروں کی خوبی یہ تھی کہ ایسی بہت سی باتیں جنہیں ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کرتے وقت بیان کرنا مشکل ہوتا تھا یہ کردار راوی کی طرح ان باتوں کو اپنی گفتگو کے ذریعے بیان کر دیتے تھے مذکورہ ڈرامہ ایک ہی ایکٹ پر مبنی ہے گرچہ اس میں دو منظر ہے لیکن موصوف نے اسی پرانی تکنیک کا استعمال کر کے ڈرامے کو ایک ہی منظر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور یہی ڈرامے کی خاصیت ہے۔ مثال کے طور پر ایک منظر پیش ہے:

> ''نٹی: تو کیا ہر منظر دکھانے کے لیے تمہارے واسطے الگ الگ اسٹیج لانا پڑے گا؟ لو میں ابھی ٹھیک کیے دیتی ہوں (اسٹیج سیٹ کرنے کرنے لگتی ہے)لو یہ بازار ہو گیا۔جب عدالت کا منظر آئے گا تو بڑھئی کی دکان سے یہ میز کرسی اٹھالیں گے اور یہ سامنے والی دکان کا تخت عدالت کے لیے بچھا دیں گے۔

سوتر:.......اور یہ بازار!

نٹی: تو پھر کیا ان کے لیے بازار سے بازار لانا پڑے گا۔ ارے بھئی ہم ڈرامہ ہی تو کر رہے ہیں، نقل ہے اصل تھوڑا ہی ہے۔ تم سارا بازار اٹھا کر لے آؤ تو بھی وہ بازار اسٹیج کا بازار ہوگا۔'' [۱]

ڈرامے کے شروع میں دونوں کرداروں کی آپسی نوک جھوک کو موصوف نے بہت ہی دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کیا ہے زمان ومکان کا خیال بھی رکھا ہے۔ روم میں سولہویں صدی عیسوی کے آواخر میں جب وہاں پوپ کی مذہبی بالا دستی عروج پر تھی۔ اس وقت اس طرح کے واقعوں نے جنم لیا جن کا ذکر اس ڈرامے میں بھی کیا گیا ہے جیسا کہ ڈرامے کی ابتداء میں ہی ڈھنڈورچی کے اعلان سے ہی قائین کے ذہن کو ان واقعات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

''ڈھنڈورچی: (بھاری آواز میں) جنت کا ٹکٹ خرید لو جنت کے شہر یوں، جنت کا ٹکٹ لو، پر جارا جا کہ، عرش خدا کا فرش پوپ کی پادری کا اور پوپ عرش سے ادھر خدا کا نائب اور اس قادر مطلق کا قائم مقام فرش زمین کا مالک عرش پر خدا کا قانون چلتا ہے، فرش پر پوپ پادری کا۔ جنت کا ٹکٹ لو جنت کا، ہر درجے کا ٹکٹ پوپ کے دفتر سے ملتا ہے۔'' [۲]

دراصل گلیلیو نے جس دور میں سائنسی تجربات کرنے شروع کیے تھے اس وقت پوپ کے مطلق العنانی کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کر سکتا تھا اس وقت روم میں رجعت پسندی عام ہو چکی تھی یہاں تک کہ جب کبھی پروفیسر اور آرٹسٹ نئی سائنسی معلومات پر محو گفتگو کسی عام شاہراہ پر نظر آتے، تو قانون کے سپاہی انہیں مجرم ٹھہراتے ہوئے گرفتار کرنے کی دھمکی دیتے تھے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے پروفیسر صلاح صفائی پیش کرتا ہوا کہتا ہے کہ:

''پروفیسر: میں تو کہتا ہوں کہ سورج گھومتا ہے، زمین اپنی جگہ پر قائم ہے،

---

[۱] گلیلی گلیلیو، اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ، ۱۹۵۸ء ص، ۱۷/۱۸

[۲] گلیلی گلیلیو، اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ، ۱۹۵۸ء، ص ۲۲/۳۲

میں بھلا ایسی باتیں کیوں کہنے لگا آخر مجھے تو خدا کو منہ دکھانا ہے۔ بائیبل
میں لکھا ہے کہ گھومتا ہے بس یہی سچ ہوگا۔ زمین کے گھومنے کے بارے
میں گلیلیو کہتا ہے۔'' [1]

ڈرامے میں گلیلیو کی ایجاد کردہ دوربین کے بارے میں بھرپور معلومات دی گئی ہے اسی دوربین کی بدولت انسان چاند کی مختلف شکلوں سے واقف ہو پایا ہے۔ بچوں کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ زمین ہی سورج کے چاروں اطراف کا طواف کرتی ہے۔ ڈرامے کی زبان عام فہم سادہ و سلیس ہے یہ ایک طویل ڈرامہ ہے لیکن پیشکش کے دلکش انداز بیان طوالت کا مطلق احساس نہیں ہونے دیتا۔

''محلے کی ہولی'' ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور آپسی بھائی چارے کا پیغام دیتی ہے۔ اس ڈرامے میں پانچ سین ہیں اس ڈرامے میں ہندوستان کی سماجی زندگی کو دیکھایا گیا ہے۔ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جہاں ہر مذہب وملت سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بچوں اور نوجوانوں کو شروع سے ہی مذہبی رواداری، حب الوطنی، انسانی مساوات اور انسان دوستی کی تعلیم دینی چاہیے تا کہ وہ بڑے ہو کر ایک خوبصورت معاشرہ تشکیل دے سکے۔

اطہر پرویز کا ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' اس نوع کی بہترین مثال ہے۔

''لالہ جی: (اندر سے نکلتے ہوئے) ارے بھائی کس کی آواز آرہی ہے۔ کہیں خالدہ تو نہیں؟
خالدہ کی امی: ہاں آپ کا ہی ذکر تھا۔ آپ کی بڑی عمر ہو۔ ابھی خالدہ آپ کو یاد کررہی تھی۔
خالدہ: چچا! میں سوئیٹر کا ناپ دیکھنے آئی ہوں۔ (خالدہ سویٹر کے ایک پلے کو لالہ جی کے پاس آکر ناپتی ہے)
لالہ جی: ارے بیٹی! یہ کیا کررہی ہو ہم روئی کا بنڈی پہننے والے ہیں۔
خالدہ: کل سے آپ روئی کی بنڈی نہیں پہنیں گے۔
لالہ جی کی بیوی: ارے جس کی بھتیجی اتنا اچھا سویٹر بنتی ہو وہ پھر روئی کی بنڈی کیوں پہنے۔

---

[1] گلیلی گلیلو، اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ ۱۹۵۸ء، ص ۳۲/۳۳

خالدہ کی امی: اور کیا! بڑے شوق سے بن رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ اسی رنگ کا ابا کا سوئیٹر بنوں گی، تاکہ دونوں بھائیوں کے سویٹر ایک رنگ کے ہو جائیں۔'' [۱]

اطہر پرویز کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ کوئی بھی ملک وقوم بغیر یکجہتی کے امن وسکون کی توقع نہیں رکھ سکتا اسی لیے بچوں کو میل ملاپ، اتحاد واتفاق، باہمی محبت کا پیغام دیتے ہوئے بذلہ سنجی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مزاج میں بچوں کی سی تازگی قائم رکھنے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ بچوں کے دوست بن کر ان کو اخلاقی وادبی تربیت دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اطہر پرویز نے بچوں کے لیے جو ڈرامے تخلیق کیے ہیں ان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب، عادات واطوار، اچھی عادتوں کی تعلیم دی ہے واقعات کی پیشکش میں بچوں کی دلچسپیوں، نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی رجحانات کا خاص خیال رکھا ہے۔ (ان کے ڈراموں کی زبان آسان اور عام فہم زبان جو بچوں کی اپنی زبان الفاظ کا برمحل استعمال مع صحیح تلفظ کے بچوں کو ہنسانے اور گدگدی پیدا کرنے والے الفاظ، ہنسی مذاق سے بھرے چٹکلے بھی شامل ہیں۔) جس سے ان کے ڈراموں کی تاثیر اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ڈرامے فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے مزاج، رجحانات طبع، دلچسپی احساس اور جذبات کے بڑے نباض ہیں۔

متفرق ادبی تحریریں:

ہر معاشرے کی اپنی تہذیب وتمدن ہے اور وہی تہذیب وتمدن اس معاشرے کے لوگوں کی پہچان بنتا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہندوستان میں وقتاً فوقتاً مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آتے رہے ہیں اور یہاں کے تہذیبی گلستان کو اپنے رنگ برنگی ثقافتی پھولوں سے اس گلستان کو بھرتے چلے گئے ہیں جن میں موہن جوداڑو اور ہڑپا کی قدیم تہذیب، اجنتا اور ایلورا کی خوبصورت نقاشی کے نشانات اور عظیم مغلیہ سلطنت کی عالی شان عمارتوں کی خوبصورتی چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ یہ ملک صدیوں سے اپنے چمن کو سیراب کرتا رہا ہے اور آگے بھی کرتا رہے گا۔

---

[۱] اردو کی گیارھویں کتاب، دی جموں وکشمیر سٹیٹ بورڈ آف سکول ایجوکیشن، ص: ۹۰

اطہر پرویز کو اپنے ملک ہندوستان سے بہت محبت تھی انہوں نے اپنی بعض تحریروں میں ہندوستان کی تہذیب یہاں کے قدرتی مناظر کو بہت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے آزادی کے بعد ہندوستان کی جمہوریت ایکتا اور امن کی حمایت اپنے قلم سے برابر کرتے رہے ہیں۔اس حوالے سے انہوں نے ''ہمارا ہندوستان'' لکھ کر بچوں کو ہندوستان کی ہزاروں سالوں کی تہذیب وتمدن کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے مذکورہ بالا کتاب ۱۱۶ صفحات پر مشتمل مقبول عام کتاب ہے۔اس کتاب پر وزرات تعلیمات حکومت ہند نے اطہر پرویز کو بچوں کے ادب کا اردو انعام بھی عطا کیا۔یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں اردو علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔انہوں نے کتاب کو الگ الگ عنوان سے گیارہ اسباق میں منقسم کیا ہے جو کہ اس طرح ہیں ''یہ دیس ہمارا ہے'' ''بھارت بھومی'' ''تہذیبوں کا سنگم'' ''آزادی کی لڑائی'' ''دیس کی دولت'' ''آزادی کے بعد جمہوریت کے راستے پر'' ''ہمارے دیس کا آئین'' ''منصوبہ بندی ایک ہی راستہ'' ''قومی یکتا'' ''ہماری خارجہ پالیسی'' ہیں۔

ہندوستان کی تہذیب کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''گویا وادی سندھ کی تہذیب سے لیکر جدید مغربی تہذیب تک ہر ایک نے ہندوستان کے نقشے پر اپنی چھاپ اس طرح چھوڑی کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم جتنے پرانے ہیں، اتنے نئے بھی ہیں اچھی بات چاہے کسی کی بھی ہو، ہم اس کو اپناتے ہیں۔ہم نے مغرب کی صنعتی تہذیب سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ہندوستانی تہذیب کوئی اکیلی تہذیب نہیں ہے۔یہ بہت سی تہذیبوں کا سنگم ہے اور یہی ہندوستانی تاریخ کا دین ہے''[۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ انہوں نے بچوں کو ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کا تعارف کرواتے ہوئے بچوں کو باہمی یگانگت، اتحاد واتفاق اور قومی یکجہتی کی تعلیم سے بہرہ ور کیا ہے۔

اطہر پرویز کی تحریریں میں جہاں معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہیں وہیں انہوں نے بچوں کو ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اور اپنے ملک کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف کروایا ہے۔کتاب میں جگہ جگہ پر بچوں کی دلچسپی کے پیش نظر تاج محل، اکبر اعظم، وادی سند کی قدیم تہذیب کے زیورات، انسانوں کے بت، ان کی مہر

۱؎ ہمارا ہندوستان، اطہر پرویز، اردو علی گڑھ، پہلی اشاعت ۱۹۶۸ء، ص ۲۹/۳۰

اوراشوک کی لاٹ وغیرہ کی تصویریں بھی دیکھائی گئی ہیں تاکہ وہ ہندوستان کی پرانی تہذیب سے بھی واقفیت حاصل کریں اوران کی دلچسپی بھی قائم رہے۔

اطہر پرویز نے بچوں کی ہر نہج پر تربیت کی کوشش کی ہے۔ان کی تحریریں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور شگفتگی سے بھر پور ہوتی ہیں انہوں نے بچوں کی نفسیاتی ضرورت ،دلچسپی اور ذہنی استعداد کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تخلیقات تحریر کیں۔انھیں اپنے ماضی سے شدید محبت ہے خاص طور پر اس تہذیب سے جسے وہ اپنے اسلاف کا روشہ سمجھ کر نئی نسل تک پہنچنا چاہتے تھے اس حوالے سے انہوں نے سوانح عمریاں اور خاکے بھی بچوں کے لیے تخلیق کیے ہیں۔اور اس میں انہوں نے اعتدال کو برقرار رکھا ہے بعض مذہبی عظیم شخصیتوں سے متعلق واقعات کو کہانی کی شکل میں بچوں کی سیرت سازی کی غرض سے پیش کی ہیں۔جن میں شامل حضرت علی کا انصاف، باپو کے قدموں میں،انمول رتن، بچوں کے اقبال، بچوں کے نظیر، بچوں کے حالی، ادب کسے کہتے ہیں،ادب کا مطالعہ، محمد شفیع الدین نیّر اور جونپور کا قاضی'' وغیرہ ہیں''جونپور کا قاضی'' یہ ہندوستان کی لوک کہانی ہے یہ ایک بیوقوف کی کہانی ہے جو اپنے گدھے کو انسان بنانے کے لیے کوشاں ہے اور اس کام کے لیے وہ مولوی صاحب کو پیسے بھی دیتا ہے لیکن جب گدھا انسان بنتا ہے تو پھر اسے اپنی اصل پر لانے کے لیے دوبارہ مولوی صاحب کو پیسے دیتا ہے مولوی صاحب بخوشی معاوضہ قبول کرتے ہیں۔

کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائنسی،علمی اور ادبی کتب تحریر کی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کا ترجمے شائع کیے جائیں۔یہ زبان کی ترقی اور قوموں کی معاشی، سماجی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔اردو اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتب،ادب اطفال، لغات اور سائنسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے اسی کمی کو پرُ کرنے اور اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے حکومت ہند نے ترقی اردو بورڈ قائم کیا جس کے تحت ''ادب کسے کہتے ہیں'' یہ کتاب ترقی اردو بورڈ،نئی دہلی کی جانب سے ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آئی۔اور اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔یہ کتاب ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔اطہر پرویز نے اکثر ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔جن پر اس سے پہلے نہیں لکھا گیا تھا۔ادب کسے کہتے ہیں اس موضوع کے حوالے سے بھی بچوں کے لیے الگ سے نہیں لکھا گیا۔بلکہ بڑوں کے لیے جو کتاب لکھیں گئیں ہیں ان سے ہی ادب اطفال میں بھی کام لیا جارہا تھا۔لیکن انہوں نے سادہ موضوع کی نزاکت کی

مناسبت سے سادہ وعافہم انداز میں یہ کتاب تحریر کی تا کہ بچے آسانی سے اس موضوع سے واقفیت حاصل کر سکیں۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو محض کہانیاں ہی نہ سنائیں بلکہ انھیں ادبی طریق کار سے روشناس بھی کریں۔ اس طرح انھیں اپنے ادب کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ اس سے زیادہ لطف لے سکیں گے۔'' [۱]

''شفیع الدین نیّر'' یہ کتاب اطہر پرویز نے بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیّر کے بارے میں لکھی ہے۔جس کی مطالعے سے بچے شفیع الدین کو قریب سے جانتے ہیں۔ یہ کتاب ۸۳صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

''ادب کا مطالعہ'' زیر نظر کتاب کے موضوع کو سہل اور آسان طریقے پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ادق مسلئے کو آسان مثال سے واضح کر دینا، اس کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔

''انمول رتن'' اطہر پریز کی مشہور زمانہ انعام یافتہ کتاب ہے۔ ۹۷صفحات پر مشتمل اردو گھر علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جواہر لال نہرو کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان کی پرانی ڈھائی سوسالہ تاریخ سے لیے کر تقسیم ہند تک کے کوائف سے بچوں کو باخبر کیا ہے تا کہ وہ اپنی پرانی تہذیبی، سماجی، سیاسی اور تاریخی حالات سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔

''اردو کی پہلی کتاب'' میں اطہر پرویز نے بچوں کو حروف تہجی کی مختلف اشکال کے حوالے سے بچوں کو معلومات دی ہے تا کہ وہ اردو زبان کی بنیادی تعلیم سے آگاہ ہوسکیں اس کے علاوہ اردو زبان کے صحیح تلفظ، لفظوں کی ساخت، لفظوں کو جوڑنا وغیرہ کے بارے میں بچوں کو مشق کروائی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۳ء ٹکسٹ بک سنٹر، اردو گھر علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔

---

[۱] اطہر پرویز، ادب کسے کہتے ہیں، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ص:۵

استاد کی کتاب (برائے اردو کی پہلی کتاب) میں اطہر پرویز نے پڑھانے کے نئے طریقوں اور تعلیم کے مختلف اصولوں سے بحث کی ہے اور اُستاد کی کتاب برائے اردو کی دوسری کتاب'' میں اطہر پرویز نے تعلیمی وتدریسی مسائل زیر بحث رہے ہیں اس ضمن میں انہوں نے کچھ اپنے ذاتی تجربوں اور بعض ماہرین تعلیم کے تجربوں سے فائدا اخذ کیا ہے تا کہ اساتذ نئے اصولول کے تحت بچوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ان کو تعلیم دے سکے۔ دراصل موصوف ایجوکیشنل آفیسر کے عہدے پر فائز تھے کئی بار حکومت نے انہیں مورلیشش بھی بھیجا۔ مورلیشش کے دران قیام انہوں کی وہاں کے طلباء اور اساتذ کی ضرورتوں کو محسوس کیا اور حل کے طور پر یہ کتاب تحریر کی تا کہ بچے اور مدرس دونوں فائدہ اٹھا سکے۔ اصل میں وہاں اردو مادری زبان کا درجہ نہیں رکھتی اسی لیے وہاں طلباء اور اساتذ اردو کے تعلیم وتدریس کے دروان زیادہ مسائل درپیش آتے ہیں اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مورلیشش میں اُردو تعلیم کے لئے ہم کسی ایک طریقے کو اختیار نہیں کر سکتے۔ ہمیں ایک ساتھ بہت سے طریقوں پر عمل کرنا ہوگا اور پھر اُستاد کو اپنے تجربوں اور اپنے بچوں کی نفسیات کے پیش نظر اپنے اصول خود بھی وضع کرنے ہوں گے'' [1]

اردو زبان میں درسی کتب اور معیاری کتابوں کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے زیر اہتمام مخصوص منصوبے کے تحت بعض پروجیکٹس کا انعقاد کیا گیا تا کہ اسکولوں کے لیے اردو کی نصابی کتابیں آسانی سے فراہم ہوسکیں۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو چیرمین کے عہدے پر فائز کیا گیا اور ان کے ماتحت ایک اعلیٰ اردو کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اردو کمیٹی کے ممبران میں پروفیسر ثریا حسین، شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر حامدی کشمیری، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اور ڈاکٹر ابوذر عثمانی ڈاکٹر محمد صابرین سکریٹری تھے۔ ان اشخاص نے اردو کی نئی کتاب'' کو تیار کرنے کے لیے کئی روکشاپ منعقد کیں۔

اطہر پرویز نے دوسرے مؤلفین کے تعاون سے ''اردو کی نئی کتاب'' چھٹی جماعت کے لیے ترتیب

---

[1] استاد کی کتاب (برائے اُردو کی دوسری کتاب)، اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ، ۱۹۷۳ء ص: ۷

دی۔ان کتابوں کی تدوین وترتیب کا اہم مقصد یہ تھا کہ طلباء کوزبان کی اہمیت سے واقفیت کے علاوہ اس سے محبت کا جذبہ پیدا ہوسکے۔اور بچوں کواردوزبان کی بنیادی معلومات حاصل ہوجائے اس کتاب میں نثری و شعری اسباق کے انتخابات اسی مقصد کونظر میں رکھ کر کیے گئے تھے تا کہ بچوں کوصحت تلفظ ،جملوں کی ساخت ،بنیادی لفظوں کے معنی ،مطالب کوسمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے جوزبان کا بنیادی حق ہے۔ان مؤلفین نے تقریباً اردوادب کی ہراصناف کوشامل کیا ہےاور ہرسبق کے آخر میں سوال جواب ،الفاظ کو جوڑنے ،مشکل الفاظ کے معنی ،الفاظ کوجملوں میں ترتیب دینااس طرح کی کئی مشقیں دی گئیں ہیں جن کی مشق سے بچوں کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہےاوروہ معیاری اردوبولنا، پڑھنااورلکھنا سیکھتے ہیں۔

انتخابات:

اطہر پرویز نے اردو کے کلاسیکی سرمائے ادب کوبچوں کی ضرورت کے پیش نظرآسان وسہل اورعام فہم زبان میں ازسرنوترتیب دیا ہے۔انہوں نے اردو کے نامورادیبوں وشعراء کے سوانحی حالات اوران کی نظموں، کہانیوں سے بچوں کوواقف کروایا ہےاس ضمن میں''بچوں کے اقبال'' ''بچوں کے حالی'' ''بچوں کے نظیر'' ''فسانہ عجائب'' ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' ''کرشن چندراوران کے افسانے'' ''منٹو کے نمائندہ افسانے'' ''راجندرسنگھ بیدی اوران کے افسانے'' ''اردو کے تیرہ افسانے'' ''خلا کا سفر'' ''قصہ حاتم طائی'' ''بچوں کی معلومات'' ''اکبراور بیربل'' وغیرہ کتابیں شامل ہیں۔

اورچکبست وغیرہ کی دلچسپ اورآسان نظموں کوازسرنوترتیب دے کرننھے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہےتا کہ بچے باآسانی ان نظموں کا کامطالعہ کرسکیں اوران سے مستفید ہوسکیں کیوں کہ ان شعراء نے بڑوں کےادب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کوبھی اپنی توجہ کا مرکز بنایااورادب اطفال میں اپنی پیش قیمت نظموں کی پیشکش سے پیش بہا اضافہ کیا ہےان شعرواء کوبچوں کے مستقبل سے غیرمعمولی دلچسپی تھی بچوں کی صحیح نہج پر تربیت اورصحیح ذہن سازی ان کا خاص مطمح نظر رہا تھا۔اس حوالے سےاطہر پرویز نے بچوں کے نظیر،بچوں کے حالی،بچوں کے اقبال،بچوں کے اسماعیل،بچوں کے چکبست وغیرہ کتابیں ترتیب دی ہیں۔

بچوں کے حالی:

یہ انتخاب ۴۹صفحات پر مشتمل ہے۔اطہر پرویز نے یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں مرتب کی اور اردو گھر علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔زیر نظر کتاب میں خواجہ الطاف حسین حالی کی بچوں کے لیے دلچسپ نظموں اور بچوں کے مستقبل سے ان کی دلچسپی کو اجاگر کیا گیا ہے۔بچوں کے لیے حالی نے بہت کچھ لکھا۔انہیں پڑھ کر بچے اپنے بچپن سے ہی حالی کو اپنا رہبر سمجھنے لگتے ہیں۔اس کتاب میں بچوں کے لیے آسان نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر بچے نہ صرف اپنے مقصد حیات کو سمجھیں گے بلکہ بڑا ہوکر ان میں کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔

تصنیفی روایت کے مطابق مجموعے کی ابتدا حمد باری سے ہوئی ہے اور اس کے بعد نعت پاک ہے۔ آگے مختلف عناوین کے تحت بچوں کی دلچسپی نظمیں کہی گئی ہیں۔جنہیں پڑھنا بچے خوب پسند کرتے ہیں۔حالی کی بہت سی تصانیف ہیں۔وہ ایک سچے شاعر تھے، وہ جو کچھ محسوس کرتے ،وہی کہتے۔وہ پرانے ہونے کے باوجود نئے خیالات اور نئی چیزوں سے نفرت نہیں کرتے تھے۔انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے ترانے گائے بچوں کی تربیت اور صحیح ذہن سازی ان کا خاص مطمح نظر تھا۔

کتاب کے شروع میں انہوں نے حالی کی شخصیت اور عملی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔(تاکہ بچے انہیں پڑھ کر ان کے خیالات سے واقف ہوسکے) اس کے بعد حالی نے جو نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں ان کو شامل کیا گیا ہے اس انتخاب میں حالی کی پندرہ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔جن کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔ حمد

۲۔ پیارے نبیؐ

۳۔ دینا کے مالک

۴۔ مٹی کا دیا

۵۔ لاڈلا بیٹا

۶۔ حبّ وطن

۷۔ قومی ہمدردی

۸ - گرمی کا زمانہ

۹- اچھّی عادتیں

۱۰- کہنا بڑوں کا مانو

۱۱- برسات

۱۲- رحم وانصاف

۱۳- دیس کی یاد

۱۴- علم کی ضرورت

۱۵- میں بڑا ہوں گا تو اماں جان

آخر میں ایک مختصر سی فرہنگ بھی تیار کی گئی ہے۔تا کہ بچے مشکل لفظوں کے معنی آسانی سے تلاش کر سکیں۔

بچوں کے نظیر:

نظیر اکبر آبادی کی شاعری اپنی ایک علیحدہ دنیا رکھتی ہے ۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو شدت سے محسوس کرتے اورغور وفکر کے بعد سے اپنی شاعری میں سمو دیتے اور اپنی شاعری کا موضوع بھی انہیں مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے بناتے ہیں۔نظیر صاحب عوام کے شاعر تھے۔وہ ہندو مسلم، سب کے غم و ماتم میں شریک ہوتے، عید،شب برأت ، ہولی ، دیوالی ، دسہرہ غرض ہر تہوار پر نظمیں لکھتے تھے۔ایک طرف خواجہ معین الدین چشتی کی تعریف کرتے تو دوسری طرف گرونا ک کو بھی نذرعقیدت پیش کرتے ہیں ۔ وہ اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات کو اس کی جزئیات کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔نظیر نے سماج کے ہر طبقے کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا،انہوں نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں ۔ یہ کتاب ''بچوں کے نظیر'' اطہر پرویز کی ترتیب کردہ کتاب ہے یہ کتاب اردو علی گھر سے ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آئی ۔۵۹ صفحات پر مشتمل ہے اس میں انہوں نے نظیر اکبر آبادی کی پندرہ نظمیں منتخب کی گئیں ہیں۔

۱ بنجارا نامہ

۲ تل کے لڈّو

۳ ہنس نامہ

۴ دیوالی

۵ ریچھ کا بچّہ

۶ چوہوں کا اچار

۷ کورا برتن

۸ پتنگ بازی

۹ برسات بہاریں

۱۰ کوّے اور ہرن کی دوستی

۱۱ پودنے اور ارنے کی لڑائی

۱۲ شب برات

۱۳ عید کی خوشی

۱۴ بلبلوں کی لڑائی

۱۵ آدمی نامہ

کتاب کے شروع میں اطہر پرویز نے نظیر کی زندگی اور ادبی کارناموں کا مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ انتخاب بچوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

بچوں کے اقبال:

شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ بیسوی صدی کے ایک معروف شاعر، مصنف ،قانون داں، سیاستدان، مسلم صوفی اور سب سے بڑھ کر مفکر اسلام تھے۔ انہوں نے اپنے کلام سے امت مسلمہ میں نئ فکر، نیا شعور بیدار کرنے کی سعی کی۔ ابتدا میں انہوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ یہ کتاب بھی سابقہ انتخاب کے سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس کتاب میں اطہر پرویز نے اقبال کی ان نظموں کو منتخب کیا ہے جو

اقبال نے بچوں کے لیے تحریر کی تھی۔ کتاب میں شامل نظمیں کی ترتیب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- ترانہ

۲- ایک پہاڑ اور گلہری

۳- پرندے کی فریاد

۴- ہمدردی

۵- بچّے کی دعا

۶- ایک پرندہ اور جگنو

۷- ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت

۸- ایک گائے اور بکری

۹- ایک مکڑا اور مکھیّ

۱۰- ماں کا خواب

۱۱- جگنو

الغرض کہ ڈاکٹر اطہر پرویز کا یہ انتخاب قابل قدر ہے جن کے مطالعے سے بچوں کو اردو کے نامور شعراء کے کلام اور ان کی زندگی کو قریب سے جاننے کا موقعہ ملتا ہے۔

اس کے علاوہ اطہر پرویز کو افسانوی ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی اسی لیے انہوں نے افسانوی ادب کے بیشتر انتخاب بچوں کے لیے نئے نئے طریقوں سے ترتیب دیں ہیں۔ اسد یار خان اور اطہر پرویز کے باہم مشورے سے اردو ادب کے اہم افسانہ نگاروں کے اہم افسانوں کا انتخاب کو افسانوی ادب کے قارئین کو ذہن میں رکھ کر ایک نئے زاویے سے ترتیب دینا چاہتے تھے، کیوں کہ آج کل کا قاری خاص طور سے نوجواں طبقہ اردو کے مقبول عام افسانہ نگاروں کے نہ صرف ان کے اہم اہم افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے پسندیدہ افسانہ نگاروں کے متعلق معلومات حاصل کر کے ان کو قریب سے جانے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ مذکورہ باتوں کا خیال کرتے ہوئے انہوں نے افسانہ نگاروں کا ایک مختصر لیکن جامع مطالعہ پیش کیا ہے اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے شروع میں ان افسانہ نگاروں کے فن و شخصیت کے حوالے سے اردو کے

نامور ناقدین نے جو مضامین لکھے ہیں ان کو جمع کیا گیا ہے دوسرے حصے میں ان فنکاروں کے منتخب افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔جس کو پڑھنے سے قارئین ان افسانہ نگاروں کی شخصیت اور فن کو قریب سے جاننے میں مدد ملتی ہے ۔اس حوالے سے اطہر پرویز نے ''راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے'' کرشن چندر اور ان کے افسانے'' اور ''منٹو کے نمائندہ افسانے کا اہم انتخاب ترتیب دیا ہے۔اس کے علاوہ ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' اردو کے تیرہ افسانے'' کو بھی مرتب کیا ہے۔

مجموعی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اطہر پرویز کے ادبی کارناموں کا سب سے اہم جزء ادب اطفال ہی ہے بلا شبہ ان کی تخلیقات جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بچوں کی رہنمائی کرتیں ہیں۔اطہر پرویز اردو ادب کے نمائندہ فنکاروں میں سے ایک ہیں۔

باب چہارم

اطہر پرویز اور داستان کی تنقیدی

(الف) داستان کا فن

☆ داستان کا آغاز وارتقاء اجمالی جائزہ

☆ داستان کی تنقیدی روایت

(ب) اطہر پرویز اور داستان کی تنقید

داستان کا فن

داستان افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ادب میں نثری قصوں کی وہ قسم جس کی اساس زیادہ تر خیال آرائی پر ہوتی ہے،کردار عموماً مثالی اور سپاٹ ہوتے ہیں،زبان پر تکلف سے کام لیا جاتا ہے۔بنیادی طور پر داستان وہ طویل قصہ ہے جو حقیقی زندگی کے بجائے محیر العقول واقعات سے تعلق رکھتی ہے جس میں حسن وعشق کی رنگینیاں،رزم وبزم کی حیرت انگیز معرکہ آرئیاں،بعید از قیاس واقعات وغیرہ کو دلچسپ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔داستان کی کہانی نسبتاً طویل اور پیچیدہ ہوتی ہے۔کلیم الدین احمد اس حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

''داستان کہانی کی طویل،پیچیدہ،بھاری بھرکم صورت ہے'' [۱]

انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ وہ دنیا کے آلام ومصائب سے دور کسی خیالی دنیا میں رہ کر تمام شادمانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنے فرصت کے لمحات میں دل ودماغ کو راحت پہنچانے کا کوئی ذریعہ تلاش کرتا ہے۔اور داستان اس کے لیے تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ بن گئی۔انسان کو ہر دور میں اس طرح کے مشغلوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور اس کے پیش نظر اس نے مختلف زمانوں میں اس کی مختلف اقوام نے اپنی آسانی کے تحت مختلف النوع سامان کی ایجاد کی ہے جس طرح آج کل کے انسان زیادہ تر شوشل میڈیا اور ٹی۔وی سیریلز کا استعمال کرتے ہیں۔ویسی ہی اس زمانے میں قصہ کہانی کو ہی تفریح کا بہترین شغل سمجھا جاتا تھا۔غالبؔ لکھتے ہیں کہ:

''داستان منجملہ طرازی فنون سخن ہے،سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کا لیے
اچھا فن ہے'' [۲]

۱؎ اردو زبان اور فن داستان گوئی،کلیم الدین احمد،دائرہ ادب،بانکی پور،پٹنہ،ص:۱۰

۲؎ اردو زبان اور فن داستان گوئی،کلیم الدین احمد،دائرہ ادب،بانکی پور،پٹنہ،ص:۷

گیان چند جین اس حوالے سے اپنی مشہور تصنیف ''اردو کی نثری داستانیں'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''زندگی میں جن آسائشوں اور لذتوں کا ارمان تھا، افسانے میں وہ سب مہیا کر لیں'' ۱؎

اطہر پرویز داستان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''داستانوں کی اس دنیا میں عیش و آرام کی فروانی ہے۔ جرأت، ہمت، شجاعت، اور مردانگی اور وہ تمام مثبت قدریں ہیں جو انسان کو ہمیشہ عزیز رہی ہیں اور داستان گو اپنی قوت بیان سے ان کو زیادہ معزز اور محترم بنا دیتا ہے۔'' ۲؎

اردو ادب میں ناولوں سے پہلے داستانوں کا ہی رواج رہا ہے۔ درباروں میں داستان گو ملازم رکھے جاتے تھے۔ ان کا مقصد سامعین کو کچھ دیر کے لیے فرحت و مسرت کا سامان مہیا کرنا ہوتا تھا۔ داستانیں ہمیشہ زبانی بیانیہ کی صنف کے طور پر پیش کی گئی جب چھاپہ خانوں کا رواج قائم ہوا تو یہ داستانیں قلم بند کی جانے لگیں۔ ابتداً مختصر داستانیں فورٹ ولیم کالج میں لکھ کر شائع کی گئیں۔ قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر بعد میں لکھنؤ کے نول کشوری پریس نے اردو کی طویل داستانوں کو تحریری شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ داستانیں تحریری شکل میں منظر عام پر آنے کے بعد داستان کے اجزاء کا مطالعہ کرنا ممکن اور آسان ہوا اس لیے اس کے فنی لوازم کو خصوصی طور پر بیان کیا جانے لگا۔

پلاٹ:

فکشن میں پلاٹ کا ہونا اشد ضروری ہے کیوں کہ بناء پلاٹ کے کوئی بھی کہانی وجود میں نہیں آتی۔ اور داستان کا پلاٹ بنیادی طور پر پیچیدہ، بھاری بھرکم اور الجھا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں کہ داستان میں قصہ در قصہ کی تکنیک کا استعمال کیا جاتا ہے اس مناسبت سے دیکھا جائے تو ایک داستان میں کئی پلاٹ ہوتے ہیں گرچہ بظاہر یہ ذیلی قصے یا پلاٹ مرکزی قصے کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں مکمل بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً باغ و بہار میں چاروں شہزادوں کے قصے۔ لیکن داستانوں میں چوں کہ مرکزی قصے کے اردگرد یہ چھوٹے چھوٹے واقعات، حادثات، اور حالات گردش کرتے رہتے ہیں اسی وجہ سے

۱؎ اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، اُتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، سن ۱۹۸۷ء، ص:۱۸

۲؎ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵، ص:۴۲

اکثر داستانوں میں نہ تو واقعات میں کوئی ترتیب ہوتی ہے اور نہ ہی پلاٹ مربوط ہوتا ہے۔داستان گو کا کمال یہ ہے کہ وہ ان قصوں کو ایک دوسرے میں اچھی طرح پیوست کر دیتا ہے تا کہ بے ربطی کا احساس نہ ہو۔لیکن اردو کی اکثر داستانوں میں پلاٹ کی کوئی خاص اہمیت نہیں دیکھائی دیتی اور نہ ہی داستان نگاروں نے اس کا خیال رکھا ہے اس لیے داستان سے پلاٹ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

کردار نگاری:

کردار نگاری افسانوی اصناف ادب کا ایک اہم عنصر ہے۔لیکن ناول اور افسانے کے بل مقابل داستان میں کردار حقیقی زندگی سے مختلف ہوتے ہیں کیوں کہ داستان میں کرداری نگاری پر زیادہ زور نہیں دیا گیا بلکہ داستانوں نے اردو ادب کو بیانیہ دیا۔اور اردو نثر کو مالا مالا کیا اردو میں زبان کا رچاؤ داستانوں ہی کا مرہون منت ہے۔داستانوں نے اردو نثر میں اتنی استعداد پیدا کی کہ وہ زندگی کے ہر پہلو پر قلم اٹھا سکتی ہے۔ داستانوں میں انسانوں کے علاوہ چرند و پرند، دیو و پری اور جنات وغیرہ کو بطور کردار پیش کیے جاتے ہیں۔جو بظاہر انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں لیکن انھیں بعض غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بنا کر مثالی کردار بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے داستان کا ہیرو ایک مثالی ہیرو ہوتا ہے جو ہمت و جرات ،حمیت وغیرت ،حسن وجمال ان جیسی کئی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ جن ، پری ، دیو وغیرہ سے مقابلہ کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے اور ان کو شکست دے کر خود اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔داستان گو انہی غیر معمولی صلاحیتوں کا ذکر زیادہ تفصیل سے کرتے ہیں۔انسانی کردار کی اندرونی خوبی یا خامی پر خاص توجہ نہیں دیتے ہیں جیسا کہ ایک ناول نگار ناول کے کرداروں کی خوبی یا خامی کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔داستانوں کے کردار زیادہ تر شاہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں اس سے داستان کا کینوس وسیع ہو جاتا ہے۔فوج ،میدان جنگ ،آداب شاہی ،شادی بیاہ ،دعوت وجشن وغیرہ کے متعلق بیان کی گنجائش نکل آتی ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ داستان جاگیردارانہ عہد میں ہی وجود میں آئی۔اس حوالے سے اطہر پرویز اپنی کتاب ''داستان کا فن'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''انیسویں صدی، جس میں داستانیں لکھی گئیں،عوام کی صدی نہیں تھی، یہ

خواص کی صدی تھی ۔ رؤسا، امرا، یا بالفاظ دیگر شرفاء کی ، جو شرافت اور
نجابت کے امین سمجھے جاتے تھے ۔ کیونکہ کسی چیز کا عوامی ہونا اس کے گھٹیا
اور پست ہونے کی دلیل سمجھا جاتا تھا ۔ اعلٰی اقدار کے پاسدار عوام نہ تھے ۔
اس لیے وہ تہذیب سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے اور رکھتے بھی کیوں،
تمدن کی ساری اجارہ داری تو خواص کے ہاتھوں میں تھی ۔ اس لیے اس
عہد کے ادب میں عوامی زندگی کی جھلکیاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔'' ۱؎

بادشاہوں اور شہزادوں کے علاوہ خدمت گار، خواجہ سرا، چڑیمار، مغلانی، مہترانی وغیرہ کردار بھی ملتے ہیں لیکن مرکزی کردار اونچے طبقوں کے ہی ہوتے تھے ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان کے زیادہ تر کردار یک رخی ہوتے ہیں یعنی اگر کوئی نیک ہے تو شروع سے آخر تک نیک ہی رہے گا اور اگر کوئی بد ہے تو شروع سے آخر تک بد ہی رہے گا جنہیں ہم اصطلاحاً سپاٹ یا flat کردار کہتے ہیں ۔ اس حوالے سے گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' میں لکھتے ہیں کہ:

''کردار میں حرکت نہیں ، ارتقا نہیں ، کسی شخص کو جیسا کہ ابتداء میں دکھایا
جاتا ہے ویسے ہی وہ آخر تک رہتا ہے ۔ مختلف تغیرات اور انقلاب کا اس
پر اثر نہیں ہوتا ۔ نیکوں کو کبھی خواب و خیال میں بھی لغزش نہیں ہوتی،
بدوں کو کتنی فصاحت سے وعظ دیا جائے ، دلیلوں سے سمجھایا جائے لیکن
ان کے دل کے سیاہ خانے میں نور کی کوئی تنہا شعاع بھی نہیں گزر سکتی ۔
کردار نگاری جامد۔'' ۲؎

داستانوں کے کردار انسانوں کے علاوہ حیوان وغیرہ بھی ہوتے ہیں ۔ کردار ایسے ہوتے ہیں جن کی انسان پرستش کر سکے، جن سے بے حد نفرت کرے، یا جن سے خوفزدہ ہو جائے یا کم سے کم جنہیں دیکھ کر اور جن کے کارنامے سن کر قاری حیرت میں پڑ جائے ۔

۱؎ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵، ص: ۴۷

۲؎ اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، اُتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، سن ۱۹۸۷ء، ص: ۲۴۲

مافوق الفطرت عناصر وطوالت:

داستان میں مرکزی کردار کے علاوہ فوق الفطری عناصر بھی ہوتے ہیں۔ جیسے جن، پری، بھوت، جل پری، جادوئی تلوار، اُڑنے والی قالین، تیر وغیرہ عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ جن کا عام فطری زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا یہ غیر فطری عناصر ہی داستانوں کا اہم سرمایہ ہیں۔ اور ان سے ہی ہماری داستانیں پہچانی جاتیں ہیں اسی سے داستان کی حیرت انگیز دنیا آباد ہوتی ہے۔ اور یہی خصوصیت اسے دوسری اصناف سے ممیّز کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قدیم عالمی ادب مافوق الفطرت عناصر سے پرُ ہے۔ اسی لیے دنیا کے تقریباً ہر ادب کے آغاز میں داستان موجود ہے۔ اور تمام قدیم عالمی ادب فوق فطری عناصر سے پرُ بھی ہیں مثلاً ہومر کی ایلیڈ، فاؤسٹ کی ڈوائن کامیڈی، شیکسپیئر کے ڈرامے، ملٹن کی فردوس گم شدہ، فردوسی کا شاہنامہ، کالی داس کے ڈرامے، رامائن، مہابھارت وغیرہ ایسی داستانیں ہیں۔ جن میں فوق الفطری عناصر موجود ہیں۔ اس طرح مافوق الفطرت عناصر سے داستان میں طوالت کے مع حیرت واستعجاب کی فضا بھی قائم کی جاتی ہے یہ داستان گو کا کمال ہوتا ہے کہ وہ اس اعتدال سے ان غیر حقیقی واقعات کو بیان کرتا ہے کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے اور مبالغہ کا احساس بھی نہیں ہوتا نہ ہی داستان کا حسن بیان مجروح ہوتا ہے اس کے ذریعے ہی داستان گو داستان میں دلچسپی کو قائم رکھتا ہے۔ اس کے متعلق اطہر پرویز اپنی کتاب میں مافوق الفطرت کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

> ''مافوق الفطرت کی وجہ سے داستان گو کے بہت سے مسائل حل
> ہوجاتے ہیں۔ وہ اس کی مدد سے قصے میں جو صورت حال پیدا کرنا چاہتا
> ہے بڑی آسانی سے پیدا کر لیتا ہے، اسے کوئی رکاوٹ نہیں، کیونکہ اس کا
> پڑھنے والا بھی اپنا پورا تعاون دیتا ہے وہ بھی اسباب اور اثرات کے چکر
> میں نہیں پڑتا۔ اس لیے مافوق الفطرت تو ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔''[۱]

فرمان فتح پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''مافوق سے داستانوں میں پھیکا پن نہیں بانکپن پیدا ہوتا ہے۔
> ایک طرف وہ انسان کے مادہ تجسّس اور تخیل کے لیے تازیانے کا کام کرتا

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ص: ۵۸/۵۷

ہے۔دوسری طرف وہ داستان میں پیچیدگی ،بوقلمونی اور دلچسپی کا سامان
فراہم کرتا ہے۔جنوں، پریوں اور دیوؤں کو انسان کی طرح بولتے چالتے،
ہنستے روتے ،محبت ونفرت کرتے ،ہمدردی ورحم اور غیض وغضب کے
جذبات سے متاثر دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک طرح کا اطمنان نصیب ہوتا
ہے اور ہم خیالات وجذبات پر زیادہ اعتماد محسوس کرنے لگتے ہیں۔گویا
مافوق ہمارے جذبات کی تنقید کا بہترین ذریعہ ہے''۔[۱]

طوالت بھی داستان کا بنیادی عنصر ہے اور مافوق الفطرت عناصر کے ذریعے ہی داستان گو داستان کو طول دینے کا موقعہ مل جاتا ہے کیوں کہ جس زمانے میں داستان کا آغاز ہوا وہ خالی اوقات اور فرصت کا زمانہ تھا اسی لیے داستان کا مقصد ہی وقت گزاری تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ طوالت اور مافوق الفطرت عناصر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔اُس وقت داستانیں پڑھی نہیں سنی جاتی تھیں بادشاہوں کے درباروں میں ،عام لوگ گلی کوچوں میں، یا دکان پر بیٹھ کر رات کو داستان سنتے تھے۔لہذا طوالت کی کوئی قید نہیں تھی ایک گھنٹے سے ایک مہینے تک یہ داستان گو پر منحصر تھا لیکن بہت سی طویل داستانوں کے ساتھ ساتھ بعض دلچسپ چھوٹی داستانیں بھی لکھی گئیں ہیں جیسے ''فسانہ عجائب'' اور سب سے طویل داستان میں امان اللہ خان کی ''امیر حمزہ'' ہے۔ مافوق فطری عناصر اور طوالت یہ دونوں عنصر داستان کے لیے لازم جزو ہیں ان کی ہی بناء پر داستان دوسری اصناف سے منفرد ہوتی ہے۔حیدر بخش حیدری اپنی کتاب ''آرائش محفل'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اکثر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا
زیادتیاں کیں،تا کہ قصہ طولائی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے''۔[۲]

منظر نگاری:

منظر نگاری بھی داستان کا اہم جزو ہے۔اس حوالے سے ہماری داستانیں بیش قیمت اثاثہ رہی ہیں۔ داستان گو نے مختلف ملکوں کے شادی بیاہ کے رسومات ،جغرافی حالات ، پہاڑوں ، بندرگاہوں ،عرس و میلے، موسم، دریا وغیرہ کے مناظر کا تفصیل کے ساتھ بہت ہی سلیقے سے ذکر کر کے منظر نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ یہ تمام

---

[۱] اردو کی منظوم داستانیں،فرمان فتح پوری،ص:۶۰

[۲] قصہ حاتم طائی (آرائش محفل) حیدر بخش حیدری،مرتب طہر پرویز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی،ص:۲۰

مناظر آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ داستان میں طوالت ضروری ہے اسی لیے داستان گو چھوٹی سے چھوٹی چیز کی بھی تصویر کشی پیش کرتے ہیں۔

تہذیب و معاشرے کی عکاسی:

داستان تہذیب و معاشرے کی عکاس ہوتی ہے۔معاشرتی مرقع کشی بھی داستانوں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔داستان میں رہن سہن کے آداب ،کھانے پینے کی اقسام ،ملبوسات ،سواریاں ،ملازم چورا چکوے،زیورات، جانور،غرض ہر چیز کا ذکر تفصیل سے کیا جاتا ہے اپنے ثقافتی رنگ کے ساتھ داستان نگار اپنی تہذیب اور معاشرت کی مکمل تصویر اپنی داستانوں میں پیش کرتا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے ہماری داستانوں سے لکھنو اور دہلی کی پوری تہذیبی و معاشرتی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔اس حوالے سے گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''ان داستانوں سے لکھنو اور دہلی کی شاہی تہذیب پوری مرتب ہوسکتی ہے'' ؎۱

محمد حسن عسکری نے طلسم ہوش ربا کے مقدمے لکھتے ہیں کہ:

''داستان امیر حمزہ سے ساحری اور عیاری نکال لیجئے باقی جو رہے گی وہ لکھنو کی تہذیب ہے'' ؎۲

اس طرح سے دیکھا جائے تو داستانوں کے مطالعے سے تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ہمیں اس عہد کی معاشرتی زندگی سے بخوبی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔اُس زمانے کے رہن وسہن ،رسم ورواج، ماحول،سماج وغیرہ ان تمام چیزوں کے متعلق باریک بینی سے پوری تفصیلات بیان کی جاتی ہے۔گویا داستان گو اپنی پوری تہذیب اور معاشرت کی مکمل تصویر اپنی داستان میں پیش کرتا ہے۔

داستان کا آغاز وارتقاء:

داستان کا تعلق تیرھوی صدی سے ہے لیکن اردو میں پندرھویں صدی میں نثر کی ابتداء ہوئی۔بندہ نواز گیسودراز کے رسالے ''معراج العاشقین'' سے جو تصوف کے بارے میں تھا۔اس اعتبار سے یہ دکنی دور کا پہلا نثری نمونہ کہلاتا ہے لیکن عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو ادب میں داستان کا آغاز سولھویں صدی میں مشہور

؎۱ اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو،ص:۵۰۱

؎۲ محمد حسن عسکری، دیباچہ انتخاب طلسم ہوش ربا،ص:۲۵

شاعر ملا اسد اللہ وجہی کی ''سب رس'' سے ہوتا ہے حالاں کہ یہ اخلاقی رنگ میں ڈوبی ہوئی کہانی صوفیانہ اسلوب میں بیان کی گئی ہے۔جس میں عشق وعقل کی کشمکش کو بڑے دلچسپ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اگر اس میں فوق الفطری عناصر کا دخل نہیں ہوتا تو اس کو داستان کہنا کس طرح مناسب نہ تھا۔اس کے بعد کہانیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے۔اور اردو ادب میں کئی مشہور داستانیں لکھیں گئیں۔اٹھارہویں صدی میں محمد قادری نے ''طوطی نامہ''لکھی۔طوطا کہانی'' محمد ابراھیم بیجاپوری کی ''انوار سہیلی''فقیر اللہ شاہ حیدر کی ''تناولی'' فقیر اللہ شاہ حیدر کی ''مذہب عشق'' منشی شمس الدین احمد کی ''حکایۃ الحلیہ (یہ الف لیلیٰ کا پہلا ترجمہ ہے) اس کے بعد شمالی ہند میں کئی اہم داستانوں کے نقوش اٹھارہویں صدی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثلاً عیسوی خان بہادر کی '' قصہ مہر افروز ودلبر'' عطا حسین خان تحسین کی ''نوطرز مرصع'' ''طلسم ہوش ربا'' مہر چند کھتری کی ''نو آئین ہندی عرف (قصہ ملک محمد وگیتی افروز)'' شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' سید حسین شاہ حقیقت بریلوی کی ''جذب عشق'' وغیرہ قابل قدر داستانیں لکھی گئیں۔یعنی ایک طرح سے یہ تقریباً دوسو برسوں تک کا سفر تھا۔لیکن اردو میں داستان نویسی کو عروج فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ہی حاصل ہوا۔اس کالج میں اردو زبان میں دوسری زبانوں کے اہم شہ پاروں کا ترجمہ کیا گیا اور خود بھی اردو زبان میں تصنیف وتالیف کا کام وسیع پیمانے پر شروع ہوا اس ادارے میں شعبہ ہندوستانی کی قیادت جان گلکرسٹ کررہے تھے انہوں نے کالج کے نصابی ضرورت کی تکمیل کے لیے اردگرد کے علاقوں سے بڑے بڑے اہل قلم اور زباندانوں کو بلایا اور فارسی،عربی،سنسکرت کی اہم کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔اسے اردو داستان گوئی کو بہت فروغ حاصل ہوا اور اردو ادب میں داستانوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد داستانوں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی اور کئی مشہور داستانیں منظر عام پر آئیں۔

اس کالج کے قیام کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبانیں سکھانا تھا تاکہ وہ ہندوستان میں آرام سے لوگوں سے گھل مل سکے جیسا کہ ابن کنول اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندوستان پر روز بروز انگریزوں کا تسلط بڑھتا جارہا تھا۔سراج الدولہ کی ناکامی کے بعد آخری انگریز مخالف حکمراں ٹیپو سلطان تھا جو ۱۷۹۹ء میں انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ٹیپو سلطان کی شکست

اور شہادت کے بعد انگریزوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور مکمل ہندوستان پر حکومت کا خواب پورا ہوتا ہوا نظر آیا۔ ٹیپو سلطان پر فتح کی یاد میں لارڈ ولزلی کے ہاتھوں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ کالج کے قیام کا مقصد زبان و ادب کو فروغ دینا نہیں تھا بلکہ یورپین کو ہندوستانی زبانیں سکھانا تھا۔ انگریزوں نے اپنے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور دائرۂ حکومت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی کہ حکومت اور تجارت کرنے کے لیے لازمی ہے کہ یہاں کی مقامی زبانیں سیکھی جائیں تا کہ انگریز افسر ہندوستانی لوگوں سے بہتر رابطہ قائم کر سکیں۔'' [۱]

گلکرسٹ یہ جانتا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کی زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے جغرافیائی و تاریخی اور مذہبی حالات سے اچھی طرح واقفیت حاصل کریں۔ اسی مقصد کے تحت دوسری زبانوں کے قصے کہانیوں کو اردو میں منتقل کرانے کا کام کیا گیا کیوں کہ اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو تمام ملک میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں جو کامیابی باغ و بہار کے نصیب میں آئی وہ کسی اور داستان کو نہیں ملی۔ ''گنج خوبی'' سید حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' ''توتا کہانی'' ''قصہ لیلیٰ مجنوں'' ''گلزار دانش'' ''ہفت پیکر'' ''گل مغفرت'' ''تاریخ نادری'' ''گلدستہ حیدری'' ''گلشن ہند'' جامع القوانین'' قابل ذکر داستانیں ہیں۔ میر شیر علی افسوس کی ''باغ اردو'' ''دیوان اردو'' ''آرائش محفل''، مرزا جان طپش کی ''بہار دانش''، میر بہادر علی حسینی کی ''نثر بے نظیر'' ''اخلاق ہندی'' ''تاریخ آسام'' ''رسالہ گل کرسٹ'' مولوی امانت اللہ کی ''نقلیات لقمان'' ''اخلاق جلالی'' مرزا کاظم علی جوان کی ''شکنتلا'' ''بارہ ماسہ'' ''دستور ہند'' مظہر علی خان ولا کی ''ہفت گلشن'' مولوی اکرام علی کی ''اخوان الصفا'' مولوی حفیظ اللہ کی ''خرد افروز'' للولال جی کی ''سنگھاسن بتیسی'' ''لطائف ہندی'' ''پریم ساگر'' ''مہادیو بلاس'' بنی نارائن جہاں کی ''دیوان جہاں'' ''چہار گلشن'' ''بہار عشق'' ''گلزار عشق'' خلیل علی خاں اشک کی ''داستان امیر حمزہ'' ''گلزار چین'' نہال چند لاہوری کی ''مذہب عشق'' وغیرہ قابل ذکر داستانیں ہیں جو فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی ہیں۔

---

[۱] داستان سے ناول تک، پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ص: ۲۰۹

اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی بعض معروف داستانیں لکھی گئیں۔جن کی فہرست طویل ہے جن میں شیخ علی بخش کی ''قصہ نل ودمن'' انشاء اللہ خان انشاء کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' ''سلک گوہر'' محمد بخش مہجور کی ''انشائے نورتن'' ''انشائے گلشن نو بہار'' حقیقت بریلوی کی ''ہشت گلزار'' رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہ عجائب'' ''شگوفہ محبت'' ''گلزار سرور'' ''شبستان سرور'' ''شرر عشق'' ''فسانہ عبرت'' ''اسرار سلطانی'' اہم ہے۔ فخر الدین کی ''سروش سخن'' جعفر علی مشیون کی ''طلسم حیرت'' میر محمد تقی کی ''بوستان خیال'' عبدالکریم کی ''الیف لیلیٰ'' نیم چندہری کی ''گل صنوبر'' وغیرہ اردو کی اہم داستانیں ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے باہر لکھی گئی تھیں۔

داستان کی تنقیدی روایت:

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو میں داستان کی مقبولیت واہمیت زیادہ بڑھ گئی اور بیسویں صدی کے آواخر تک یہ سلسلہ جاری وساری رہا اور بہت سی داستانیں منظر عام پر آئیں۔عام وخاص سب میں مقبول تو رہیں لیکن ناقدین ومحققین کی توجہ کا مرکز نہ بن سکیں۔یعنی تنقیدی اعتبار سے اردو داستانوں پر ابھی تک توجہ نہیں دی گئیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو تذکروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں صرف شعراء کا ہی ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔اور جب حالی کی ''مقدمہ شعر وشاعری'' سے بیسویں صدی میں اردو تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوا اس میں بھی شاعری کو ہی قابل ذکر وفکر سمجھا گیا۔گر چہ اس سے قبل غالب اور خواجہ امان دہلی نے داستان سے متعلق اپنی رائے دے دی تھی۔''بوستان خیال'' فارسی کی مشہور داستان ہے جو میر متقی خیال نے داستان ''امیر حمزہ'' کے جواب میں پندرہ جلدوں میں رقم کی ہے۔جو بہت مشہور ومعروف ہوئی اور ''بوستان خیال'' اس کتاب کی مقبولیت کے سبب بہت سے لوگوں نے اس کو اردو زبان میں ترجمہ کیا۔لیکن سب سے زیادہ خواجہ امان دہلوی کے ترجے ''حدائق انظار'' کو مقبولیت حاصل ہوئی۔جو ''بوستان خیال'' کی تیسری جلد ''معز نامہ'' کا اردو ترجمہ ہے اسی کے دیباچے میں خواجہ امان دہلوی نے داستان کے فنی لوازم پر اظہار خیال کیا ہے۔اور اسی کتاب کے لیے غالب نے تقریظ لکھی انہوں نے بھی داستان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ ''داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے، سچ یہ ہے دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے'' اور امان علی خان غالب لکھنوی نے داستان امیر حمزہ کی پہلی جلد میں داستان کے متعلق لکھا ہے کہ داستان کے لیے چار عناصر ضروری ہیں۔''رزم، بزم، طلسم اور عیاری'' مزید برآں بیسوی صدی میں شرر نے داستان کے فن پر مضمون لکھا اس کے علاوہ مختلف

داستانوں پر علیحدہ علیحدہ مضامین لکھے گئے لیکن کوئی با قاعدہ کتاب نہیں ملتی تھی ۔داستان نویسوں کے متعلق بھی تذکرہ نگار بالکل خاموش ہیں جس کا شکوہ شمس الرحمان فاروقی اس طرح کرتےہیں ۔لکھتے ہیں کہ:

> ''سودا اور میر و مصحفی وغیرہ کے بارے میں اتنا تو معلوم ہے کہ وہ خاک لکھنو میں آسودہ ہیں....''داستان امیر حمزہ'' کی نول کشوری روایتوں کی تخلیق کرنے والوں کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ لکھنو میں دفن ہیں ،یا کہاں دفن ہیں ؟کسی قوم اور کسی تہذیب نے کم ہی اپنے محسنوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہوگا جو اہل اردو اور اہل ہند نے داستان امیر حمزہ جیسی عظیم الشان کارگاہ نیرنگ کے صانعوں کے ساتھ کیا۔'' [۱]

بیسویں صدی کے آغاز میں شرر نے داستان کے فن پر مضمون لکھا اس کے علاوہ بھی بعض داستانوں پر علیحدہ علیحدہ مضامین لکھے گئے ۔لیکن داستان کی تنقید سے متعلق اب تک کوئی با قاعدہ کتاب وجود میں نہیں آئی تھی ۔لیکن بیسویں صدی کے وسط میں ناقدین و محققین نے داستان کی طرف خصوصی توجہ کی اور داستان کی تنقید سے متعلق بہت سی مشہور کتابیں منظر عام پر آئیں ۔اس حوالے سے گیان چند جین کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں''،کلیم الدین احمد کی ''فن داستان گوئی''،وقار عظیم کی ''ہماری داستانیں'' اور ''داستان سے افسانے تک'' وغیرہ کتابیں اہم کتابیں تحریر کی گئیں ۔اس کے علاوہ پچھلے چند برسوں میں داستان کے فن و تاریخ پر بعض کتابیں لکھی گئیں ۔ان کتابوں کے بعد اطہر پرویز کی کتاب ''داستان کا فن'' منظر عام پر آئی ۔اس سے ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں داستان کی تنقید پر توجہ دی جانے لگی تھی ۔ان سب کتابوں کے بعد شمس الرحمان فاروقی کی مشہور و معروف کتاب'' ساحری،شاہی صاحب قرانی :داستان امیر حمزہ کا مطالعہ'' منظر عام پر آئی اس کتاب کو اس لیے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس کے بعد اردو میں اس صنف کا احیاء ہوا ۔دراصل کسی صنف کی طرف متوجہ کرانے اور رائے عامہ ہموار کرنے میں ناقد اہم رول ادا کرتا ہے ۔ان ناقدیں کی کتابوں کے مطالعہ سے یہی محسوس ہوتا ہے ۔

گیان چند جین کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' یہ کتاب داستانوی ادب کی ارتقاء و ترویج کے موضوع پر بہترین کتاب ہے ۔نثری داستان نویسی کی روایت اور اس کی ترقی کے اسباب پر انہوں نے خاص

---

[۱] شمس الرحمان فاروقی ،ساحری،شاہی اور صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد اول :نظری باحث ،ص:۲۰

توجہ صرف کی ہے۔اصل میں اردو کی نثری داستانیں یہ گیان چند جین کی پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ تھا۔بعد میں انہوں نے اسے ترمیم واضافے کے ساتھ شائع کیا۔اس کتاب کو انہوں نے تیرہ ابواب میں منقسم کیا ہے اور داستان گوئی کی عہد بہ عہد کی تاریخی،سماجی،سیاسی،اقتصادی ترقی وترویج کو بہت ہی واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے پہلا باب عہد قدیم کی قصہ گوئی پر منحصر ہے۔

دوسرے باب اردو کے قدیم افسانوی ادب پر محمول ہے۔اس کے بعد داستان کے فروغ وزوال کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد دکنی قصہ گوئی پر گفتگو کی گئی ہے۔پھر شمالی ہند میں داستان نویسی پر بحث کی گئی ہے پھر فورٹ ولیم کالج کی خدمات اور داستانوی ادب پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔اس کے بعد سنسکرت اور ہندی سے متاثر قصہ گوئی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔پھر سرورؔ کے عہد کی قصہ گوئی پر بات کی گئی ہے۔اس کے بعد الف الیلوی داستانوں پر بات کی گئی ہے اس کے بعد داستان''امیر حمزہ''اور''بوستان خیال'' پر گفتگو کی گئی ہے۔آخر میں اردو ادب میں داستان کے مقام ومرتبے کو موضوع سخن نیایا گیا ہے۔الغرض یہ کتاب دستان گوئی اور قصہ گوئی پر ایک اہم معلوماتی کتاب ہے۔

کلیم الدین احمد کی کتاب''فن داستان گوئی''ان کی تنقیدی تصنیف ہے۔جس میں داستان کی فن کی ستائش کے ساتھ ساتھ مصنف نے اردو ادب میں داستان گوئی کی ابتداء عہد بہ عہد داستانوی اسلوب اور منتخبہ داستانوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔مصنف نے داستان کو تخیئل کی بلندی اور فنی نقطۂ نظر سے افسانوں سے بہتر مانا ہے۔وقت گزاری کے لیے داستان گوئی کا مشغلہ اچھا ہے۔کلیم الدین احمد نے اس کتاب میں داستان کی تعریف،تکنیک،اردو کی معروف داستانیں جیسے''طلسم ہوش ربا'' ''بوستان خیال'' ''اور مختصر داستانوں کے تنقیدی تجزیہ وتبصروں میں اس صنف کے محاسن ومعائب بھی بیان کیے ہیں۔یہ کتاب کلیم الدین احمد کے تنقیدی شعور کو واضح کرتی ہے کہ ان کے نزدیک تنقید کا واسطہ ادراک سے ہے تاثرات سے نہیں،ان کی نثر میں قطعیت ہے یعنی وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہی بات بالکل اسی طرح قارئین کے ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔اس میں کسی طرح کا کوئی ابہام نہیں ہوتا۔اپنی بات کو حوالوں اور مثالوں سے مدلل اور باوزن بناتے ہیں۔ان کے تنقیدی شعور کا باریک بینی سے جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے تنقیدی شعور اور آگہی کا اطلاق ایک مخصوص نقطۂ نظر کے تحت کیا ہے۔

سید وقار عظیم کی''ہماری داستانیں''یہ کتاب وقار عظیم کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔جس

میں اُردو ادب میں لکھی گئی داستانوں اور ان کے اہم پہلوؤں پر مختلف عنوانات کے تحت روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو مصنف نے مختلف اوقات میں تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب میں پندرہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے ہر داستان کے امتیازی پہلو کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا ہے۔

مندرجہ بالا کتب کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اطہر پرویز نے اپنی تھیسس ''داستان کا فن'' میں ان کتب سے بطور حوالہ جگہ جگہ استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مغربی حوالے بھی اس کتاب میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن کی مدد سے انہوں نے اپنی بات کو ثابت کیا ہے اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ہم داستان کے فنی لوازم سے بخوبی واقفیت حاصل کرتے ہیں وہی اردو ادب میں داستان نویسی کا آغاز، داستانوں میں ہندوستانی تہذیب و معاشعرت کے عناصر کا بیان، انسانی زندگی کا تصور، انسانی قدریں، وغیرہ کے متعلق بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

اطہر پرویز اور داستان کی تنقید:

اطہر پرویز کو داستان اور حکایت گوئی کے موضوع سے خاصی دلچسپی رہی ہے انہوں نے فارسی ادب کے علاوہ اردو ادب میں بھی ایم۔اے کیا ہے اور اردو میں ہی تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے 'قصہ حاتم طائی'' اور اردو کی مشہور داستان ''فسانہ عجائب'' کو بھی مرتب کیا ہے اور بچوں کے لیے بعض داستانوی طرز کی تحریریں بھی لکھی ہیں چوں کہ انہیں اردو داستان گوئی سے غیر معمولی دلچسپی تھی اسی لیے اپنے مقالے کا موضوع بھی ''داستان کا فن'' ہی منتخب کیا ہے۔ جب انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کا تقرر بحثیت لکچرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہو گیا تھا۔ لہذا انہوں نے بحثیت امیدوار کے اس مقالے ۱۲، اکتوبر سن ۱۹۷۶ء کو مکمل کیا۔ ایسی صورت میں مقالہ نگار کا عام طور پر کوئی نگراں نہیں ہوتا۔ اور یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

اطہر پرویز نے اس کتاب کو آٹھ ابواب میں منقسم کیا ہے جو اس طرح ہیں۔ باب اوّل ''داستان کیوں اور کیسے'' باب دوّم ''داستان کے فنی لوازم'' باب سوم ''داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر'' باب چہارم ''داستانوں میں کردار نگاری'' باب پنجم ''داستانوں میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے عناصر'' باب ششم'' داستانوں میں جزئیات نگاری اور زندگی کی پیش کش کا تصور'' باب ہفتم ''داستانوں میں مختلف اسالیب بیان''

باب ہشتم ''داستانوں میں اقدار انسانی کا تصور'' اس طرح انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں نہ صرف یہ کہ داستان کے فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے بلکہ افسانوی ادب میں تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو بھی کھنگالا، اور اس کی مقبولیت کے اسباب بھی بتائے۔

داستان کیوں اور کیسے؟:

اطہر پرویز نے اپنے پہلے باب ''داستان کیوں اور کیسے'' داستان کی ضرورت کیوں پیش آئی اور کس طرح داستان گوئی کو عروج حاصل ہوا انسان کو قوت گویائی کے ساتھ قوت متخیلہ کا بھی مالک بنایا گیا ہے اسی لیے وہ سب سے پہلے قصہ کہانی کی طرف مائل ہوا دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کہانیوں میں تخیل کی کارفرمائی بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ جس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ داستان کو کامیاب داستان گو کی قوت متخیّلہ ہی بناتی ہے اس زمانے میں آدمی کے وسائل مسدود اور تجربات محدود تھے اور علم کا سرمایہ بھی مختصر سا تھا تخیل بھی معصوم ہی تھا اسی لیے انسان ابتداء میں کائنات کی اکثر اشیاء کو تخیل کی ہی نگاہ سے دیکھتا تھا اور کائنات کو تسخیر کرنے کی خواہش بہت پرانی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قصہ کہانی کا ہی سہارا لیا۔ اس حوالے سے قمر والہدیٰ فریدی لکھتے ہیں کہ:

> ''خوب سے خوب تر کی تلاش اور زندگی کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے کی خواہش آدمی کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ پہلا دن جب انسانی ذہن شعور سے آشنا ہوا، تب سے اب تک وہ یہی کرتا رہا ہے اور یہ کام دو سطحوں پر کیا ہے۔ اُس نے تخیل کی سطح پر خواب دیکھے اور عمل کی دنیا میں اُن خوابوں کی تعبیر ڈھونڈی۔ اوّل الذکر نے فنون لطیفہ کو جنم دیا، مؤخر الذّکر سائنس اور ٹکنالوجی کو ترقی دی۔'' [۱]

انسان کی ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انسان نے خود فن کو دریافت کیا (اس نے فن کو ایک جان پہچان دی یہ خود انسان کی ایک نا قابل فراہم دریافت ہے) کیوں کہ فنون لطیفہ کی اصلی نوعیت نہ تو مذہب کی دین ہے اور نہ ہی کسی تہذیب کی بلکہ خود انسان کی ایجاد ہے جس میں وہ اپنے احساسات و جذبات کو خاص

---

۱ قمر الہدیٰ فریدی، داستان تحقیق و تنقید، طباعت باہتمام لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ، ص:۱۱

انداز میں بیان کرتا ہے اس سفر میں انسان کی قوت متخیلہ بڑی معاون ثابت ہوئی ہے۔اطہر پرویز نے اپنی کتاب داستان کا فن میں رقمطراز ہیں کہ:

''دراصل تخیل ہی تخلیق میں ممدو معاون ثابت ہوتا ہے۔
تخلیقی ادبیات کی ایک اہم خصوصیت تصور اور تخیل کی رنگ آمیزی ہے۔
اس اصول کے مطابق یہ ضروری ہے کہ موجودات عالم کے ذہنی پہلو کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے مصنف اپنے الفاظ میں ظاہر کرے۔مسرت بہم پہچانا تخلیقی ادب کا اہم وصف ہے جو تخیل کی رنگ اور جمالیات کے اثر اندازی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ایسے تخلیق کے نقوش ہم کو قصوں اور داستانوں میں ملتے ہیں کیونکہاں میں خواب خیال کی دنیا بھی تھی اور انسانی تخیل کی اُڑان بھی، جو کبھی ستاروں کو چھو لینا چاہتا تھا تو کبھی پاتال پر بھی اپنے اپنے نقش قدم چھوڑنا چاہتا ہے۔یہ انسانی تہذیب کے اوائل کے تحیر کی بہترین مثال ہے۔'' [1]

اس کے بعد تخیل کی اہمیت کو واضح کیا ہے جس کے ذریعے مصنف اپنے احساس جمال کے مطابق کسی بھی چیز کو اپنے انداز سے پیش کرتا ہے تا کہ قاری لطف اندروز ہو سکے۔حظ محسوس کر سکے خوش ہو سکے اور ان ہی خیالات کو مصنف تخیل کی پرواز اور اپنی حسن و جمال سے بیان کرتا چلا جا تا ہے اور یہ قصے کہانیوں اور داستانوں میں ہوتا ہے۔

داستانیں تخیل کا پرواز اور خواب خیال اور تصور وغیرہ پایا جانے لگا۔خواب اور تصور کی مدد سے انسان وہ کچھ حاصل کرنے کی خواہش رکھتا جو وہ سوچتا (لیکن محدود آسائش کی وجہ سے حاصل نہیں کر پاتا) زندگی دشوار تھی اور وہ اس کی آسائشوں کے لیے منصوبے بنایا کرتا تھا اور تصور میں ہر چیز کرنے لگتا جس کی حقیقت میں تکمیل ممکن نہ ہوتی اور اس طرح داستانوں میں خوابوں اور تصورات کا بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی۔اور انسان ابتداء میں اسی کے ذریعے اپنے خواہشات کی تکمیل کا سامان کرنے لگا اس طرح ہمیں داستان کی ابتداء میں

---

[1] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص:۶

خوابوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اور پھر تخیل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ تخیل تعقل سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور اسے ناقدین کی دلیلوں کے ذریعے ثابت کیا ہے۔ کیوں کہ تخیل کسی بھی چیز کو مان لیتا ہے اور منطق کی کسوٹی پر نہیں پرکھتا ہے جب کہ تعقل ہر چیز کو ناقدانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ قصے کہانیاں تہذیب کے ابتدائی دور کی پیداوار ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''قصہ گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جس وقت انسان کھڑے ہوکر چلنا سیکھا۔ یوں سمجھئے کہ قصہ گوئی کی عادت کرۂ ارض کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے ان میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو مہذب کہلاتی تھی اور وہ لوگ بھی قصہ گوئی سے دلچسپی لیتے ہیں جن سے تہذیب نے آنکھیں دوچار کی تھیں۔ گویا قصہ کہنا سننا کسی مخصوص تہذیب کی روایت نہیں تھی اور نہ یہ مہذب قوموں کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اس نے اپنے تخیل کی مدد سے کتنے ہی قصے گڑھ ڈالے، جو قرین قیاس نہ ہونے کے باوجود ایک رعنائی، ایک دلکشی اور ایک شگفتگی رکھتے تھے۔ انسان میں خواہش تخلیق بالکل فطری ہے، وہ سوچتا ہے اور اپنے تخیل کی نگاہوں سے جو کچھ دیکھتا ہے، ان کو دوسروں تک پہچانا چاہتا ہے۔'' [۱]

کہانی کو سنایا جاتا ہے یعنی بیان کیا جاتا ہے لکھا نہیں جاتا تھا۔ اس کی زبان عموماً سادہ ہوتی ہے داستانیں چوں کہ کہنے کا فن ہے اس لیے اس طرح کی آسان زبان داستانوں میں بھی ملتی ہے۔ داستانوں میں وقت اور بعد زمانی کا خیال رکھا جاتا ہے کیوں کہ عموماً داستانوں میں ان جگہوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دنیا کے نقشے پر نظر نہیں آتیں صرف داستان گو کی تخیل کی ایجاد ہوتی ہے۔

داستان کو فروغ ایسے عہد میں ہوا جب لوگوں کے پاس فرصت زیادہ تھی اور انسان مافوق الفطری عناصر کے ذریعے سکون کا متلاشی تھا۔ جب بادشاہوں میں عیش پرستی کا رجحان بڑھا تو داستانیں اپنے عروج کو پہنچ گئیں۔ اس سلسلے میں اطہر پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص:۱۳

''داستانوں کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔اس کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔
یہ مافوق الفطرت باتوں سے آراستہ ہوتی اس عہد کی معاشرت داستان
کے ذریعہ چغلی کھاتہ ہے اور اسی لیے ہم داستانوں میں انسانی تہذیب
کے بچپن کی جھلک پاتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔'' [۱]

داستانوں میں عموماً لطف وانبساط کا سامان ہی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ داستانوں میں بہادری کے قصے بھی ہوتے ہیں، وہاں خطرات سے گزرنے کے بعد فتح مقدر ہوتی ہے اور حق و باطل کی جنگ میں فتح حق کی ہوتی ہے۔داستانیں امید کا استعارہ ہوتی ہیں۔یہاں زندگی کرنے کا سامان بہت کچھ ہوتا ہے۔ اختتام ہمیشہ رجائی ہوتا ہے۔داستان میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے تخیل سب سے اہم عنصر ہے اسی وجہ سے خیالات کی پرواز بہت زیادہ ہوتی ہے اتنی کہ داستان گو اسی کے ذریعے جو چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے جہاں چاہتا ہے چلا جاتا ہے جو کچھ ہم انسان حقیقی دنیا میں حاصل نہیں کر پاتا ان ہی خوابوں کو اپنے تخیل کے ذریعے پُر کرنے میں کوشاں تھا اس نے اپنے تخیل کی اڑان سے آکاش کو چھونا، کوہ و بیابانوں کی سیر کرنا چاہتا تھا اسی لیے انسان نے قصہ کہانی میں ایسا مواد پیش کیا جو زیادہ تر مافوق الفطرت عناصر پر مبنی تھا تاکہ انسان وہ کچھ کریں جو وہ حقیقت میں نہیں کر پا رہا تھا۔جیسا کہ گیٹے سے منقول ہے کہ ''فن کی انتہا حیرت ہے'' اس طرح سے اطہر پرویز نے بتایا ہے کہ کس طرح انسان کا تخیل بڑھتا گیا اور انسان آگے ترقی کرتا گیا۔ابتدائی آفرینش میں انسان معصوم تھا وہ فطرت کے سامنے لاچار و بےبس تھا موذی جانور کے کاٹنے سے وہ مر جاتا اور تلاش معاش میں کبھی وہ جانوروں کا شکار کرتا اور کبھی وہ خود جانور کا شکار بن جاتا۔موسم کے تغیرات سے بچنا بھی مشکل ہوتا تھا لہذا دن و رات اسے یہی فکر لاحق ہوتی کہ وہ ارضی و سماوی کی ان طاقتوں پر کس طرح کامیابی حاصل کریں یہی خیال اس کے خوابوں میں ہوتا اور دن میں وہ ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں لگا رہتا۔اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''خیالات کی یہ روانی بے روک ٹوک ہوتی ہے اور یہ اپنی جگہ پر خود ایک
ٹکنیک بن جاتا ہے۔اس میں نہ پلاٹ ہوتا ہے اور نہ کردار، بس صرف

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص:۱۹

سوچنے والا ہوتا ہےاور ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ یہ سوچنے والا بھی خیالات کی
اس بھیڑ میں کھو جاتا ہے یہی حال داستان کا ہوتا ہے اور درمیان میں جب
داستان گو کو اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے تو وہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی
خارجی دنیا میں داخل ہوگیا ہے۔ کبھی وہ راوی بن جاتا ہے اور کبھی بغیر کسی
روایت کے اپنی بات کہتا ہے کیونکہ اسے تو محض اپنے وجود کا احساس دلانا
ہوتا ہے اسی لیے اس میں بے ربطی نمایاں ہو جاتی ہے اور ایک پیوند لگ
جاتا ہے'' [۱]

داستانوں کو زیادہ مقبولیت عرب، ایران اور ہندوستان میں ملی عرب اسے ''سمر'' کہتے تھے اور داستان سنانے والے کو سامر کہتے ہیں۔ وہاں اسے فن کا درجہ حاصل تھا۔ عرب میں ترقی کر کے یہ فن ایران پہنچا۔ اور یہاں بھی اسے ترقی حاصل ہوئی۔ اس کے متعلق اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''ایران کے قصہ گویوں کی سماجی حیثیت بری نہیں تھی۔ ان میں سے جو
قصہ گو اچھے تھے ان کی رسائی درباروں میں بھی تھی اور عوام بھی انھیں
عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ جب دربار میں پہنچ جاتے تھے تو انھیں
شاہی داستان گو کا منصب بھی مل جاتا تھا، جسے 'نقال باشی' کہتے تھے۔ یہ
لوگ اپنے کو اور معزز اور محترم بنانے کے لیے اپنے قصوں میں ''شاہنامہ
فردوسی'' کے واقعات بھی کہیں کہیں سے جوڑ کر کرتے تھے۔ ایرانیوں کو
قصہ سننے سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ان کے دستکار کام کرتے جاتے تھے
اور اس درمیان میں قصہ سنتے جاتے تھے اور جب فرصت ہوتی تو پھر ان
کو قصہ سننے سے کون روک سکتا تھا۔ قہوہ خانے اور چائے خانے تو قصہ
گویوں کے اڈے بن گئے تھے لیکن گرمیوں میں تو کھلے میدانوں میں
سناتے تھے۔'' [۲]

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۱

[۲] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۳

آہستہ آہستہ داستان کے فن کو اور دلچسپ بنایا گیا وہاں عربوں نے اس میں طرح طرح کی چیزیں شامل کیں مثلاً قصہ کہانیوں میں جن اور پریوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ اسلامی روایات شامل کر دیں۔ جس سے داستان میں ایک دلچسپ اضافہ ہوا۔ مثلاً اطہر پرویز رقمطراز ہیں کہ:

''عرب داستان گویوں کا جہاں تک تعلق ہے ان کے یہاں خاص بات یہ تھی کہ اس میں جن و پریوں کا ذکر تو تھا ہی لیکن ان کے ساتھ ہی اسلامی معاشرت کی رنگ امیزی بھی کی گئی۔ اس کی بہترین مثال الف الیلہ کی کہانیاں ہیں۔ عرب قصوں میں ہمیں لوک کہانیوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہے ہیں بلکہ بعض جگہوں پر پوری پوری لوک کہانیاں شامل کر لی گئیں، جس کا بظاہر اصل قصے سے کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا۔ عربوں کے اس طریق نے داستان کے فن کو ایک نیا انداز دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس روایت کو ایران اور ہندوستان میں نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ اس سے بڑے بڑے کام لیے گئے۔ عروج اسلام کے بعد قصہ گوئی کو اور زیادہ رواج اس لیے بھی ملا کہ موسیقی، سونگ اور ناٹک قسم کی چیزیں مذہباً ممنوع تھیں۔ اس لیے جہاں فنون لطیفہ میں فن کا اظہار فن تعمیر کے ذریعہ ہوا ِ ادب میں داستانوں کے ذریعہ ہوا۔ اردو زبان میں قصہ کہانی کی روایت مشرق کی نمایندہ تہذیبوں کی پروردہ ہے۔ کوئی کہانی سنسکرت سے فارسی میں آئی اور اس نے ہندوستانی سے ایرانی شہریت قبول کر لی۔ پھر ایران سے فارسی زبان کے توسط سے اردو میں آئی اور اس پر ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ بعض داستانیں عربی سے فارسی میں آئیں اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئیں'' [۱]

اس کے بعد وہ قصے کہانیوں کی کچھ خصوصیات بھی بتاتے ہیں۔ مثلاً قصے کہانیوں میں عموماً

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۴/ ۲۵

جادو کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ کوئی مسئلہ اگر مشکل ہے تو ساحر اپنے سحر سے ایسے فوراً حاصل کر لیتا ہے۔ اور کوئی منظر جب ساحر بیان کرتا ہے تو لوگوں کے ذہن مسحور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سنانے والا ایسا ہو جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہوتا کہ وہ اس کی قوت سے وہ فضا ترتیب دے سکے جس سے سامعین کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر گھوم جائے اور وہ خود کو اسی جگہ محسوس کر سکیں اور سب کچھ خود دیکھتے ہوئے محسوس کریں۔ فن داستان آگے بڑھا اس طرح کہ یہ فن خانہ بدوشوں میں پہنچ گیا تھا۔ یہ لوگ اس فن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے۔ اردو داستانوں پر فارسی داستانوں کا اثر زیادہ پڑا اس کے متعلق اطہر پرویز اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے کہ:

> ''اردو داستانوں نے مختلف جگہوں سے خوشہ چینی بھی کی، لیکن سب سے گہرا اور پائدار اثر ایرانی داستانوں کا پڑا اور قدرتی بات تھی کیونکہ فارسی ادب ہماری تہذیب کا ایک حصہ بن گیا۔'' [۱]

داستان کے فنی لوازم

اطہر پرویز نے داستان کے لیے پانچ اجزاء کا بیان کیا ہے۔ لیکن یہ ان کی اپنی دریافت نہیں بلکہ جن کا ذکر خواجہ امان نے کیا ہے انہی کی بات کو اطہر پرویز نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اول طوالت کے لیے داستان میں قصہ در قصہ کی شمولیت اس طرح ہو کہ سامعین کی دلچسپی قائم رہے۔ اور اس کے لیے داستان گو کو زبان و بیان پر گرفت ہونا بہت ضروری ہے تاکہ وہ دلچسپ انداز میں قصے کو آگے بڑھانے میں اور اس کی دلچسپی کو قائم رکھنے میں معاون ہو سکے۔ اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ داستان گو کا کمال ہے کہ طول اس طرح دیا جائے کہ داستان میں بےلطفی پیدا نہ ہو، بلکہ سننے والے جذبہ تجسّس برقرار رہے اور داستان گو کسی بات کو بار بار نہ کہے اور نہ سننے والوں کی دلچسپی ختم ہو جائے گی......الفاظ پر غیر معمولی قدرت۔ عبارت میں آہنگ ہونا چاہیے۔

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۷

جملوں کی بناوٹ، ترتیب اور حرکت میں باریکی، تناسب اور جاذبیت
ہو۔ عبارت ہموار ہو مگر یکسانیت نہ ہو۔ یہ بھی ہے کہ اچھے داستان گو کے
یہاں نئے نئے واقعات عبارت میں ہلکا ہلکا تغیر پیدا کرتے ہیں'' [1]

☆ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مضامین ایسے ہوں کہ عوام کی دلچسپی داستان میں قائم رہے۔

☆ تیسری خصوصیت خواجہ امان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ لطافت بیان کا خیال رکھا جائے۔

زبان آسان ہو۔ کیوں کہ داستان کا مخاطب عوام ہوتے ہیں۔ اس لیے عالمانہ زبان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ انداز ایسا اختیار کیا جائے کہ سامعین کو یہ محسوس ہو کہ اصل واقعہ کا بیان ہو رہا ہے۔

مندرجہ بالا پانچ خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے علاوہ انہوں نے ساحری کو بھی داستان کا ضروری حصہ بتایا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے زبان کے حوالے سے کئی لوگوں کے بیان کو الگ الگ ذکر کیا ہے۔ سید محمد اسمٰعیل اثر کے ترجمے کا ذکر کرتے ہیں اور رجب علی بیگ سرور کی داستان اور اس کی زبان پر ان کے خیالات کو لکھتے ہیں کہ وہ بھی آسان زبان کو داستان کے لیے اہم سمجھتے تھے۔ اکثر طویل داستانوں میں عموماً جنگ وجدل اور ساحری وعیاری نظر آتی ہے۔ جس سے ان میں دلچسپی قائم رکھی جاتی تھی۔ اور اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''ان داستانوں میں ساحروں اور عیاروں کے علاوہ جن لوگوں کی کثرت
ہے وہ ہیں بادشاہ، وزیر، امیر، تاجر، ان کے یہاں جلال بھی ہے اور جمال
بھی۔ یہاں سننے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے غیر معمولی کشش ہے
جو وہ اپنی اس دنیا میں نہیں پاتا۔ جہاں قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ جہاں
بیماریاں ہیں بھوک ہے، بیکاری ہے اور ان سن کے نتیجے میں موت ہے
لیکن یہ داستانیں اسے راہ فرار دیتی ہیں اور وہ ذرا سی دیر کے لیے اپنے
آپ کو اور اس دنیا کو بھول جاتا ہے اور ایسی حسین وجمیل، رنگین اور
پرشکوہ دنیا میں پہنچ جاتا ہے جس کی تعمیر داستان گو کے فن کی روایت کا

---

[1] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۳۴/۳۳

ایک اہم جزو ہے اور یہ جزو اس قدر دلکش ہے کہ ہماری قوت استدلال
اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔داستانوں کی اس دنیا میں عیش وآرام
کی فراوانی ہے۔جرأت ، ہمت ،شجاعت اور مردانگی اور وہ تمام مثبت
قدریں ہیں جو انسانوں کو ہمیشہ عزیز رہی ہیں اور داستان گواپنی قوت
بیان سے ان کو اور زیادہ معزز اور محترم بنادیتا ہے۔'' [۱]

داستانوں کی دلکشی داستانوں کے کرداروں اور ان کے ناموں کی وجہ سے بھی ہے۔جو اس انداز کے رکھے جاتے تھے کہ جن میں کشش اور جاذبیت محسوس ہوتی تھی۔لکھتے ہیں کہ:

''دراصل ان داستانوں کی دلکشی ،جاذبیت اور کشش ان ممتنع الوقوع
واقعات سے ہے جو مختلف شخصیتوں کی بنا پر ہے مثلاً عمروعیار ایک عجیب
وغریب شخصیت کا نام ہے جو طلسمات کا خزانہ ہے۔اس کے پاس ایسی
انوکھی اور طلسماتی چیزیں ہیں جیسے اس کی زنبیل۔جہاں بڑی سے بڑی چیز
یں جمع ہیں گویا یہ طلسمات کا ایک عجائب خانہ ہے جو کچھ ذہن انسانی میں
سما سکتا ہے وہ اس میں آجاتا ہے اور یہی نہیں اس کی گلیم ،کمند اور جال
وغیرہ بھی اس جادوی دنیا کی وہ اشیاء ہیں جو انسانی تصور میں چکا چوند پیدا
کرتی ہیں اور ہم لمحہ بھر کے لیے اپنی بے بسی کو بھول جاتے ہیں'' [۲]

عموماً داستانیں خیر وبد کی کہانی ہوتی ہیں۔جہاں اچھائی کی فتح ہوتی ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔اس طرح سے داستان کے سامعین کو نیک کرداروں سے ہمدردی رہتی ہے جو سب کچھ ٹھیک کرسکتا ہے۔کوئی پریشانی بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔اسی وجہ سے یہاں دو رنگ عام طور سے نظر آتے ہیں۔ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''داستانوں کے اندر دو رنگ ہوتے ہیں۔سیاہ، نیک وبد، خیر وبد، یہ انسانی
تہذیب کی wishfulthinking رہی ہے کہ وہ فتح اپنی پسندیدہ قدر کو

۱؎ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۴۲

۲؎ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۴۳

ہی دیتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ سفیدی سیاہی پر، نیکی بدی
پر اور خیر شر پر فتحیاب ہوتا ہے۔'' [1]

داستانیں مثالیت کا نمونہ ہوتی ہیں۔ تو داستان گو جس طرح چاہتا ہے قصے کو اپنے اعتبار سے بیان کرتا ہے۔ داستانوں میں مختلف تکنیک بھی نظر آتی ہیں کئی تمثیلی داستانوں میں مختلف تکنیک بھی نظر آتی ہیں کہی تمثیلی داستان تو کبھی سیدھی اور صاف زبان میں قصہ گوئی۔ سب رس، باغ و بہار، فسانہ عجائب، تینوں الگ الگ اور اپنے آپ میں اہم داستانیں ہیں۔ جو مختصر داستان کے فن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر

داستانوں کے لیے مافوق الفطرت عناصر بہت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ داستان گو انہیں کے ذریعے بڑی سے بڑی مشکل کو آسانی کے ساتھ حل کر لیتا ہے۔ جہاں وہ کچھ فطری اعتبار سے کرنے سے قاصر ہوتا ہے وہاں مافوق الفطری عناصر اس کی مدد کرتے ہیں۔ مافوق الفطری عناصر کو داستان گو داستان میں اس انداز سے استعمال کرتا ہے کہ عوام کی دلچسپی بھی اس سے بڑھنے لگتی ہے اور وہ اس منظر سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اور یہ عناصر داستان کے لیے بہت ضروری محسوس ہونے لگتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ عناصر کس طرح قصے کا حصہ بنے؟ انسان کے ذہن نے ابتداء سے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً اگر سورج چمکتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ چمکتا ہے۔ اور اسی طرح انسان نے خدا کو دریافت کر لیا۔ ابتداء میں جو چیزیں انسانی عقل سے بالاتر ہوتیں وہ انھیں مافوق الفطرت سے تعبیر کرتا۔ تو ہم پرستی اور بدشگونی کا رویّہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اور اس طرح مافوق الفطرت عناصر کے بارے میں اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''بالآخر مافوق الفطرت کے بھی دو خانے بن گئے۔ ایک وہ جو اچھے ہیں اور
دوسرے وہ جو برے ہیں۔ جن، پریوں کی گنتی اچھوں میں ہونے لگی اور
بھوت پریت کی بروں میں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جن اور پریاں لافانی ہیں

---

[1] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۴۵

لیکن بھوت پریت فانی ہیں۔دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں
کے یہاں باقاعدہ حکومت ہے۔جنوں اور بھوتوں کا اپنا اپنا بادشاہ ہوتا ہے
جواُن پر حکومت کرتا ہے۔اردو داستانوں میں جنوں، بھوتوں اور پریوں
کے تصورات پر اسلام اور ہندو مذاہب کے اثرات نظر آتے ہیں۔'' [1]

آگے وہ مافوق الفطری عناصر کا ادب میں ذکر کیا اہمیت رکھتا ہے اس پر گفتگو کرتے ہیں۔اور اس میں مافوق الفطرت اور اس کی مناسبت کا ذکر اس ابتداء سے کرتے ہیں کہ:

''ادب میں جب مافوق الفطرت کا استعمال ہو تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ
وہ شخص جو فوق فطرت سے دوچار ہے وہ ذہنی طور پر اس کو قبول کرنے کی
صلاحیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔اس کی قوت متخیلہ غیر معمولی ہونی چاہیے۔
اس میں روحانی پیکر دیکھنے کی صلاحیت ہونا چاہیے۔پھر وقت کا لحاظ رکھنا
بھی ضروری ہے، جیسے بھوت کے لیے رات کا وقت۔وہ ماحول کچھ جنگلی
سا اور دھندلایا ہوا ہونا چاہیے۔ہر طرف گندگی اور غلاظت ہو، خود وہ
گندے اور غلیظ ہوں۔وہ شخص جو انھیں دیکھے وہ خود کم بولتا ہے اور زیادہ
غور وفکر کرتا ہو۔پھر فضا اور گفتگو اس کے مطابق ہو اور یہ روحانی پیکر
(vision) اسی کو نظر آنا چاہیے جو اس پر اعتقاد رکھتا ہو۔یہ بھی ہوسکتا
ہے کہ وہ بظاہر اس کو تسلیم نہ کرتا ہو لیکن ذہن کے کسی گوشے میں چھپا ہو۔
میں نے فضا کی مطابقت کی بات کی۔یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ
پریوں کے لیے ماحول اور فضا مختلف ہوگی۔چاندنی رات، ہر چیز صاف
وشفاف ہو۔فضا میں رقص وموسقی کی مدھم آوازیں۔باغ، پودے،
پھول اور خوشبو وغیرہ کا اہتمام ہو۔'' [2]

---

[1] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۵۴/۵۵

[2] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۵۶

اردو داستانوں میں پیر،فقیر،سادھو، جادوگر، وغیرہ بھی اہم ہیں۔مافوق الفطرت عناصر کے استعمال کرتے وقت داستان گو ایسی فضا تعمیر کرتا ہے جس سے یہ کردار مکمل طور پر ہم آہنگ ہوسکیں۔عموماً داستان کا ہیرو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔کم عمری میں ہی وہ تمام علوم وفنون کا ماہر ہوجاتا ہے۔ہر مشکل کا حل اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔اس غیر معمولی ہیرو کی وجہ سے یا مافوق الفطری کرداروں کے داستان میں آجانے سے داستان گو داستان کو دلچسپ بناتا ہے اور جتنا چاہتا ہے اسے طویل کرسکتا ہے۔جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہے اس کے بیان کرنے میں یہ عناصر بہت آسانی پیدا کرتے ہیں۔کیوں کہ مافوق الفطرت عناصر کے سلسلے میں قاری کا بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔کوئی چیز اس کے لیے ناممکن نہیں ہے۔

آگے اطہر پرویز صاحب مافوق الفطری عناصر کے مختلف مظاہر کا ذکر کرتے ہیں۔جس میں کہتے ہیں کہ مافوق الفطری عناصر میں ہر قوم کے عقائد مختلف ہیں۔یورپ کی قوموں کے الگ اور ایشا کی قوموں کے الگ عقیدے ہیں۔یورپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یورپ والوں کا خیال ہے کہ پریاں اور دیو، فرشتوں کے ان قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے خدا سے نافرمانی کی تھی اور ان کو سزا ملی ہے کہ وہ اس سرزمین پر مارے مارے پھریں۔پھر ان کا محبوب مشغلہ ناچنا گانا ہے۔صبح اور شام کو تفریح کے لیے نکلتی ہیں۔یہ انسانوں کی بستی سے دور ویرانوں میں رہتی ہیں۔جس جگہ ان کے قدم پڑتے ہیں وہ بنجر ہوجاتی ہے۔یہ آدمیوں کی صحبت سے بچتی ہیں اور ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا جو کوئی ان کے قبضے میں آجاتا ہے، اسے اندھا کردیتی ہیں لیکن ان کی عادت انسانوں کے بچوں کو اٹھا کر لے جانا اور پالنا ہے۔ان کی عمریں بہت ہوتی ہیں۔یہ بہت چونچال اور شریر ہوتی ہیں۔جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت یہ بچوں پر اپنا سایہ ڈالتی ہیں اور ان پریوں کے مطابق ان بچوں کی عادتیں ڈالتی ہیں۔اچھی عادتوں کی پریاں اچھی ہوتی ہیں اور بری پریاں بری عادتوں کی ہوتی ہیں۔ان پریوں کا ذکر

Grimms Fairy Tales کی کہانیوں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔اس
سے ان کی عادتوں،مشغلوں،کرداروں پر روشنی پڑتی ہے۔'' [۱]

مشرق کی قوموں کے تصورات مغرب سے الگ ہیں۔وہاں جنات اور پریاں اپنا مختلف تصور رکھتی ہیں۔اس نظریے کے تحت اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''مشرق میں یہ عقیدہ رہا ہے کہ جنّات اور پریاں آگ سے پیدا ہیں
جیسے آدم خاک سے۔اس لیے ان دونوں میں اختلاف ہے۔اسی لیے
کہ پرستان کا دستور ہے کہ پریاں آدم زاد سے شادی نہیں کرسکتیں۔'' [۲]

جس طرح گلزارِ نسیم میں بکاولی پری آدم زاد پر عاشق ہو جاتی ہے تو باقی پریاں اسے ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں۔اسی طرح کئی داستانوں میں یہ چیز نظر آتی ہے۔پریاں جہاں رہتی ہیں وہ جگہ جنت کی مانند ہے۔ ہر چیز گویا خوبصورت منظر پیش کر رہی ہوتی ہے۔موسیقی،نغمہ،غرض ہر چیز وہاں موجود ہے۔آگے چل کر مغرب اور مشرق میں جو کردار زیادہ مشہور ہوئے یا جس طرح کے کردار وہاں کی داستانوں میں نظر آتے ہیں۔ان کا مفصل ذکر کرتے ہیں۔مغربی پریوں میں اوبرن پری کا ذکر کرتے وقت اوبرن پری کا خاکہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ:

''مغربی پریوں میں سب سے لمبا قد ''اوبرن'' کا ہے جو صرف تین فٹ
ہے لیکن ایشیا میں پریاں قد آدم ہوتی ہیں ورنہ تاج الملوک کی انگوٹھی
بکاولی کی انگلی میں کیسے آسکتی ہے۔ان کے پاس اڑن کھٹولے اور قالین
ہوتے ہیں اور یہ دور دراز کا سفر طے کر لیتی ہیں۔جنوں کا بادشاہ امیر حمزہ
کو بلانے کے لیے اُڑن کھٹولا بھیجتا ہے۔بعض جگہ ان کو پریزاد اُڑاتے
ہیں۔'' [۳]

---

[۱] داستان کا فن،اطہر پرویز،اُردو گھر،علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص: ۵۸

[۲] داستان کا فن،اطہر پرویز،اُردو گھر،علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص: ۵۸

[۳] داستان کا فن،اطہر پرویز،اُردو گھر،علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص: ۶۰

آگے ذکر کرتے ہیں کہ پریاں انسانوں پر عاشق ہوتی ہیں۔عموماً وہ انسان شہزادے یا بادشاہ ہوتے ہیں۔ پریوں کا جو ذکر داستان گویوں نے کیا ہے۔ وہ ساری خوبیاں اس زمانے کی شہزادیوں کی نظر آتی ہیں۔ اور یہ پریاں بھی گویا انسان ہی نظر آتی ہیں۔ پریوں کی طرح ہی پری زاد ہوتے ہیں۔ وہ بھی عموماً بادشاہوں والی ہی خصوصیات رکھتے ہیں۔جنوں کا ذکر مغرب میں نہیں ہے۔مشرقی داستانوں میں جنوں کا ذکر کثرت سے نظر آتا ہے۔اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ قرآن میں جنوں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔اور جنوں کو برائی کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔جنوں کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے درویشوں کے اسم اعظم سے مدد لی جاتی ہے۔جس سے انہیں انسانوں کا مطیع بنایا جاتا ہے۔ دیووں، جنوں اور پریوں کا ذکر بہت سی داستانوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ دیو عموماً کمینے ہوتے ہیں۔ یہ اپنی ہیئت بھی بدل سکتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں بدصورت ہوتے ہیں ان کی عادتیں وحشیانہ ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ مافوق الفطرت عناصر میں ایک اہم عنصر جادو بھی ہے۔جھاڑ پھونک کرنے والوں لوگوں کو ٹھیک کرنے اور اس سے جادوگروں کی باتوں کو لوگ اپنے لیے دوا سمجھنے لگتے ہیں۔ جادوگروں کے حلیہ کے بارے میں اطہر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''جادوگر یا ساحر کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے وہ ذرا ہیبت ناک ہے۔ لمبے قد کا سیاہ فام، بڑے بڑے غلیظ دانت منھ سے باہر نکلے ہوئے اور جس کے چہرے پر درندگی کے تمام آثار نظر آتے ہیں۔ ساحروں کی یہ تصویر ہمیں ''فسانہ عجائب''، ''طلسم ہوش ربا'' اور ''بوستان خیال'' میں نظر آتی ہے۔ سامری، جمشید، نیرنگ جادو، دام خبیثہ ان داستانوں کے وہ عظیم جادوگر ہیں، جو ایسا لگتا ہے کہ کائنات کو اپنی مٹھی میں لیے ہوئے ہیں لیکن ان کو جب ہم قریب سے دیکھتے ہیں تو یہ سب ان جملہ صفات کے باوصف انسان نظر آتے ہیں۔ جادوگرنیوں میں جنسی خواہش اسی طرح ہوتی ہے جیسی عورتوں میں فسانہ عجائب کی جادوگرنی اس کی واضح مثال ہے۔''[۱]

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۶۶/ ۶۷

اس کے علاوہ جادوگروں کی دیگر خصوصیات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ان میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی ہیئت بدل لیتے ہیں۔ آدمی سے ہرن جانور، پرندے، درخت، پتھر وغیرہ اشکال میں خود کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ عجیب وغریب سواریوں پر چلتے ہیں۔ ان کے محل، باغات بھی ہوتے ہیں جہاں ہر جگہ سحر ہوتا ہے۔ کوئی آدم زاد وہاں نہیں جا سکتا۔ اس طرح کے جادوئی منظر اکثر داستانوں میں ملتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ جادوئی فضا ان داستانوں میں اکثر نظر آتی ہے اور داستان کے طلسمی پس منظر کو واضح کرتی ہے۔ آرائش محفل میں بھی ایک صحرائے سحر نظر آتا ہے۔ کہیں پر تو یہ صحرا پُر خار نظر آتا ہے تو کہیں میدانوں میں صرف چھپکلیاں نظر آتی ہیں، کہیں پر تو محض بچھو ہی بچھو ہیں کہیں زمین آگ کی طرح تپتی ہے تو کہیں دریائے پُر خون بہتا ہے۔ ہمیں ایسی سرزمین بھی دکھائی دیتی ہے جہاں قیمتی جواہرات، الماس، اور زمرد سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اس مافوق الفطرت دنیا میں گیدڑ اور پرندے عالم الغیب ہیں۔''[۱]

سحر میں ایک حصہ آگے بڑھیں تو تعویزوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جیسے بازو پر باندھا جاتا ہے یا گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جادوگر اور بھی بہت سے عمل کرتے ہیں جن کا ایک اہم عمل انتقال روح کا بھی ہے جس کا ذکر بھی داستانوں میں زیادہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نقش سلیمانی کا ذکر بھی داستانوں میں عام طور سے ملتا ہے۔ جس سے جادو ہونے کے ساتھ ساتھ ردّ سحر کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ توہم پرستی کی مثالیں بھی بہت نظر آتی ہیں۔ مثلاً بری نظر کا لگنا، داہنی آنکھ پھڑکنا، بلی کا راستہ کاٹنا، کسی کا چھیکنا بدشگونی تصور کی جاتی ہے۔ اس طرح کے اوہام کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے۔ علم نجوم بھی تو ہم پرستی کی ہی ایک قسم ہے۔ جس کے ذریعے بچہ کی پیدائش پر اس کی جنم پتری نجومیوں یا پنڈتوں سے بنوائی جاتی ہے جس میں اس کی زندگی کا خلاصہ ہوتا ہے۔ سب کچھ پھر اس کے حساب سے ہی کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ:

> ''بوستان خیال' میں یہ کام حکیم قسطاس الحکمت سے لیا گیا ہے۔ اگر یہ نہ

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۶۸

ہوتے تو شاید معزالدین صاحبقران کا درجہ حاصل نہ کرتے۔ بوستان
خیال میں حکیم قسطاس الحکمت کی شخصیت پورے طور پر حاوی ہے۔ وہ
غیر معمولی دماغی اور روحانی قوت رکھتے ہیں۔ جن، دیو، پری ان کے
تابع ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل ان کے سامنے کھلی کتاب ہے۔'' [۱]

الغرض داستانوں میں مافوق الفطری عناصر اس حد تک حاوی ہیں۔ کہ ان کے بغیر داستانوں کی تعمیر ممکن نہیں تھی۔ اگر یہ عناصر ہی داستانوں سے نکال دیے جائیں تو داستانیں روکھی پھیکی رہ جائیں گئیں۔ وہاں صرف محظوظ ہونے کے لیے داستانیں سنائی جاتی تھیں اس لیے یہ عناصر اس میں بھرپور دل بہلانے کے لیے لمحوں میں سب کچھ حاصل کرنے کے لیے، بڑی سے بڑی مشکل کے حل کے لیے، ہیرو چوں کہ اچھائی کے لیے قربانی دینے کے لیے نکلتا تھا تو اس کی فتح میں معاون بننے کے لیے ہوتے تھے۔ جہاں عقل کا گزر کم ہی ہوتا تھا۔ سب کچھ تخیل پر مبنی تھا۔ انسان اپنے خالی اوقات میں اس داستانی دنیا میں سیر کر کے حظ حاصل کرتا تھا۔ اس لیے داستان گو مافوق الفطری عناصر کو کچھ اس انداز سے عوام کے سامنے رکھتا کہ وہ عش عش کر اٹھے۔ لہٰذا ان عناصر کی داستان میں بہت اہمیت ہے ان عناصر کے بغیر داستانیں داستان نہیں کہی جاسکتیں۔ اسی لیے ان عناصر پر اطہر پرویز نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

داستانوں میں کردار نگاری اور داستانوں کے اہم کردار:

داستانوں کے کردار کامل شخصیت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ چوں کہ داستانیں مثالی ہوتی ہیں اسی وجہ سے داستان گو ان کرداروں میں ایسی قوتِ ہنر ڈال دیتا ہے۔ جس سے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ گویا سب کچھ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ بہت سی باتیں یا واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو ذہن کس بھی طرح قبول نہیں کرتا۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''داستانوں میں کرداروں کی عظمت ان کی احساس عزت میں ہے اور وہ
اس بات میں کہ جنگ وجدل کیا جائے، بات بات میں تلواریں سوت لی
جائیں۔ بہادری اس میں ہے کہ ہر چیلنج کو قبول کر لیا جائے یہاں کردار

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۷۴

،زندگی اور موت کی اٹل حقیقتوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں ۔کبھی کبھی
تو ایسا لگتا ہے کہ ان کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ یہاں محبت اس
لیے نہیں کی جاتی کہ اس کا کوئی انعام ملے گا بلکہ اس لیے کہ محبت کا خود
انجام ہے اور اصل محبت وہ ہے جس کے لیے داستانوی کردار مصیبت
اور تکلیف اٹھائیں، جہاں محبت کے لیے ناممکن کو ممکن بنادیا جائے۔
داستانوں کا ہیرو ایک خیالی دنیا کا باشندہ ہے جہاں نہ روٹی کا مسئلہ اسے
پریشان کرتا ہے اور نہ اس کے ذمے کوئی فرائض ہیں جنھیں اسے انجام
دینا ہے۔'' [۱]

داستانوں کے کرداروں کے سلسلے میں یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان میں عوام کا نہیں خواص کا ذکر ہوتا ہے۔اس لیے اس کے کردار شہزادے،شہزادیاں، بادشاہ، وزیر، ملکہ وغیرہ ہی داستانوں کے مرکزی کرداروں میں نظر آتے ہیں۔عوام بھی داستانیں اسی لیے دلچسپی سے سنتے ہیں کہ انہیں بھی خواص کی زندگی کو دیکھنے کا اشتیاق رہتا ہے۔اور اسی لیے داستان گو بھی ان کی زندگی کو اور زیادہ جاذب نظر بنا کر پیش کرتا تھا۔جس سے عوام کو حسرت کا احساس ہوتا تھا۔وہ انہیں دیکھنے کے مشتاق رہتے تھے۔جس کا حل داستان گو کی زبانی سن کر وہ گویا وہاں کی سیر کر لیتے تھے۔تصور کی آنکھوں سے۔

داستان کے کردار عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں ۔اچھے کردار، برے کردار، اچھے کرداروں کو زیادہ ابھارنے کے لیے داستان گو برے کرداروں کو بھی پیش کرتا ہے۔ برے کردار ہیرو کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ برے کرداروں میں بزدلی، بدصورتی، کمینگی عام طور پر نظر آتی ہے۔ جب دونوں کا آپسی ٹکراؤ ہوتا ہے تو بالآخر فتح نیک کرداروں کی ہوتی ہے۔اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''یہ داستانوں کا بنیادی تصور ہے کہ خیر یا نیکی ہمیشہ بدی یا شر پر غالب
ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس تخلیقی یا بنیادی تصور کا پھیلاؤ ایسے کردار کی
تخلیق کے بغیر ناممکن ہے، جو اس تصور کی تشریح اپنے کردار اور عمل سے

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۸۳

کرتے ہیں۔اس لیے داستانوں میں نیکوں کا ذکر اور بدکرداروں کا بیان
اوران کے باہمی ٹکراؤ کی کیفیت ناگزیر ہے۔'' ۱؎

کبھی کبھی کردار کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات ایسے انداز میں ادا ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ داستان گو نے خود تقریر شروع کر دی ہے۔ اور یہ داستان کی کمزوری تصور کی جاتی ہے۔ کچھ کردار داستان میں علامتی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ کردار نگاری میں ایک بات یہ بھی اہم ہے کہ داستان گو اگر کسی کردار کو مثبت پیش کر رہا ہے تو آخر تک وہ کردار مثبت ہی رہے گا، یہاں تک کہ وہ منفی خواب بھی نہیں دیکھے،کوئی منفی بات سوچے گا بھی نہیں۔اس دنیا پر تغیرات کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور بس اس کی نیک فطرت میں اضافہ ہی ہوگا۔ گویا کہ داستانوں کے کردار سپاٹ ہوتے ہیں۔ داستانوں میں عموماً تین طرح کے کردار نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ:

''اول تو ہیرو جو ہر دشمن پر حاوی ہوتا ہے۔ دوم دشمن جو دنیا کی ہر برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور ہیرو کا رفیق جو پرانے قصوں کا رفیق، داستانوں کا مسخرا ہے جو بعد کی بڑی داستانوں میں عیّار بنا دیا گیا ہے۔ نیکی اور بدی کے اس تصادم میں عیّار نیکوں کے جاسوس اور مددگار ہوتے ہیں اور سننے والوں اور پڑھنے والوں کی اکتاہٹ کو ختم کرتے اور داستان کو دلچسپ بناتے ہیں۔ جہاں داستان کی دلچسپی میں فرق آیا، عیار داخل ہوگئے۔ داستان امیر حمزہ میں یہ لوگ محض اسی کام کے لیے رکھے گئے ہیں اور عمرو عیار کا کردار تو اردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی شکل ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ عمرو عیار اور اس کے دوسرے ساتھی وہی سب کرتے ہیں۔'' ۲؎

اہم کرداروں میں عمرو عیار کا کردار داستانوی دنیا میں بہت مقبول رہا ہے۔ اس سلسلے میں اطہر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''عمرو عیار کی تو شان ہی اور ہے۔ ان کی عجیب وغریب ہیئت، ان کی

۱؎ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۸۴/ ۸۵

۲؎ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۹۳

اڑان، ان کی کنجوسی اور لالچ۔ اوراس کے ساتھ ہی امیر حمزہ اوران کے فرزندوں کے جاں نثار۔ داستان پڑھتے پڑھتے ہم اتنے مانوس ہوجاتے ہیں کہ جہاں انہوں نے قدم رکھا اور ہماری باچھیں کھل گئیں، ہم ان کے ہر عمل سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی بخالت، ان سے نفرت پیدا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ ہمارے ہنسانے کے لیے ہے۔ وہ ہماری تفریح کا سامان ہیں۔ ان کی شخصیت میں جو انسانی کمزوریاں داخل کی گئی ہیں۔ یہ داستان کو اور زیادہ ہم سے قریب کر دیتی ہیں۔ اردو داستان کا یہ عظیم کردار ہے۔.........عمروعیار کی بدولت اردو کو ایک عظیم ظریف کردار نصیب ہوا۔ جہاں ساحروں کو بے ہوش کیا، وہیں ان کے کپڑے اتارے اور انھیں اپنی زنبیل میں ڈالا۔ ان کے پاس کچھ کراماتی تحفے ہیں اوران کی عیاری کی دھوم دور دور تک ہے۔ عمروعیار کی زنبیل میں کیا کچھ نہیں تھا اس میں سات شہر اور سات دریا تھے۔ وہاں ان کا سکّہ چلتا ہے اور وہ گلیم اوڑھنے سے چھپ جاتے ہیں۔"[1]

اس کے علاوہ فسانہ عجائب کی ملکہ مہر نگار بھی اردو داستانوں کا ایک جیتا جاگتا کردار رہا ہے۔ جس میں وہ دل اور دماغ دونوں کا استعمال کرتی نظر آتی ہے۔ اس کا کردار سراپا اچھائی نہیں بلکہ وہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ وہ متحرک اور فعال ہے۔ اس کے علاوہ میر امن کے خواجہ سگ پرست اور اس کے دو بھائیوں کے کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے کرداروں کی زبان سادہ اور آسان ہے اس لیے یہ کردار بڑی آسانی سے ہم پر اثر انداز ہوجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بوستان خیال کے حکیم قسطاس الحکمت بھی بہت مشہور کردار رہے ہیں۔ پوری داستان پر ان کا سایہ نظر آتا ہے۔ ان کی کردار نگاری اتنی گہری ہے کہ ان کے سامنے ہیرو ماند پڑ جاتا ہے۔ ان کے بارے میں اطہر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

---

[1] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۹۴

''وہ بہت بڑے عالم ہیں ۔ یہ علم نجوم کے بل بوتے پر غیب کا سارا حال معلوم کر لیتے ہیں ۔طلسم اجرام واجسام کے مالک ہیں اسے ذوالقرنین کے حکم سے معلم اول حکیم ارسطوئے الہیٰ نے ترتیب دیا تھا۔حکیم قسطاس الحکمت ،وہ آخری داروغۂ طلسم ہیں ۔..........یہ ایسا عجیب وغریب کردار ہے جس کی مثال ممکن نہیں۔طلسم ہوش ربا کے بزرچمہر ، ان کا چربہ معلوم ہوتے ہیں لیکن حکیم قسطاس الحکمت کا ان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خارجی اوصاف سے شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے ان کی ذات انسان ہونے کے باوجود غیر انسانی معلوم ہوتی ہے۔وہ جس ڈرامائی شکل اور شان سے داستان میں داخل ہوتے ہیں، اسی شان سے نکل بھی جاتے ہیں۔'' [۱]

الغرض یہ داستانوں کے اہم کردار ہیں لیکن داستان میں کردار نگاری سے زیادہ واقعہ نگاری پر زور دیا جاتا ہے۔اس لیے کرداراس قصے کی مطابقت سے آتے ہیں جو داستان گو کے ذہن میں ہوتا ہے۔اس لیے تمام نیک کردار گویا فرشتہ معلوم ہوتے ہیں۔داستانوں کے کچھ کردار ایسے ہیں جو ابھر کر سامنے آتے ہیں اور ہم پر اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

داستانوں میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کے عناصر:

داستانیں تہذیب تمدن کے مرقع بھی پیش کرتی ہیں۔داستانوں میں ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں بڑے پیمانے پر نظر آتی ہیں۔داستانوں میں خواص کی تہذیبی زندگی کے ساتھ ساتھ ہمیں عوام کے معتقدات بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں ٹونے ٹوٹکے ،سحر ، ردّسحر جیسے توہمات نظر آتے ہیں۔اس بارے میں اطہر پرویز رقمطراز ہیں کہ:

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آج بھی صدقے دینے سے بلاؤں کا

---

[۱] داستان کا فن،اطہر پرویز،اُردو گھر،علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص: ۱۰۰/۱۰۱

رڈِ سحر ہوتا ہے، کالا ٹیکا لگانے ،تعویذوں کے باندھے جانے ، دھونی
رمانے سے ان سب کا توڑ ہوتا ہے۔ چونکہ روح غیر فانی ہے،اس لیے
اسے آرام پہنچانے کے لیے مرنے کے بعد بھی ایسے عمل کیے جاتے ہیں
جن سے مردے کی روح کو آرام اور سکون حاصل ہو۔ گویا یہ توہمات
مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ مذہبی عقائد نے تقدیر پرستی کے
جذبے کو اور بھی تقویت دی اور انسانوں کو جب یہ احساس ہوا کہ انسان
کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی ہے تو اس کو جاننے کی فکر ہوئی ، فالیں دیکھی
جانے لگیں ،جنم پتریاں بنیں۔'' [۱]

داستانوں کی تہذیب کے بارے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر چہ داستان گو ملک یمن کا ذکر کر رہا ہو یا ملک ایران کا ،قصہ عرب کا بیان ہو رہا ہو یا قسطنطنیہ کا ،سب ملکوں کی تہذیب و معاشرت کی جو تصویر کشی ہوگی ۔ وہاں سب میں ہندوستان کی معاشرتی زندگی ہی بیان ہوگی ۔ ہندوستانی رسم و رواج ہی داستان گو پیش کرتا ہے ۔ناموں کو تبدیل اس لیے کرتا ہے ۔ کہ سامعین کو قصے کی حقیقت کا گمان گزرے اور دلچسپی میں اضافہ ہو۔ اور ہندوستانی رسمیں داستانوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں ۔ کہیں عورتیں ستی ہو رہی ہیں ۔ کہیں شہزادوں کی جنم پتریاں نکالی جا رہی ہیں ۔لکھنو اور دلی کی تہذیب عموماً داستانوں میں نظر آتی ہے۔ دہلی کے داستان گو البتہ بیان میں سادگی کو ملحوظ رکھتے ہیں ،فصاحت و سلاست کا خیال رکھتے ہیں ۔ جب کہ لکھنو کے داستان گو رنگینیٔ بیان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ تصنع اور عبارت آرائی ، بناوٹ ان کی داستانوی زبان میں زیادہ نظر آتی ہیں ۔

مہمان نوازی ہندوستانی تہذیب کی ایک اہم خصوصیت ہے ۔ جہاں داستان گو جب دسترخواں سجاتا ہے ۔تو گویا کوئی ایسا کھانا نہیں ہوتا جو اس دسترخوان پر موجود نہ ہو۔ ہر چیز ، ہر کھانے کا ذکر پوری جزئیات کے ساتھ داستانوں میں نظر آتا ہے ۔اس کے علاہ ہر ہر چیز اپنی جزئیات کے ساتھ نظر آتی ہے اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

---

[۱] داستان کا فن ،اطہر پرویز ،اُردو گھر علی گڑھ ،۲۰۱۵ء ،ص: ۱۱۲

''ہندوستان کا شاید ہی کوئی کھانا ہو جو اس دسترخوان پر نظر نہ آتا ہو،
کپڑوں میں کوئی لباس ایسا نہیں جس کا ذکر نہ ہو، شادی بیاہ کی رسومات
میں کوئی رسم ایسی نہیں، جن کا کسی نہ کسی شکل میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں
رواج نہ ہو۔ جہاں میلے ٹھیلے کا ذکر ہے وہاں کا منظر دیکھئے تو ہندوستانی
میلوں کی رونق اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ نظر آتی ہے۔'' [۱]

شادی بیاہ کی رسموں کا جب ذکر ہوتا ہے تو وہ بھی خالص ہندوستانی رسمیں ہیں۔ جہاں ہندو مسلم دونوں کی رسمیں نظر آتی ہیں۔ جس سے دونوں قوموں کے درمیان میل جول بھی نظر آتا ہے۔ الغرض یہاں مغلوں کے زوال کے وقت کی حکومت اور لکھنؤ میں سجتے درباروں کی بدولت معاشرے میں پھیلی عیش و عشرت کا ماحول نظر آتا ہے۔ اطہر پرویز صاحب نے بھی اس طرح ذکر کیا ہے کہ:

''چار درویش میں دلی کی معاشرت کی بڑی بھرپور عکاسی ملتی ہے اور اس
میں اپنے زمانے کی سماجی حالت، رسم و رواج اور عوام الناس کے معتقدات
کی ایک دلچسپ تصویر ہے۔ معاشرت کی یہ عکاسی ''نوطرز مرصع'' اور ''
باغ بہار'' میں ذرا بہت ترمیم و تنسیخ کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ
ان داستانوں میں عام انسانوں کی تصویر خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یہاں
بھی زیادہ تر زور بادشاہوں، شہزادوں اور درباریوں پر دیا جاتا ہے۔'' [۲]

معاشرت کی بہترین تصاویر جزئیات نگاری کے ساتھ طلسم ہوش ربا میں نظر آتی ہیں۔ جہاں سب کچھ اس معاشرے کا نقشہ کھینچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ الفاظ و محاورے لکھنؤ کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اطہر پرویز اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ محل جادو کا محل، یا خوابوں کا محل نہیں ہے بلکہ ایک جیتا جاگتا، پر رونق
اور آباد گھر ہے جہاں ہر طرف چہل پہل ہے اور بہار آئی ہوئی ہے۔
بادشاہ، وزیروں اور امیروں کے محل اور محلات میں نوکروں، خادموں،

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۱۸

[۲] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۲۱/۱۲۲

آیاؤں ،خواصوں کا مجمع ہے ، بوڑھی ، بوڑھیاں ہیں تو اپنی باتیں کرتی ہیں، جوان ہیں تو نازونخرے بھی دکھاتی ہیں۔ان کی چھیڑ چھاڑ میں ایک رنگینی ہے۔فریاد وفغاں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جنگ ہورہی ہے، کسی نہ کسی کا پیارا گیا ہوا ہے۔وہ ان کے لیے دعائیں مانگتی ہیں،منتیں مانتی ہیں کوئی کہتی ہے کہ ’’ خداوند میرے وارث کو بچالے‘‘ کوئی پکارتی ہے کہ’’ خدا! مجھ کو دنیا سے اٹھالے،کسی کی فریاد تھی کہ’’ مجھ کو میرے وارثوں کا مردہ نہ دکھانا،اے کریم !ان کے غم میں نہ رلانا‘‘ کوئی گود پھیلا کر دعا کرتی ،ماتھا زمین پر رگڑتی ،کوئی بالوں سے جھاڑو دیتی۔کسی نے پیرایکا ایک کا پیسہ اٹھایا کی ایکا ایک میری مراد برآئے۔کسی نے اسی ۸۰ پیادہ سوسوار کو مانا تھا کہ ہم پر سے بلا رد ہووے۔کوئی ترت پھرت کی نذر مانتی کہ ہماری مدد غیب سے آوے۔کسی نے پیر دیدار کے کونڈے انے تھے۔کوئی کہتی کہ میں کھڑے پیر کا روزہ رکھوں گی ،اور میری تمنا پوری ہوگی تو گھر کھڑا دونا دوں گی۔‘‘ [1]

بوستان خیال میں بھی ہندوؤں ،مسلمانوں اورعسائیوں کا ذکر ملتا ہے ۔اس میں عشق وعاشقی کے مضامین زیادہ ہیں ۔البتہ داستانیں جب کچھ آگے بڑھتی ہےتو کچھ داستانوں میں انگریزوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔جیسے چہار درویش میں انگریزوں کا ذکر ملتا ہے ۔رانی کیتکی کی کہانی میں بھی ہندوستانی تہذیب نظر آتی ہے۔ادبی تخلیق کسی نہ کسی حوالے سے اپنے عہد کی ترجمان ہوا کرتی ہے۔جس سے اس عہد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔باغ و بہار میں دلی کی تہذیب جھلکتی ہے اور فسانہ عجائب میں جا بجا لکھنو کی معاشرت وسیع پیمانے پر نظر آتی ہے۔کہیں نوکروں ،غلاموں ،خادموں ،خواصوں کی بھیڑ نظر آتی ہے۔تو کہیں شہزادے شہزادیاں نظر آرہی ہوتی ہیں۔لکھنو کی نوّابیت لکھنوی دور کی کم وبیش ہر داستان میں نظر آتی ہے۔عیاشی کا دور دورہ ہے۔

داستانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عموماً داستانوں میں تبلیغ اسلام کا جذبہ نظر آتا ہے۔اگر چہ اس

---

[1] داستان کا فن،اطہر پرویز،اُردوگھر علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص: ۱۲۳/۱۲۴

وقت حاکم حکمران سیاسی طور پر انگریزوں سے شکست کھا چکے تھے۔لیکن داستانوں کو انہیں فاتح بنا کر ہی پیش کرتا تھا۔جاگیردارانہ سماج میں کٹنیوں سے جاسوسوں والے کام بھی لیے جاتے تھے۔اس کی مثالیں بھی جگہ ''جگہ طلسم ہوش ربا'' اور ''باغ و بہار'' میں نظر آتی ہیں۔ان کی زبان و بیان بھی بالکل اسی انداز کی اختیار کی جاتی ہے جو اس وقت رائج تھا۔ہر بات موقع محل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔اس کے متعلق اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

> ''طلسم ہوش ربا'' میں محلات کی محل والیاں اور خادمائیں جو گفتگو کرتی ہیں ان میں موقع، مصلحت، منصب، فرض، غرض ہر بات کا لحاظ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انہیں نوکری کرنا ہے، اپنا فرض نباہنا ہے اور کسی کا دل دکھانا نہیں۔ان میں کنیزیں، ماما، اصیل، مغلانی ، پیش خدمت سب اپنے اپنے کام کرتی ہیں تو ہمیں واجد علی شاہ کا حرم نظر آتا ہے۔ایک موقع پر جب حنظل اپنی بیٹی ملکہ کو جرم عشق میں پکڑتی ہے تو اس وقت کی بول چال خالص عورتوں کی زبان ہے۔اس سے پورے ماحول اور معاشرے پر روشنی پڑتی ہے''۔[۱]

الغرض داستان اپنے عہد کی ترجمان ہوتی ہیں۔داستانوں سے اس عہد کی تہذیب، معاشرت رہن سہن، زبان و بیان غرض سب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔جو اس عہد کو ہمارے سامنے جیتے جاگتے انداز میں پیش کر دیتی ہیں۔اور ہم تصور کی آنکھ سے اس دور کو دیکھتے ہیں۔محسوس کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

داستانوں میں جزئیات نگاری اور زندگی کی پیشکش کا تصور:

داستان چونکہ سننے کا فن ہے۔اسی لیے داستان گو قصہ بیان کر رہا ہوتا ہے اور سننے والے قصہ سن رہے ہوتے ہیں۔داستان گو کے لیے لازم ہے کہ وہ قصہ اس انداز سے بیان کرے کہ سامعین کی دلچسپی برقرار رہے اس کے لیے داستان گو طول دینے کے فن سے واقفیت ہو اور اس کام کے لیے زبان پر قدرت کا حامل ہونا ضروری ہے۔طوالت اگر لطیف نہ ہو تو وہ کلام کا عیب بن جائے گی طوالت کے لیے ضروری ہے کہ داستان گو ہر چیز کو اس کی جزئیات کے ساتھ بیان کرے۔ہر بات کی تشریح کرے اور باریک سے باریک چیز کو بھی واضح

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۳۰/۱۳۱

طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرے۔اسی لیے جزئیات نگاری داستان کی اہم کڑی ہے۔جس سے داستان گو بہت کام لیتا ہے۔اسی کے ذریعے وہ داستان کو طویل سے طویل تر کرسکتا ہےاور سامعین میں اشتیاق کو پروان چڑھا سکتا ہے۔اوراسی کے ذریعے انہیں بہترین اختتام کو سننے کا مشتاق بنا سکتا ہے۔اسی لیے یہ بہت ضروری جز ہے داستانوں کا۔اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''داستان سننے والے جانتے ہیں کہ وہ قصہ سن رہے ہیں۔اس وقت ان کا ذہن کسی علمی موشگافی کے لئے تیارنہیں ہےلیکن اس کی وجہ سے قصہ گو کے لئے لازم ہوجاتا ہے کہ بیان دلچسپ ہوااور بقول خواجہ امان دہلوی کے ''مدت دراز تک اختتام کے سامعین مشتاق رہیں'' اس لئے کہ داستان کا نسخہ جن اجزاء سے مرکب ہے وہ رزم، بزم، عیاری وظرافت اورحسن وعشق ہیں۔ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک دلچسپی فراہم کرسکتا ہے بشرط یہ کہ داستان گو بیان پر قدرت رکھتا ہو۔ بیان پراس لئے بھی قدرت ہونا چاہیے کہ یہاں ان گنت کرداراوران گنت واقعات کے تارو پود سے داستان کا تارو پود تیار ہوتا ہےاور داستان گو کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے بیان میں زبان کی حلاوت بھی گھول دے۔اگر وہ سخن سے خو گرنہ ہوتو یقیناً طول کلام عیب بن جائے گا اوراگر حکایت لطیف ہوگی تو پھر دراز تر ہونے کی بھی صرف خوشی سے گوارا کیا جائے گا بلکہ اس میں لطف بھی آجائے گا۔اسی لئے داستانوں میں جوشِ خطابت بھی ہےاور تخیل کی بے روک ٹوک اڑان بھی۔ یہاں اندازِ بیان سپاٹ اور خالص بیانیہ بھی اسی لئے نہیں ہوتا کہ اس میں خطابت کا عنصر حاوی ہے۔''[۱]

ابتدائی دور میں داستان سنانے کا فن تھا۔ چنانچہ اب جب ہم داستانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ داستانوں میں لہجہ سنانے والا ہی ہے۔داستان گو ہر چیز کو اسی انداز میں بیان کرتا ہے۔

---

۱ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۳۴/ ۱۳۵

خطابت داستان گو کے لیے بہت اہم عنصر رہا ہے لہذا داستانوں میں ہمیں یہ عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔داستان گو اس انداز سے گویا ہوتا ہے کہ ہمیں واقعات اپنے سامنے تصور میں ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اسی وجہ سے عوام ان داستانوں سے محلات کی سیر کرتے ہیں تو کبھی ایران وتوران تصور میں گھوم آتے ہیں جہاں حقیقت میں یہ ممکن نہیں تھا وہاں داستانیں پہنچا دیا کرتی تھیں۔داستان گو جو جگہ چاہتا عوام کو دکھا دیا کرتا تھا مثلاً اگر دستر خوان کا ذکر کرتا تو وہاں مغلیہ دسترخوان کے سارے کھانے موجود ہوتے،کسی باغ کا ذکر کرتا تو اس کی خوبصورتی کو اس طرح بیان کرتا گویا جنت کی بات کر رہا ہو۔ ہر جگہ ہر چیز موجود ہوتی تھی۔داستان گو کی کہانیوں میں وہ ہر چیز کو اپنے تخیل کے ذریعے مکمل انداز میں پیش کرتا ہے کسی کے حسن کا ذکر کرتا ہے تو اس طرح کی اس سے مکمل حسن سامعین نے اس سے پہلے سنا نہ دیکھا ہو۔جب جنگ کا ذکر کرتا ہے تو باریک سے باریک چیز اور ہر وہ سامان جو جنگ میں استعمال ہوتا ہے اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی ہیبت داستان گو کے الفاظ سے محسوس ہونے لگتی ہیں۔اس حوالے سے پرویز صاحب رقمطراز ہیں کہ:

> ''داستان گو اپنے تخیل میں اپنے ذوق جمال کے بل بوتے پر حسن کو مکمل شکل میں دیکھنا چاہتا ہے۔اس لئے وہ مالن کو بھی حسن میں بے نظیر،سولہ سنگھار اور بارہ ابرن کے ساتھ آراستہ دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے۔اس باغ میں پھول ہی پھول ہیں اور اگر کانٹے ہیں تو اس لئے کہ وہ کسی حسین دوشیزہ کا دامن پکڑ لیں یا سینے سے اس کا دامن کھینچ لیں تاکہ ناظرین اس کے حسن کو تفصیل سے دیکھ سکیں۔یا پھر جب وہ دشت وبیابان کی سیر کراتے ہیں تو ویرانی مجسم پیش کرتے ہیں۔وہ مناظر جنگ کی تصویر کھینچتے ہیں تو جنگ کا کون سا ایسا سامان نہیں ہے جو اس عہد میں موجود ہو،یا اس کا تصور کیا جا سکے،وہ داستان گو کے ہاتھ نہ آجائے۔جہاں کوئی بات رہ جاتی ہے اسے وہ اپنے زور تخیل سے پورا کر دیتا ہے۔جب جنگ چھڑتی ہے تو زمین کا ایک ایک ذرّہ اور آسمان کا ہر تارا کانپ اٹھتا ہے اور اس کی ہولناکی کو پیش کرنے کے لئے لفظوں کے تیشہ وسنگ کا م

آتے ہیں۔ جنگ ساحرانہ اور عیارانہ بھی ہوتی ہے۔ جنگ کا بیان ہے تو
وہاں حریفوں کے لشکر، اسلحہ جنگ اپنی تمام تر قوت اور چمک دمک کے
ساتھ نظر آتے ہیں۔ جنگل میں منگل ہے، خیمہ بپا ہے، تلواریں چل رہی
ہیں، برچھیاں اور سنانیں اپنا کام کر رہی ہیں، گولے پھٹ رہے ہیں،
مارکاٹ کا بازار گرم ہے۔ غرض جنگ اپنی تمام تر ہیبت نا کی کے ساتھ نظر
آتی ہے۔ داستان گو لفظوں سے تیغ وتفنگ کا کام لیتا ہے۔ رزم کا سماں بندھ
جاتا ہے۔ جہاں تک تفصیلات کا تعلق ہے یہ وہ میدان ہے جہاں
داستان گو اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا۔ وہ لفظوں کے دریا بہا دیتا ہے اس
لئے کہ وہ سماں باندھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اپنی بات کو اور
شدت سے کہنے کے لئے شعر کا سہارا لیتا ہے۔ نثر کے ساتھ شعر لکھنے کا
رواج آج بھی ہے اور شاید اس کی روایت کا رشتہ بھی داستان سے جڑا
ہوا ہے۔'' [۱]

اگر داستان گو بازار، دربار یا رزم، بزم کا بیان کرتا ہے تو کبھی اگر وہ داستان میں ربط نہ رکھ سکے تو سامعین کو احساس بھی نہیں ہوتا کیوں کہ وہ جزئیات نگاری میں اتنی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے کہ سامعین ان مناظر میں کھو جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے داستان کا پلاٹ مربوط نہیں رہ پاتا کیوں طوالت پلاٹ کے توازن کو برقرار نہیں رہنے دیتی۔ اس حوالے سے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''یہاں پلاٹ محدود نہیں کیا جاتا یعنی اس کی چوکور حد بندی نہیں کی جاتی۔
اس لئے یہاں پلاٹ میں باقاعدہ ترتیب بھی نہیں ہے۔ یہاں تناسب
کا کام نہیں۔ داستان گو کے سامنے کوئی مخصوص ڈھانچہ نہیں ہوتا وہ تو
محض اپنی قوت متخیلہ کے بل بوتے پر داستان سرائی کرتا ہے۔ ایک وحشت

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۳۶/ ۱۳۷

ہے جو مقید نہیں ہو سکتی اسی لئے وہ اپنے تخیّل کی اڑان پر پابندی نہیں لگاتا۔
اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ قصے کو ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ خود
بے بس ہو جاتا ہے ایسے موقع پر کوئی خضر یا سبز پوش بزرگ اس کی مدد
کرتا ہے۔ داستان گو اگر چہ تخیل کی دنیا کا فرد معلوم ہوتا ہے لیکن سچ تو یہ
ہے کہ تخیل خود مادے کا آفریدہ ہے۔ اس لئے وہ اس ماڈی دنیا سے اپنا
رشتہ نہیں توڑ سکتا۔ اس کے پاؤں میں ایسی دراز رسی ہے، جو کبھی نہ ختم
ہونے والی ہے لیکن بندھی ضرور ہے اور اس کا ایک سرا ہماری اپنی دنیا
سے جڑا ہوا ہے۔ اس لئے داستان گو جب واقعات کی دنیا میں جاتا ہے
اور اسے ان جزئیات کا بیان کرنا ہوتا ہے تو اسے اس بات کا بھی خیال
رکھنا پڑتا ہے کہ وہ سامعین کا اعتماد نہ کھو دے۔ اس لئے وہ ایسا لب ولہجہ
اختیار کرتا ہے کہ جیسے سچ مچ کے واقعے کو بیان کر رہا ہے، اور خیالی باتیں
اسی وقت کرتا ہے جب اسے اپنے سننے والوں یا پڑھنے والوں کا اعتماد
حاصل ہو جائے۔ جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ہمارا دماغ ناممکن کو
ممکن کی شکل میں قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔''[۱]

دستانوں کا مضمون عموماً ایک ہی طرح کا ہوتا ہے جیسے داستان گو اپنی علمی وسعت اور زبان پر قدرت کی بدولت ہزار رنگ سے باندھتا ہے تا کہ سامعین لطف اندوز ہو سکیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واقعات کی تکرار ہو جاتی ہے۔ اور الفاظ وتراکیب بھی اس انداز کے ملتے ہیں جیسے پہلے استعمال ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور یہیں داستان کی طوالت عیب معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن بہترین داستان گو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت کی بدولت اور الفاظ کے غیر معمولی ذخیرے کی وجہ سے ہر مرتبہ بیان کو نئے انداز سے بیان کرتا ہے۔ الفاظ سے جزئیات نگاری میں حسن پیدا کرتا ہے اور تفصیلات کو اتنے مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے تو اس کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اگر سخاوت کا بیان کرتا ہے تو اس طرح کہ حاتم طائی کی سخاوت سے بھی داستان گو دس

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۴۰

گنا آگے بڑھ جاتا ہے۔ جہاں انسانوں کے ساتھ ساتھ جنوں، پری زادوں، جانورں سب پر سخاوت ورحم دلی دکھائی جارہی ہوتی ہے۔

داستان میں جنس کا اظہار بھی ملتا ہے۔جنس کو یہاں چوں کہ غیر اخلاقی تصور کیا جاتا تھا۔اس لئے اس کا زیادہ ذکر کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔لیکن داستانوں میں جنس کا اظہار خاصی بے باکی سے ملتا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا''، میں بھی جنسی اظہار جگہ جگہ نظر آتا ہے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

> ''داستان میں جو بات بیان کی گئی ہے بے تکلف، بے جھجک اور کہیں پر تو بے پردہ پھر بیان کا لطف، زبان کا چٹخارہ، بات میں بات پیدا کرنا، ایک کے بعد ایک پرت کا کھولنا، جزئیات کا استعارے کے اندر چھپا کر پیش کرنا، چونکہ فضا طلسماتی ہے اس لئے یہاں مبالغہ گوارا کرلیا جاتا ہے، شدت اور زیادتی کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔'' [۱]

داستانوں میں زبان و بیان کا استعمال بہت اعلیٰ پیمانے پر نظر آتا ہے۔ زبان کے تمام محسن ہمیں داستانوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔لفظوں کا استعمال، استعارہ سازی، تشبیہ کی پیچیدگی، صناعی، لفظی رعایتیں غرض زبان کی ہر خوبی ہمیں یہاں نظر آتی ہے۔ تخیل بھی زندگی کو ایک نئی معنویت بخشتا ہے اس لیے داستان گو تخیلی دنیا کو صناعی و نقاشی کر کے عوام کے سامنے دلچسپ انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ہر جگہ الفاظ کا استعمال وہاں کے ماحول کے اعتبار سے کیا جاتا ہے مثلاً جہاں جادو کا بیان کرنا ہے یا مصنوعی ماحول بیان کرنا ہے تو الفاظ بھی مصنوعی ہی ہوتے ہیں۔ کہیں پر تکلف اور رنگین زبان قدم قدم پر زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی ہوتی ہے۔داستانوں میں عوام کی جتنی اقسام ملتی ہیں کسی اور صنف میں مشکل ہی سے ملیں گی۔اعلیٰ طبقے کے ساتھ نچلے طبقہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔اس کے متعلق اطہر پرویز نے بھی ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> ''اردو کی داستانوں میں نچلے طبقے کے لوگوں کا بھی ذکر ملتا ہے لیکن ان کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔ وہ تو داستان کے افراد کے درمیان ربط قائم کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہمیں محض ان کی جھلک ہی نظر آتی

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۴۸

ہے،اس سے زیادہ نہیں۔ یہاں داستان گو کا مقصد نہ تو ان کا کردار پیش کرنا ہے، نہ ان کا مقصد زندگی کی تصویر کشی کرنا ہے۔ یہاں ہمیں ملازم، خواجہ سرا، انا چھوچھو، دائی انا چھوچھو، مغلانی ،قلماقنی وغیرہ نظر آتی ہیں ،لیکن ان کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہے، وہ تو اپنے آقاؤں کے رحم وکرم پر ہیں۔ یہ اور بات ہے بعض ایسے افراد میں کوئی ایسی ٹیڑھ نکل آتی ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر بن جاتی ہے۔ طلسم ہوش ربا میں ان کی زبان اوران کے لب و لہجے نے ایک غیر معمولی جان ڈالی ہے۔ یہاں ایک مہترانی کا مرقع پیش ہے اس کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔'' ا؎

غرض داستانوں میں تہذیب وتمدّن ،قوانین وضوابط سب کچھ نظر آتا ہے۔زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نظر نہیں آتا جو داستانوں میں بیان نہ ہوا ہو، داستان گو ایسے کرادروں کو پیش کرتا ہے جو جیتے جاگتے ہیں اس کی قوت مشاہدہ زیادہ ہوتی ہے کہ وہ ہر کرادر میں زندگی بھر دیتا ہے کہ سننے والے لطف اندوز ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے داستان گو کا مطالعہ وسیع ہونا بہت ضروری ہے۔اور مشاہدہ گہرا ہوگا تبھی وہ زندگی کے ہر تجربے کو آسانی سے بیان کر سکے گا۔ ہر بات کو جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کرنے کے لیے زبان وبیان پر قدرت شرط اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''داستان لکھنے والا جب زندگی کی ڈور سے الجھتا ہے تو اس کا دماغ بھی تیزی سے کام کرتا ہے اور دل بھی۔داستان گو ایسے موقع پر جذباتی ہو جاتا ہے وہ ایک سانس میں سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہے کیونکہ اس کی قوت مشاہدہ بھی تو تخیل کی معاونت کر رہی ہے۔وہ چاہے معاشرتی زندگی کی جھلکیوں کو ذرا فاصلے سے پیش کرے لیکن اس کا جذباتی انداز کوائف کو سنوار کر زیادہ گوارا اور قابل قبول بنا دیتا ہے اس لئے کہ واقعات کی وہ

ا؎ داستان کا فن،اطہر پرویز،اُردو گھر،علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص: ۱۵۱/۱۵۲

معنویت جو عام زندگی میں نکھر کر سامنے نہیں آسکتی داستانوں میں پیش پیش رہتی ہے۔انسانی زندگی بڑی چمک دمک اور آن بان سے ان قصوں میں کھل کر سامنے آتی ہے اور ہم اس کی بدولت اچھائی اور بُرائی ، خوبصورت اور بدصورتی ،شرافت اور کمینگی،کم ظرفی اور اعلی حوصلگی بڑے قریب سے دیکھتے اور متاثر ہوے ہیں'' [۱]

الغرض داستانیں جزئیات نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔

داستانوں میں مختلف اسالیب بیان:

داستانیں ابتدائی دور کی پیداوار ہیں ۔ جب نثر کے با قاعدہ اصول مرتب نہیں ہوئے تھے۔ جب نثر آج کی طرح ترقی یافتہ شکل کو نہیں پہنچی تھی تو اسلوب کا کوئی با قاعدہ معیار اور غیر معیار کا پیمانہ بھی مرتب نہیں ہوا تھا۔اسی وجہ سے داستانوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ داستانیں اسی نثر میں لکھی گئیں جو عوام کو سمجھ میں آسکے۔ چوں کہ اس کا مقصد بھی عوام کو محظوظ کرنا تھا۔اسی لیے داستانوں کے لیے ایسی زبان استعمال کی گئی۔ جو آسان تو ہو لیکن جس میں روانی ، چاشنی اور اتنی حلاوت ہو کہ سامعین کو دوران سماعت اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔

داستانیں جس دور کی پیداوار ہیں ۔اس دور میں شان وشوکت ،صناعی اور تعش کا ماحول تھا۔تو لامحالہ داستانوی اسلوب بھی اس سے متاثر ہوا کیونکہ اسلوب کا تعلق بھی معاشرے سے ہوتا ہے ۔اسی وجہ سے داستانوں میں پرشکوہ الفاظ،صنائع وبدائع کا استعمال اور لفظی موشگافیاں نظر آتی ہیں۔تابناک ماضی کے قصے، تصوراتی کامرانی کے خواب بیان کرنے کے لیے داستان گو پرشکوہ الفاظ ،رنگینی بیان اور لفظوں کی بازیگری کرتے ۔اس عہد میں رقص وسرود کی محفلوں سے لیے کر شاعری تک سب کچھ تھا اسی وجہ سے زبان ہموار نہیں تھی اور اسی لیے داستانوں میں زبان وبیان کے طرح طرح کے نمونے سامنے آئے ۔ جہاں سادہ نثر بھی نظر آتی ہے اور دقیق بھی کہیں عربی وفارسی کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور کہیں خالص ہندوی انداز غالب نظر آتا ہے۔

---

[۱] داستان کا فن،اطہر پرویز،اُردو گھر علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص: ۱۵۷

داستانوں کی زبان ابتدا میں مقفیٰ اور مسجع عبارت سے پر ہوتی تھی۔ ''نوطرز مرصع'' اور ''سب رس'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔ لیکن جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور انگریزی افسروں کو اردو سکھانے کا کام شروع ہوا تو اس کے لیے مرصع و مسجع عبارت موزوں نہیں تھی۔ لہذا میر امن نے ''باغ و بہار'' کے لیے آسان اسلوب اختیار کیا۔ یہ اسلوب عوام سے قریب تھا۔ بول چال کی زبان استعمال کی گئی تھی۔ محاورے بھی وہ برتے گئے جو عوام میں رائج تھے۔ حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' اور توتا کہانی میں بھی بول چال کی زبان ہی برتی گئی ہے۔ لیکن وہاں فارسی تراکیب و محاورے نظر آجاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہندوی رنگ بھی یہاں نظر آتا ہے۔ اور اس طرح محاورات بول چال کا حصہ بنتے چلے گئے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

> ''یہی زمانہ تھا جب محاورات بول چال کا حصہ بن رہے تھے۔ ان داستانوں نے اردو کے نثری اسلوب میں محاورات کو بھی جگہ دی۔ گویا ایک قسم کا محاوراتی اسلوب سامنے آیا۔ ان محاوروں کے کھپانے کی گنجائش داستانوں سے بہتر اور کہاں ہو سکتی تھی۔.........داستان گویوں نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلاشرکت غیرے ان پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ان داستانوں میں بڑے بڑے کام لئے اور اتنے بڑے پیانے پر استعمال کیا کہ اردو زبان میں یہ محاورے داستانوں کے توسط سے عوامی خراد چڑھے اور انہوں نے قبول عام کی سند حاصل کی۔ یہ بھی ہوا کہ دہلی کے زیر اثر جو داستانیں لکھی گئیں، ان میں دہلی کے محاورے اور لکھنو کے زیر اثر جو داستانیں لکھی گئیں، ان میں لکھنو کے محاورے استعمال ہوئے۔ ماحول اور تاریخی تغیرات کی بنا پر دونوں کے یہاں فرق ہونا لازمی تھا۔ ضرب الامثال نے زبان میں چاشنی پیدا کر دی۔ چونکہ داستانوں میں عورتیں بھی تھیں، ان کو بھی بات چیت کے مواقع حاصل تھے۔ لہذا امثال کا استعمال خوب کثرت سے ہوا ''فسانہ عجائب'' پر زبان کے بوجھل بنانے کا خاصا بڑا الزام ہے لیکن فسانہ عجائب نے زبان کو محدود

نہیں کیا بلکہ وسیع کیا اور ایک ایسے نثری اسلوب کو فروغ دیا جس کی
بدولت ہم لکھنو کی تہذیب کو اور قریب سے دیکھتے ہیں۔ یہ محاورے اور
ضرب الامثال کبھی فارسی کے مرہون منت تو کبھی خالصاً یہیں کے
پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔'' [۱]

محاورات کے علاوہ داستانوں میں اشارہ وکنایہ کی صنعتوں کا استعمال بھی ہمیں جابجا نظر آتا ہے۔ جہاں جنسیات کا تذکرہ ہوتا وہاں داستان گو عموماً کنایہ زبان استعمال کرتا۔ کہیں استعارے اس کام میں مدد گار ثابت ہوتے۔

اس کے علاوہ سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لفظی دعاتیں بھی نظر آتی ہیں جو لطف کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ جیسا کہ رجب علی بیگ سرور کے یہاں ایک نیا اسلوب نظر آتا ہے جہاں نثر میں نظم کی سی کیفیت ملتی ہے۔ سادگی کے ساتھ رنگینی ولطافت بھی نظر آتی ہے۔ عبارت بھی تصنع سے پر ہے اور شاعری کا انداز بھی نثر میں غالب ہے۔ یہ بہترین آمیزش ان کے یہاں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

داستانوں میں عورتوں کے محاوروں اور لہجوں میں فرق بھی نظر آتا ہے۔ جہاں نچلے طبقے کی عورتوں کی زبان سے ان کے طبقہ کا اندازہ بھی بخوبی ہو جاتا ہے۔ بیگماتی زبان کی حلاوت کا انداز منفرد نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ اس کی باتیں اور لہجے داستانوں میں لطف پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اور عورتوں کی زبان بھی داستانوں کی دلچسپی بڑھانے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

داستان کا اہم عنصر منظر نگاری بھی ہے۔ داستان گو منظر کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں گویا سماں باندھ جاتا ہے۔ اور چیزیں آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہیں۔ شادی کا بیان ہو تو ساری رسمیں سامنے ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں اور اگر ویرانی کا بیان ہو تو ہو کا عالم محسوس ہوتا ہے۔ الغرض داستان گو منظر نگاری میں بھی بڑی مہارت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

داستانوں میں ہمیں کہیں مختصر افسانے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو کہیں ناول کی۔ کردار نگاری بھی ناولوں سے پہلے داستانوں میں نظر آتی ہے۔ جہاں بہت سے کردار بے مثال نظر آتے ہیں مثلاً عمرو عیار، حکیم

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص:۱۶۶

قسطاس الحکمت وغیرہ اردو ناول نے یہ روایت آگے بڑھائی اور کئی بے مثل کردار پیش کیے۔ جیسے خوجی، حاجی، بغلول اور مرزا ظاہر دار بیگ وغیرہ۔ اس کے علاوہ خاکے جو کہ بطور صنف بیسویں صدی میں پروان چڑھی داستانوں میں ابتدائی شکل میں نظر آتی ہے۔ مکالموں کا انداز بھی داستانوں میں سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ ڈراموں میں مکالموں سے جو کام لیا جاتا ہے وہی کیفیت داستان کے مکالموں سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ طنز و ظرافت کے نمونے بھی سب سے پہلے داستانوں میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ظرافت کا عنصر داستانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس حوالے سے اطہر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''عمرو عیار، طلسم ہوش ربا، پڑھنے والوں کی محبوب شخصیت ہیں۔ ان کی زنبیل میں کیا نہیں۔ سات دریاؤں اور شہروں کے ساتھ دنیا بھر کا ساز و سامان بھرا ہوا ہے جہاں جو کچھ ملا انہوں نے زنبیل میں ڈالا لیکن خسیس ایسا کہ فاقے کر لیں، لیکن زنبیل کی کوئی چیز نکال کر کام میں لائیں۔ عمرو اسد کی شادی میں شہد بن کر اشرفیاں لوٹتے ہیں۔ امیران سے شکایت کرتا ہے تو اپنے مقروض ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں۔ یقیناً یہ تصور مبالغہ آمیز ہے لیکن مبالغہ مزاح کی جان ہے۔ مبالغہ اتنا ہے کہ گویا انسان کی تصویر اس کے قد سے دس گنا بڑی بنائی گئی ہے لیکن اگر ہم اس کو انسان کے قد کے برابر کر دیں تو ہمیں عمرو عیار اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔'' [1]

الغرض داستانوں میں مختلف اسالیب نثر ہمیں نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے بعد میں ترقی حاصل کر کے بہت سی اصناف کی باقاعدہ شکل اختیار کر لی۔

داستانوں میں اقدار انسانی کا تصور

اقدارِ انسانی کی زندگی میں بہت اہمیت ہے۔ اچھائی اور برائی کی قدر ہمیشہ سے انسان کے اعمال و افعال سے ظاہر ہوتی رہی ہے۔ نیکی اور بدی کی دنیا الگ الگ بٹی ہوئی ہے۔ اور نیکی کو داستان گو اس انداز سے

---

[1] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۸۰/۱۸۲

پیش کرتے تھے کہ ہم ان نیک کرداروں سے محبت کرنے لگتے ہیں اوران کی کامیابی سے ہمیں خوشی ملتی ہے۔ اور بدی کے کرداروں سے ہمیں نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ انسانی اقدار کی خاصیت ہے کہ وہ ان قدروں کو محسوس کرتا ہے۔ان داستانوں سے داستان گو اچھائی کا بدلہ اچھائی ہی ہوتا ہے۔نیکی کا پیغام بھی دیتا تھا اور بہت سی اخلاقی اچھائیاں بھی یہاں پر بیان کی جاتی تھیں۔سچائی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔دوسروں کے کام آنا اوران کی مدد کرنا عام طور پر ملتا ہے۔اور برائی کرنے والا اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔تو اس طرح نیکی کو اچھا بدلہ اور برائی کو برے بدلے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔جو دوسروں کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہے منزل اس کے قدموں میں ہوتی ہے داستانوں میں اس انداز کی ابتدا کس طرح ہوئی اس سلسلے میں اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

> ''ابتدا میں داستان گوئی کا خاص مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی اجتماعی زندگی کے ابتدائی دور کی فتوحات سے لطف حاصل ہو۔جن قوتوں کے اظہار سے عہد رفتہ میں نبرد آزما ہوکر انسان نے کامیابی حاصل کی،اس کا ذہن سکون،اور قلب سرور حاصل کرتا رہے۔انسان ایک ایسی خود فراموشی کی تلاش میں رہتا ہے کہ حال کے حقائق،سختیاں اور تلخیاں،اس کی زندگی کو اجیرن نہ کردیں،اور یہ خود فراموشی اسی ماضی کے قصوں میں ہی مل سکتی ہے۔جہاں زندگی کے سنگین حالات پر اس نے قبضہ پاکر حال کا درخشندہ عارض دیکھا ہے۔اسی واسطے داستان گوئی میں بھوت پریت،جن پری،چڑیل کے قصے بہت ملتے ہیں مگر ان سب پر انسان فتح حاصل کرتا ہے۔داستانوں میں قصے لمبے ہیں تاکہ مقصد پر پہنچنے کے لئے کافی وقت لگے،اور کافی جہانوں کی سیر ہو جائے۔نئے نئے کردار پیش کئے جائیں اور دنیا کے مختلف تجربات اور مشاہدات کا تذکرہ بڑی حسن وخوبی کے ساتھ کیا جائے۔'' [۱]

داستانوں میں جو کردار پیش کیے جاتے ہیں۔ان کے سامنے مقاصد اتنے اعلیٰ ہوتے ہیں کہ ان کو

---

[۱] داستان کافن،اطہر پرویز،اُردو گھر،علی گڑھ،۲۰۱۵ء،ص:۱۹۰

حاصل کرنے کے لیے انہیں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی راہوں میں بہت سی رکاوٹیں ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی نیک نیتی کی بدولت ہر منزل سر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ تصور بھی داستانوں میں عام طور پر نظر آتا ہے کہ جو نیکی کی راہ پر چلتا ہے اس کی مدد خدا بھی کرتا ہے۔ اور یہ داستان گو اس لیے کرتا ہے تاکہ نیکی کے راستے کی طرف عوام کو ترغیب دی جا سکے۔

داستانوں میں ایک بہت اہم موضوع عشق بھی رہا ہے عموماً ہیرو عشق کی راہ کا مسافر ہوتا ہے۔ ''فسانہ عجائب'' ''سروش سخن'' ''طلسم حیرت'' وغیرہ میں عشقیہ بیان غالب ہے۔ عشق کے ساتھ ہی حسن بھی انسان کو متاثر کرتا ہے۔ جگہ، چیزیں مثلاً بہار، دربار وغیرہ کا حسن یا انسانی حسن بھی ہمیشہ اسے متاثر کرتا ہے۔

اخلاقی قدروں کا بیان جگہ جگہ نظر آتا ہے مثلاً ''فسانہ عجائب'' میں توتے کے ذریعے اخلاقی قدریں بتائی گئی ہیں۔ توتا داستانوں کا اہم کردار رہا ہے اس کے بارے میں اطہر پرویز ان لفظوں میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> ''یہ توتا مخلص بھی ہے اور مستقل مزاج بھی۔ وفاداری، اس کا آئین ہے جو حق گوئی سے دریغ نہیں کرتا توتا جانعالم کے ساتھ ساتھ مختلف جنگلوں میں جاتا ہے اور دشوار گذار راستوں سے گزرتا ہے۔ وہ راستے سے بھٹک جانے کے بعد بھی جان عالم کو بھولتا نہیں، منجموں دریافت کرتا ہے۔ یہ وفاداری، استواری کی شرط کے ساتھ ہے اور بالآخر'' جامع المتفرقین'' سب کو ملا دیتا ہے۔''[1]

اور اس طرح فسانہ عجائب کا بندر بھی دنیا کی بے ثباتی اور رنگینئی زمانہ پر تقریر کرتا نظر آتا ہے۔ جو اس بات کا اعلان تھا کہ معاشرہ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اسے اخلاقی درس دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جس کا بہترین ذریعہ سرورؔ نے بندر کی زبان سے تقریر کے ذریعے اپنایا اور اس کو بندر سے انسانی پستی پر طنز کے ذریعے نیکی کا درس دیا۔ بندر کی پوری تقریر میں سرورؔ نے بہت سی نصیحتیں کی ہیں اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

> ''فسانہ عجائب'' کا بندر تو بندر کے روپ میں انسان ہے جہاں وہ دینا کی

---

[1] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۹۱

بے ثباتی ،سفلہ پروری اور نیرنگی زمانہ پر ایک طویل تقریر کرتا ہے۔اس عہد میں لکھنو کا معاشرہ عیش ونشاط کی نمائندگی وہ عیاشی کی زندگی پر طنز کرتا ہے ۔ یہ درس بالا علان دینا ، شاہ وقت اور رؤسا وشرفاء کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔سرورؔ نے وہ تمام باتیں کہہ دیں ہیں ۔ جو اس معاشرے کو گھن کر طرح کھا رہی ہیں اس طرح انہوں نے ایک غیر انسان کی زبان سے اخلاقی قدروں کا ذکر کیا ہے ۔اول سے آخر تک بندر کی تقریر درس وتدریس، پندو موعظت اور عالمانہ خیالات پر مبنی ہے۔'' [۱]

داستانیں چونکہ ایسے دور کی پیداوار تھیں جب کہ معاشرہ دم توڑ رہا تھا۔ اخلاقی قدریں پامال ہو رہی تھیں اور سماج میں تضاد تھا۔ ہر شخص ریا کاری میں مبتلا تھا۔ جو کہتا وہ کرتا نہیں تھا اور جو کرتا وہ کہتا نہیں تھا۔غرض اخلاقی قدریں صرف باتوں میں رہ گئی تھیں۔جن کا ذکر زیادہ ملتا ہے ان کے بارے میں اطہر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

'' قول اور فعل میں واضح طور پر تضاد تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ افراد اپنی روزمرہ کی گفتگو کو بنی بنائی اخلاقی قدروں سے سجاتے تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ افراد اپنی زندگی میں ان اخلاقی قدروں پر عمل نہیں کرتے تھے ۔اس لئے اخلاقی اصول اور اخلاقی تعلیم کا ذکر قدم قدم پر ہوتا اور یہ زبان زد خاص وعوام تھے جیسے:

☆ جس آدمی میں رحم نہیں وہ انسان نہیں
☆ جھوٹ بولانا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اس کو نہیں پہنچتا
☆ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو طعنہ مہنا دیتے ہیں
☆ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو طعنہ مہنا دیتے ہیں
☆ دولت خداداد کو ہرگز زوال نہیں مگر انسان کی نیت درست چاہیے
☆ بلکہ جتنی خرچ کرو اس میں اتنی ہی برکت ہوتی ہے

---

[۱] داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص:۱۹۲

☆ مرد کو چاہیے کہ جو کہے سو کرے۔'' ۱؎

اور اس طرح داستانوں میں یہ بیان عام طور پر چلتے ہیں۔ کردار نشہ بھی کرتے ہیں اور نیک بھی دیتے ہیں۔ شراب بھی پیتے ہیں اور نمازیں بھی ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ کتاب ''داستان کا فن'' کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گرچہ اس کتاب میں مصنف نے داستان کے فنی لوازم سے متعلق کوئی نئی بات دریافت نہیں کی ہے۔ بلکہ انہوں نے اردو کی مشہور داستانوں اور اس سے قبل تنقید کی جو کتابیں اردو داستانوں پر لکھیں گئیں ہیں ان کے حوالوں سے اپنی بات کو مستند بنایا ہے۔ نیز مغربی کتابوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ جس طرح مصنف نے داستان کے فن پر روشنی ڈالی ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے داستان کے فنی لوازم سے اچھی طرح واقف حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے یہ کتاب اہمیت کے حامل ہے۔ ہاں اگر زندگی ان کو موقعہ دیتی تو شاید بعد میں وہ اس میں کچھ اضافہ کرتے لیکن انہوں مہلت نہیں ملی۔ مزید یہ کہ داستانوں میں تہذیبی و معاشرتی زندگی کے متعلق بھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کتاب ''داستان کے فن'' کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔

اردو ادب میں داستانیں تہذیبی و ثقافتی اقدار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ حالانکہ ابتدا میں داستانوں کے مطالعے کو ذہنی و اخلاقی صحت کے لیے مضر سمجھا گیا تھا۔ لیکن گذشتہ چند سالوں میں تنقیدی رویوں میں تبدیلیوں کے باعث داستانوں کے مطالعے کی افادیت و اہمیت واضح ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مختلف محققین و ناقدین نے داستانوں کا فنی اور موضوعاتی مطالعہ کرتے ہوئے، اس کے محاسن و معائب بیان کیے ہیں۔ جن کے مطالعے سے قارئین اردو کی قدیم داستانوں کے اسلوب، موضوعات اور معاشرتی زندگی سے واقف کرانے میں اہم رول ادا کرتیں ہیں۔ زیر نظر کتاب ''داستان کا فن'' کا شمار بھی انہی کتب میں ہوتا ہے۔

ادب کا مطالعہ:

یہ کتاب ۱۹۶۶ء میں اردو گھر علی گڑھ کی جانب سے منظر عام پر آئی ہے۔ یہ ۲۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر خوشید الاسلام نے لکھا ہے۔ اس کے بعد چند باتیں کے عنوان سے مصنف نے

۱؎ داستان کا فن، اطہر پرویز، اُردو گھر علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۹۴/ ۱۹۵

کتاب کو تحریر کرنے کی وجہ بتائی ہے۔ زیرِنظر کتاب کے موضوع کو سہل اور آسان طریقے پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس حوالے سے خورشید الاسلام رقمطراز ہیں کہ:

''اطہر پرویز صاحب، علی گڑھ یونیورسٹی میں جنرل ایجوکیشن کے استاد ہیں۔ غالباً انہیں ان کے فرض کے احساس نے مجبور کیا کہ وہ ادب پر ایک ایسی کتاب لکھیں جو طلباء کی ضرورتوں کو پورا کرے، آسان زبان میں ہو، اور جس میں بلیغ تسلسل، ربط اور رفعت کے بجائے، سیدھی سادی منطق اور مدرّسانہ ترتیب۔''[۱]

پروفیسر رشید احمد صدیقی اطہر پرویز کے اسلوب نگارش کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''اس وقت ان کی حالیہ تصنیف ''ادب کا مطالعہ'' پیش نظر ہے۔ جس طرح دوسروں نے اس موضوع کو کو مشکل سے مشکل تر بنایا ہے۔ فاضل مرتب نے اس کو اتنا ہی آسان اور دلنشیں بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور کامیاب رہے ہیں یہ اس کتاب کا خصوصی امتیاز ہے۔ ادق مسئلے کو آسان مثال سے واضح کر دینا سب کو نہیں آتا۔ ہمارے لکھنے والے اکثر اوادی میں بھٹک گئے ہیں۔ پرویز صاحب قابل تہنیت ہیں کہ وہ اس مقام سے'' آسان'' گزر رہے ہیں۔ ان کو یقیناً بڑا ریاض کرنا پڑا ہوگا جس میں ان کی بعض خداد صلاحیتوں کو بھی دخل ہے۔ اور یہ ہر ایک کو نصیب نہیں وہ ''جواں و بخت جواں سال'' ہیں۔ انہوں نے اس عبادت و ریاضت کو جاری رکھا تو اردو ہی نہیں اردو کے اسالیب بیان میں بھی قابل قدر اضافہ کریں گے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اکثر یہ محسوس ہوا جیسے نثر اردو میں ایک نئے اسماعیل کا ظہور ہونے والا ہے اور یہ پیش خیمہ ہو ایک نئے حالؔی کی آمد کا۔''[۲]

۱۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، اردو گھر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص:۷

۲۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، ص:۱۶

ادق مسئلے کو آسان مثال سے واضح کر دینا، اس کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کتاب سولہ ابواب میں منقسم کی گئی ہے۔ ان ابواب کی ترتیب حسب ذیل ہے:

۱-	پہلا باب	فنون لطیفہ
۲-	دوسرا باب	فنون لطیفہ کی تعریف
۳-	تیسرا باب	ادب کیا ہے؟
۴-	چوتھا باب	ادب اور زندگی
۵-	پانچواں باب	ادب اور حقیقت نگاری
۶-	چھٹا باب	شاعری
۷-	ساتواں باب	نثر
۸-	آٹھواں باب	داستانیں
۹-	نواں باب	ناول
۱۰-	دسواں باب	مختصر افسانہ
۱۱-	گیارہواں باب	انشائیہ
۱۲-	باہواں باب	ڈراما
۱۳-	تیرہواں باب	تنقید
۱۴-	چودھواں باب	اسلوب یا طرز ادا
۱۵-	پندرہواں باب	ادب کی ہیئت اور تکنیک
۱۶-	سولہواں باب	ادب کی قدریں

ان ابواب میں فنون لطیفہ، ادبیات، شاعری، داستان گوئی سمیت ناول اور افسانے وانشائیہ پر زبردست کلام ہوا ہے۔ گویا ان ابواب کے تحت ادب کی تمام اصناف پر تنقیدی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان ابواب کے بعد ضمیمہ کے تحت چند نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ جس عنوان پر بھی بحث شروع کی گئی ہے۔ تو اس کے تحت ذیلی عنوان لگا کر متلاشی کے لیے آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ کتاب کا مطالعہ اردو ادب کی اصناف وتنوع کو عیاں

کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ''ادب کا مطالعہ'' ادب کے دقیق مسائل کو سمجھنے کی بہترین کڑی ہے۔ انہوں نے نہایت صاف ستھرے اور مدلل لب ولہجہ میں ادب کی تعریف، وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے تہذیب اور معاشرہ ادب کے رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے ملک کی اقتصادی اور زرعی حالت، صنعت وحرفت اور عسکری نظم ونسق پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ ادب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ادب کے بارے میں جہاں بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں وہاں ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں اپنے عہد کی روح چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ جب ہم اس عہد کی بات کرتے ہیں تو یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر عہد اپنے ماضی کی بنیادوں پر کھڑا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ماضی دکھائی نہیں دیتا جیسے بنیادیں بھی تو نظر نہیں آتیں۔ یہی معاملہ ادب اور تہذیب کا ان کی بنیادوں کو تلاش کرنے کے لیے ہمیں ماضی کے دریچوں سے گزرنا ہوگا۔

☆☆☆

باب پنجم

اطہر پرویز بحیثیت مدوّن

☆ مرتب

☆ مدیر

اطہر پرویز بحیثیت مرتب مدّون و مدیر

اردو ادب میں بے لوث ورضا کارانہ خدمات کے لیے زندگی کا طویل عرصے صرف کرنے والوں کی صف میں سنجیدہ، متوازن فکر اور شستہ قلم کے مالک اطہر پرویز کا نام بھی اردو ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی علمی و قلمی انفرادیتوں کو قائم رکھنے کے لیے زمانے کی ناہمواریوں اور گردوپیش کی ناقدر شناسیوں سے بے نیاز ہوکر قلم و قرطاس کی آبیاری کرتے ہوئے اردو ادب کو اپنی نایاب تحریروں سے نوازا جو ادب کے شیدائیوں کے لیے ناقابل فراموش ہیں۔

اطہر پرویز زرخیز ذہن کے مالک تھے۔ وہ ایک بڑے ادیب اور انشاپرداز تھے۔ اس کے علاوہ مفکر تعلیم، ماہر سیاست داں تھے۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود گرچہ ان کی زندگی کا ایک روشن پہلو ادب اطفال کی خدمات میں گزرا ہے۔ جس میں ان کے مطالعہ کی وسعت اور مختلف علوم وفنون سے شغف نیز فضل و کمال کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے بحیثیت ناقد، مدیر اور مرتب بھی اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔ انہیں داستان گوئی سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے اسی لیے انہوں نے نہ صرف داستان کے فن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ بلکہ اس میں انہوں نے داستان کے فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی افسانوی ادب میں تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو بھی کھنگالا، اور اس کی مقبولیت کے اسباب بھی بتائے۔

اطہر پرویز نہایت ہی فعال شخصیت کے مالک تھے۔ گرچہ ادب اطفال ان کا خاص میدان رہا ہے اس کے علاوہ انہوں نے داستان، افسانہ، اور دوسرے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے بچوں کی سہولت کے لیے اردو کے کلاسیکی ادب کو ازسرنو آسان زبان میں پیش کیا۔ بحیثیت معلم اور ایجوکیشن آفسر کے عہدے پر فائز ہونے کے سبب طلباء کو قریب سے جاننے کا موقعہ ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کے لیے عام فہم و آسان زبان کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اسی نظرے کے تحت انہوں ''ادب کا مطالعہ'' کے عنوان سے ایک

کتاب تحریر کی۔جس میں انہوں نے نہایت ہی صاف ستھرے اور مدلل لب ولہجہ میں ادب کی تعریف، وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے۔معاشرہ اور ادب کے رشتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی ناقدانہ صلاحیتوں کے بھی نقش ثبت کیے ہیں۔اور اردو کی مشہور داستان فسانہ عجائب کے متعلق ''فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ'' کو تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ اپنے مقدمے میں جو تجزیاتی گفتگو کی ہے وہ ان کی عملی تنقید کی ہی شکل ہے اس کتاب کی تدوین کے نتیجے میں انہیں اردو کے اعلیٰ پائے کے محققوں کی صف میں مقام حاصل ہوا۔اس باب میں یہاں اطہر پرویز کا بحیثیت مدّون، مرتب اور کیا طریقہ کار تھا اس کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اطہر پرویز بحیثیت مدّون:

بیسویں صدی کے نصف اوائل میں تحقیق وتنقید پر سنجیدگی سے توجہ صرف کی گئی۔خاص کر ادب العالیہ کے قدیم متون کو تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق از سر نو ترتیب دے کر ان متون کی بنیاد صحیح متن پر رکھ کر دوبارہ شائع کیا گیا۔ چونکہ اکثر و بیشتر جامعات میں کلاسیکی سرمائے ادب کو شامل نصاب رکھا گیا ہے۔ لیکن قدیم سرمائے ادب کے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف کی دستیابی، تفہیم اور بازیافت بڑا دشوار کن مسئلہ رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں تحقیق کا کام زور وشور سے ہونے لگا اور اردو کے محققین کلاسیکی متون کے صحیح اور مستند ایڈیشن تیار کر کے منظر عام پر لائے۔اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی رہی کہ ہمارے ادب العالیہ میں اکثر و بیشتر تصانیف پر فارسیت وعربیت کا غلبہ رہا ہے۔اور اعراب واوقاف کا بھی کوئی خاص التزام نہیں کیا جاتا تھا۔اگر چہ بعض چھاپہ خانوں نے اس قدیم ادب کو شائع کر کے اسے محفوظ کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔لیکن نسل نو کے طلباء جو فارسی اور عربی سے ناواقف ہیں۔انہیں ان قدیم کتب کا مطالعہ کرنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔لہٰذا ضروری تھا کہ اس صدی کے محقق ونقاد اپنی ذمہ داری ادا کریں اور اپنے قدیم سرمائے ادب کو نوجوان نسل کے لیے تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت از سر نو ترتیب دیں کر محفوظ کریں۔اس دور کے اہم محققین میں مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، وغیرہ بزرگوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا گوشہ اردو ادب و زبان کی خدمت میں صرف کیا اور تحقیق کا معیار بلند کیا۔

آزادی کے بعد بھی بعض دیگر علمائے ادب نے تحقیق کو تقویت بخشی اور اپنے تحقیقی کارناموں سے جن ادیبوں نے اردو تحقیق کی روایت کو ثروت مند بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر گیان چند جین، مشفق خواجہ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر خلیق انجم، رشید حسن خان اور ڈاکٹر اطہر پرویز وغیرہ اہم ہیں جو اردو تحقیق کی عمارت میں اہم ستونوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ جنہوں نے تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت ادب العالیہ کے تصحیح شدہ و مستند اڈیشن تیار کیے ہیں۔ ان محققوں کی محنتوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اردو ادب کی داستانوں، مثنویات اور شعراء کے دواوین کو شائع کر کے دوبارہ زندہ جاوید کیا گیا۔ کیوں کہ تحقیق کا کام ہے حال کو بہتر بنانا، مستقبل کو سنوارنا، اور ماضی کی تاریکیوں کو روشنی عطا کرنا ہے۔ مزید یہ کہ تحقیق کا کام گمشدہ دفینوں کو دریافت کرنا اور ماضی کی تاریکیوں کو دور کر کے اسے روشنی عطا کرنا ہے اس سلسلے میں سید عبداللہ فرماتے ہیں کہ:

> ''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تاریخی تحقیق میں کسی امر واقعہ کے وقوع کے امکان و انکار کی چھان بین مدنظر ہوتی ہے'' [۱]

اطہر پرویز نے اردو ادب میں بحیثیت مدّون بھی اپنے آثار چھوڑے ہیں۔ انہیں داستانوی موضوع سے غیر معمولی دلچسپی حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے داستانوی ادب کے قدیم متون کی جدید اصولوں کے مطابق ترتیب وتدوین کی ہے۔ اور سب سے پہلے اردو کی مشہور ومعروف داستان ''فسانہ عجائب'' کو مرتب کر کے اپنے معاصرین میں داستانوں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ اور ''فسانہ عجائب'' کو تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت مرتب کیا۔

اور اس کتاب سے متعلق بہت سے انکشافات کو عیاں کیا اور دلائل ومباحث سے اپنے دعووٴں کو ثابت کیا۔ تحقیق کا اصل مقصد حقائق کی تلاش ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تلاش و جستجو سے تمام معلومات

---

[۱] ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، ترتیب پروفیسر عبدالستار دلوی، شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء ص: ۱۱۱

حاصل کی جاتی ہیں۔یہی معلومات دلیل کے کام آسکتی ہیں۔دیتے وقت کام آسکیں۔اوراس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ جن مآخذ سے کام لیا جائے وہ نہ تو مشکوک ہوں اور نہ ان میں بہت قیاس آرائی سے کی گئی ہو۔ براہ راست مآخذ سے استفادہ کرنے سے غلط فہمیوں سے بچا جاسکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ تحقیق بہت ہی محنت وعرق ریزی کا کام ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ محقق میں تنقیدی شعور ہونا بہت ضروری ہے اس طرح تحقیق کا کام اعلیٰ طریقے سے تکمیل کو پہونچ سکتا ہے اس کے لیے مدون کو محققانہ ذہن کا مالک ہونا چاہیے اور ساتھ ہی تدوین متن کے جتنے بھی اصول ہیں۔ان سب سے واقف ہونا ضروری ہے کیوں کہ تدوین متن کے سلسلے میں بہت سارے اصول ومسائل درپیش آتے ہیں جس کا منطقی حل لازمی ہے اگر آپ نہ ہوں تو کسی نسخے کی تدوین غیر مستند مانی جائے گی۔کیوں کہ بغیر تحقیق کے نہ تو کسی مخطوطے کو تلاش کیا جاسکتا ہے نہ ہی مختلف نسخوں کا موازنہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نیا تحقیقی متن تیار کیا جاسکتا ہے۔اسی لیے جب ہم مدونوں کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو سبھی بڑے مدون اعلیٰ درجے کے محقق بھی ہوتے ہیں جب کہ کسی محقق کے لیے مدون ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے۔مثال کے طور پر قاضی عبدالودود، مسعود حسین خان، رشید حسن خان کے یہاں ان کی مخصوص تحقیقی نگارشات کے ساتھ ساتھ ان کے تدوینی کارناموں کا پایا بھی بہت بلند ہے۔

تدوین تحقیق کی ہی ایک شاخ ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ تحقیق کا دائرہ بہت وسع ہوتا ہے جب کہ تدوین کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔اور مدّون کتاب کو مصنف کی منشاء کے عین مطابق ہی ترتیب دیتا ہے۔کسی بھی کتاب کو تدوین دینے کے لیے چند اصولوں مقرر کیے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر محقق کتاب کو از سر نو ترتیب دیتا ہے اور قارئین کے لیے ایک نیا ایڈیشن تیار کرتا ہے۔کسی متن کو ترتیب وتدوین کرنے کے کچھ آداب و اصول ہوتے ہیں۔ان مسائل واصول سے عہد برآں ہونے کے بعد ہی متن ترتیب کی شکل میں سامنے آتا ہے۔مندرجہ ذیل اصولوں مدّون کے لیے اہم ہیں:

☆ محقق کا کام ہے کہ وہ جس متن یا مخطوطے کو مرتب کرنا چاہتا ہے اس کی ایک ایک سطر ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھے اور محقق مختلف معتبر نسخوں کی مدد سے صحیح تدوین متن تیار کرسکتا ہے۔

☆ دوسری بات یہ کہ مصنف کی اگر دوسری تصانیف ہوں تو ان کو غور سے پڑھے اس کے معاصرین کی تصانیف کا مطالعہ بھی کرے کیوں کہ اپنی تصانیف میں کبھی کبھی دوسروں کے کاموں کا بھی ذکر کردیتے

ہیں۔اس کی اوراس کے دوسرے معاصرین کی تصانیف کے مطالعے سے ہی اس دور کی زبان وبیان، طرز املا اور دیگر رجحانات کا علم ہو جاتا ہے۔

☆ اس سے قبل کی تحریروں کا مطالعہ بھی مفید رہتا ہے۔اس کے بعد عہد بہ عہد زبان کی تاریخ کا مطالعہ کرے تاکہ بعد کے زمانے سے متن کے دور کو ممیّز کر سکے اور اس پورے عمل کو تیاری کہتے ہیں۔

☆ مدّون کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ جس کتاب کو ایڈٹ کرنے جارہا ہے اس کی زبان سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے وہ فارسی زبان ہو یا اردو اور اس زبان کے املا کے اسلوب سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔

☆ اس طرح مدّون اُس مخطوطے کے موضوع سے بھی اچھی طرح واقف ہو جس کی تدوین کرنے جارہا ہے۔مثلاً تصوف کا موضوع ہو تو اسے تصوف کے بارے میں اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔یا شاعری وغیرہ کا

☆ اس طرح مدّون کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عہد بہ عہد زبان کی تاریخ کا مطالعہ کرے تاکہ بعد کے زمانے سے متن کے دور کو ممیّز کر سکے۔اس کے علاوہ قیاسی تصحیح،نسخہ اساسی،مختلف فیہ کلام،مستند اور غیر مستند کلام،مواد کی فراہمی،اختلاف نسخ،الحاق کلام اور اردو رسم الخط وغیرہ سے واقفیت لازمی ہے۔

مندرجہ بالا اصول کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیوں کہ ان میں سے اکثر و بیشتر اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اطہر پرویز نے ''فسانہ عجائب'' کو تدوین کیا ہے۔اس کے بعد فسانہ عجائب کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ لیکن جو مقبولیت اطہر پرویز کے اس اڈیشن کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہیں ملی۔مثلاً،فسانہ عجائب کا بنیادی متن: مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی اور ڈاکٹر رفیق حسین نے افسانوی اصول اور فسانہ عجائب کے عنوان سے مرتب کیا۔اور ڈاکٹر سید سلیمان حسین اور رشید حسن خان ان دونوں نے بھی فسانہ عجائب کو مرتب کیا ہے۔ان دونوں کے متعلق اطہر پرویز نے اپنے نسخے میں ہی اطلاع دے دی تھی کہ: لیکن جو مقبولیت اطہر پرویز اور رشید حسن خان کے ایڈیشن کو ملی۔وہ باقی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

فسانہ عجائب کی ادبی اہمیت:

سرورؔ انشاء پرداز، مترجم، اور شاعر تھے۔ مگر انہیں ادبی دنیا میں مقبولیت داستان نویسی خصوصاً ''فسانہ عجائب'' کی وجہ سے ملی۔ فسانہ عجائب رجب علی بیگ سرورؔ کی لکھی ہوئی پہلی داستان ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ لکھنو میں ۱۷۸۶ء کو پیدا ہوئے اور بنارس میں ۱۸۶۷ء میں وفات ہوئی۔ انہیں فارسی، عربی پر دسترس حاصل تھی۔ شعروشاعری کے بڑے شوقین تھے۔ اس کے علاوہ علم نجوم، فن سپہ گری، خطاطی اور موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں فسانہ عجائب کے علاوہ انہوں نے ''شگوفۂ محبت'' ''گلزارِ سرور'' ''شبستانِ سرور'' ''فسانہ عبرت'' ''سرورسلطانی'' ''شررِ عشق'' وغیرہ دیگر تصنیفات بھی تحریر کی ہیں۔ لیکن جو شہرت و مقبولیت ''فسانہ عجائب'' کے حصے میں آئی وہ کسی اور تصنیف کو نصیب نہیں ہوئی۔ ''فسانہ عجائب'' ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے جو ایک ادبی شاہکار اور قدیم طرز انشا کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کی عبارت مقفیٰ اور مسجع، طرز بیان رنگین اور دلکش ہے۔ ادبی مرصع کاری، فنی آرائش اور علمی گہرائی کو خوب جگہ دی گئی ہے۔

''فسانہ عجائب'' شمالی ہند کی پہلی اہم اور طبع زاد داستان ہے۔ قصہ روایتی انداز کا ہے اور اس زمانے کی اکثر داستانوں کا عکس کہیں کہیں نظر آتا ہے جیسے ''گلشن نوبہار'' ''سحرالبیان'' ''داستان امیر حمزہ'' ''بہار دانش'' اور پدمات وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ فسانہ عجائب کی عبارت انتہائی پرتکلف، قدرے پیچیدہ اور مقفیٰ و مسجع ہے اور اس داستان کی شہرت کا راز اسی پُرتکلف اسلوبِ بیان اور لکھنوی تہذیب و معاشرت کی عکاسی میں مضمر ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس داستان کا تانا بانا خالص ہندوستانی مزاج کا ہے یہ داستان قصہ در قصہ کی تکنیک میں تحریر کی گئی ہے۔ مافوق الفطرت عناصر، ساحری اور عیاری کسی بھی داستان کے لازم عناصر ہیں، مذکورہ داستان میں دیو، دیوانی، پری اور فقیر تو آتے ہیں لیکن ساحری، جادوگری اور عیاری کا جز قدرے کم ہے۔ قصے کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ قصہ رجب علی بیگ سرورؔ کا طبع زاد ہے۔ ہر چند کہ اس میں جو
> واقعات نظر آتے ہیں، وہ اس زمانے کی اکثر کتابوں میں نظر آتے ہیں،
> لیکن اس میں نقالی کا جذبہ نہیں بلکہ اپنے زمانے کی تہذیبی و معاشرتی

روایات کواختیار کرنے کا جذبہ ہے وہ ہندوستانی مزاج نہ صرف قصّہ میں
نظر آتا ہے بلکہ پلاٹ کی بناوٹ میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے'' ۱

فسانہ عجائب کی خوبی اس کا اسلوب ہے۔ جو مقفع و مسجع زبان میں سمجھی جاتی ہے۔ اس کی عبارت کے بیشتر حصے مقفیٰ اور مسجع ہیں۔ سرورؔ موقع و محل کے مطابق زبان اختیار کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ منظر کشی ،مختلف فنون کی اصطلاحیں، ہر قسم کے ساز و سامان کی تفصیلات ،عوام الناس کے مختلف طبقوں کا طرز کلام، گویا ہر قسم کا بیان اس کے مناسب اور موزوں الفاظ میں کیا گیا ہے۔ عبارت آرائی اور قافیہ بندی میں سرورؔ کو قدرت اور استادانہ مہارت حاصل تھی۔ اور یہ کتاب اردو نثر پر کئی حوالوں سے اثر انداز ہوئی۔ جیسا کہ اطہر پرویز ''فسانہ عجائب'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''فسانہ عجائب، اُردو کی اہم ترین داستانوں میں سے ہے اور اس کا شمار انیسویں صدی کی اُن کتابوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے زمانے کے ادب کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور قبول عام کی سند حاصل کی'' ۲

''فسانہ عجائب'' کے اسلوب کے حوالے سے وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

''نثر میں رنگینئ بیان کے لوازم یعنی قافیہ اور سجع کے صرف قوّت کا اظہار یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کے وجود کی شہادت کے لئے مثالوں کا پیش کرنا تحصیل حاصل ہے اس لئے کہ یہی رنگینئ بیان، یہی نمودِ نثر اور یہی جودتِ طبع ہے جو حقیقت میں سرورؔ کے طرز اور فسانہ عجائب کے بیان کی امتیازی خصوصیت ہے۔'' ۳

دبستان دہلی اور دبستان لکھنو دو الگ الگ دبستان ہیں۔ اور اردو ادب میں دونوں کو اہم مقام حاصل ہے لیکن اہل لکھنئو نے ہر معاملے میں دہلی والوں سے مختلف راستہ اختیار کیا ہے اور اپنی علیحدہ شناخت بنانے کی کوشش کی۔ اہل علم و فن کے ماہروں نے بھی یہی روش اپنائی۔ شاعروں اور ادیبوں نے ایسی تخلیقات پیش کرنی

---

۱ فسانہ عجائب، مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز، ترتیب جدید، سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص:۲۷

۲ فسانہ عجائب، مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز، ترتیب جدید، سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص:۱۶

۳ ہماری داستانیں، وقار عظیم، اورنٹیل کالج، لاہور ۱۹۶۴ء طبع ثانی، ص:۳۳۳

چاہیں جو دہلی کے طرز اسلوب سے بالکل الگ ہو۔اس طرح دبستان لکھنؤ کی بنیاد پڑی۔شاعری میں امام بخش ناسخ اور نثر میں رجب علی بیگ سرور دبستان لکھنؤ کے بانی کہلائے۔یہی وجہ ہے فسانہ عجائب کی زبان مرصع اور مقفع عبارت آرائی سے بھر پور ہے۔فسانہ عجائب کی ادبی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اطہر پرویز نے اس کتاب کو جدید اصولوں کے تحت ترتیب دیا ہے۔

اطہر پرویز پیشے سے معلم تھے۔اور داستان گوئی سے انھیں خصوصی لگاؤ تھا تو اپنے طلباء کو کلاس میں پڑھاتے ہوئے انھیں فسانہ عجائب کو مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے طالب علمی کے زمانے میں ''فسانہ عجائب'' پڑھی تھی لیکن اس کے نقوش دھندلے پڑ چکے تھے۔پچیس سال کے بعد جب میں نے اسے دوبارہ پڑھا تو مجھے کسی اچھے اڈیشن کی تلاش ہوئی۔لیکن جتنے بھی ایڈیشن ملے وہ ایسے تھے کہ ان کا پڑھنا مشکل کام تھا۔اس لئے کہ نہ تو ان میں پیراگراف تھے،اور نہ اضافتیں۔اشعار بھی مسلسل لکھے ہوئے تھے۔میں نے کلاس میں پڑھاتے ہوئے محسوس کیا کہ طالب علموں کے لئے اس کی عبارت کا پڑھنا اور زیادہ دقت طلب تھا تین ....
> سال پہلے طالب علمی کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کو اڈٹ کیا جائے۔اگر کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو ہو پائے تو پیر اگراف قائم کرکے ضروری اعراب کے ساتھ اسے شائع کیا جائے'' [۱]

طلباء کی ضرورت کے تحت اطہر پرویز صاحب نے فسانہ عجائب کو جدید تحقیقی اصولوں کے ساتھ تدوین کیا۔ بحیثیت مدون ان کی یہ تدوین نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے۔کہ انہوں نے سب سے پہلے فسانہ عجائب کو جدید اصولوں کے تحت تدوین کیا ہے۔اس حوالے سے پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں کہ:

> ''نقش اول کے اعتبار سے ڈاکٹر اطہر پرویز کا یہ کام قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔'' [۲]

---

۱ فسانہ عجائب،مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز،ترتیب جدید،سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز،نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص:۳۸

۲ فسانہ عجائب،مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز،ترتیب جدید،سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز،نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص:۱۴

یہ کتاب سن ۱۸۲۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔اطہر پرویز نے اس کتاب کو ۱۹۶۹ء میں مرتب کیا ہے۔ اورایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔جس میں انہوں نے ''فسانہ عجائب'' اور مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور کی ذاتی زندگی کے متعلق تمام تر ممکنہ تفصیلات جمع کردی ہیں۔اس مقدمے میں انہوں نے چند ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں جو اس طرح ہیں:

۱۔ عرض مرتب، ۲۔ مرزا رجب علی بیگ سرور (حیات) ۳۔ فسانہ عجائب مختلف ایڈیشنوں کا جائزہ، ۴۔ فسانہ عجائب ایک تنقیدی مطالعہ، ۵۔ فسانہ عجائب (متن)، ۶۔ فسانہ عجائب کے چند اہم خاتمۃ الطبع اور خاتمہالطبع نسخہ ہذا۔

اس کے علاوہ ضمیمہ بھی لکھا ہے اور ضمیمے کو بھی مندرجہ ذیل ضمنی عنوانات کے تحت منقسم کیا گیا ہے:

☆ شادی کی رسومات لکھنو جن کا ذکر فسانہ عجائب میں ہے۔

☆ چند ہنرمندوں اور فنکاروں کا ذکر جن کا تذکرہ جن کا ذکر بیان لکھنو میں ہے۔

☆ فرہنگ فسانہ عجائب۔

☆ فرہنگ محاورات وامثال فسانہ عجائب۔

☆ فرہنگ آیات وفقرے عربی فسانہ عجائب۔

☆ فسانہ عجائب کے نسخے جو مرتب کی نگاہ سے گزرے۔

اس طرح یہ کام دوسروں سے مختلف اور پسندیدہ بھی تھا چوں کہ طلباء کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب کا نیا ایڈیشن تیار کیا گیا تھا اسی لیے اطہر پرویز نے ان تمام نکتوں کو واضح کیا جن کے بارے میں طلباء کا ذہن متلاشی ہوتا ہے۔

عرض مرتب:

اس حصے میں پرویز صاحب نے اپنی محنت ومشقت کا تذکرہ کرتے ہوئے اوران رفقاء واحباب کا ذکر کیا ہے۔جنہوں نے اس کام کو پائے تکمیل تک پہچانے میں ان کی مدد کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''تحقیق کا کام انفرادی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔میں یہ ''فسانہ عجائب''

کی ترتیب کا کام اکیلے ہی شروع کیا تھا، لیکن لوگ مدد کرتے گئے اور آہستہ آہستہ اس کام میں بہت سے لوگ شریک ہو گئے۔ اس کام میں بزرگوں نے میری حوصلہ افزائی کی، رفیقوں نے قدم قدم پر ساتھ دیا، اور خوردوں نے بروقت ہاتھ بٹایا۔ اگر میں ان سب کے نام گنوانا چاہوں تو گنوا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ لوگ اَن گنت ہیں۔'' [۱]

اطہر پرویز صاحب نے جدید اصولوں پر عمل پیرا ہو کر فسانہ عجائب کی تدوین کی ہے۔ ڈھائی سال کی مدت میں انہوں نے اس کام کو سر انجام تک پہنچایا اور جون ۱۹۶۹ء میں سنگم پبلیشرز الہ آباد سے شائع ہوئی اور خوب شہرت حاصل کی۔ انہوں ۱۹۶۵ء میں اس داستان کو مرتب کرنا شروع کیا تھا اور ۱۹۶۸ء میں مکمل کیا۔ فسانہ عجائب سے متعلق جتنے بھی نسخے انہیں دستیاب ہو پائے تھے انہوں نے بہت ہی محنت اور عرق ریزی سے ان سب کی چھان بین کی۔ اور اس سلسلے میں انہیں علی گڑھ کے علاوہ دہلی، الہ آباد، رامپور اور لکھنو وغیرہ کا سفر بھی کیا۔ اور وہاں موجودہ نسخوں کو باریک بینی سے مطالعہ کر کے منظر و پس منظر پر غور و فکر کر کے ان میں سے چند نسخوں کو انہوں نے اپنے ایڈیشن کی نبیاد بنایا۔ جیسا کہ گیان چند جین اپنی شاہکار تصنیف ''اردو کی نثری داستانیں'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''(فسانہ عجائب) مرتبہ اطہر پرویز سنگم پبلشرز الہ آباد جون ۱۹۶۹ء اس کے شروع میں بہت اچھا تنقیدی و تحقیقی مقدمہ ہے۔ انہوں نے مولوی محمد یعقوب انصاری کے افضل المطابع کانپور کے ۱۲۷۶ھ کے ایڈیشن، مطبع احمدی شاہدرہ، دلہائی ضلع میرٹھ ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ کے ایڈیشن، اور ایک قلمی نسخۂ مخزونۂ مسلم یونیورسٹی لائبریری پر اپنے ایڈیشن کی بنیاد رکھی۔'' [۲]

آگے مرتب متن نے ان تمام حضرات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے نسخوں کو جمع کرنے میں ان کی مدد کی ہے۔ بعض حضرات سے ملاقات کی بعض سے خط و کتابت کے ذریعے معلومات حاصل کی مثلاً نیر مسعود، ڈاکٹر

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتب اطہر پرویز، جدید ترتیب سیما پرویز، براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۲۰۱۱ء ص: ۲۰

[۲] اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، سن اشاعت، جولائی، ستمبر ۲۰۰۲ ص: ۵۲۱

عبدالستار، عابد رضا بیدار، ڈاکٹر حکم چند نیّر ،انوار اللہ خاں وغیرہ اس طرح پرویز صاحب نے تدوین سے پہلے متن سے متعلق تمام تر نسخوں کو جمع کر کے مواد کی فراہمی کے مرحلے میں کامیاب ہوئے اس کے بعد ان جمع کردہ نسخوں کی تصحیح کا مرحلہ آتا ہے۔اس میں بھی چند احباب و رفقاء کی معاونت انہیں حاصل رہی ہے۔جیسا کہ وہ خود رقمطراز ہیں کہ:

''آخری مرحلہ کاپیوں کی تصحیح کا تھا۔اس سلسلے میں بہت سے لوگوں نے میرا ہاتھ بٹیا۔ان میں میرے ایک بزرگ چودھری عثمان علی خاں صاحب اور میرے چچا جناب محمد ادریس صاحب .... جناب سرور علی زیدی، عزیزی اقبال، عزیزی کلیم شبیر، عزیزی محمد آفاق سلمہ ،عزیزہ سیما سلمہا نے بھی کاپیوں کی تصحیح میں میری بڑی مدد کی ،اور نہ ان کی تصحیح تن تنہا میرے بس کی بات نہ تھی ۔میری بیوی صدیقہ بیگم نے گزشتہ دو سال میں وقتاً فوقتاً میرے اس کام میں مجھے بڑا سہارا دیا۔'' [۱]

اس طرح پرویز صاحب نے بہت محنت و مشقت سے جدید اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے فسانہ عجائب کو مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔بہت سے اساتذہ اور مشہور و معروف ناقدین و محققین کے صلاح و مشورے سے اس تدوین میں اضافے کیے ہیں ۔ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ فسانہ عجائب کا ایک معیاری تنقیدی ایڈیشن تیار ہو کر شائع ہوا جس سے طالب علموں کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔

مرزا رجب علی بیگ سرؔور (حیات):

اطہر پرویز صاحب نے سرور کی تاریخ پیدائش، سرؔور کا وطن، اردو کے علاوہ سرؔور کو کن کن زبانوں پر مہارت حاصل تھی، اس کے علاوہ سرور کو فنون لطیفہ مثلاً خطاطی، موسیقی وغیرہ کے علم سے بھی بخوبی واقفیت، قیام کانپور، مرزا غالب سے سرؔور کی ملاقات، ترتیب شدہ مخطوطے کی ادبی اہمیت اور سرؔور کی ذاتی زندگی کے تمام پہلوں سے متعلق سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے مختلف مصنفین کی آراء کو موضوع بحث بنایا

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتب اطہر پرویز، جدید ترتیب سیما پرویز، ص:۲۳

ہے۔سرور کی تاریخ پیدائش کے تعلق سے انہوں نے سب سے پہلے رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' کا حوالہ پیش کیا ہے کہ ''سنہ ۱۲۰۱ھ یا ۱۲۰۲ھ میں لکھنو میں پیدا ہوئے'' اور حامد حسن قادری کی ''داستان تاریخ اردو'' کے مطابق ''غالباً ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء (مرزا غالبؔ سے دس برس پہلے'' ہوئے ہوں گئے۔ڈاکٹر نیّر مسعود نے اپنے تحقیقی مقالے ''مرزا رجب علی بیگ سرورؔ حیات اور کارنامہ'' میں انہوں نے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کا اندازہ لگایا اس بناء پر کہ سرورؔ نے فسانہ عجائب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''چالیس سال جہاں کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے'' کیوں کہ فسانہ عجائب کا نقش اول ۱۲۰۰ھ میں تیار کیا گیا تھا۔

اطہر پرویز صاحب نے ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> ''ان تمام بحثوں کا حل یہ ہے کہ سرورؔ تیرھویں صدی ہجری کے عشرہ اول کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے'' [۱]

اس بحث کے بعد پرویز صاحب نے سرورؔ کے وطن کے متعلق بحث کی ہے۔محقق مخمور اکبرآبادی جنہوں نے سرورؔ کا وطن اکبرآباد کو بتایا ہے لیکن پرویز صاحب نے ان کی اس رائے کو رد کرتے ہوئے مع دلیل یہ ثابت کیا ہے کہ سرورؔ کا وطن لکھنو ہی ہے۔اور دلیل کے طور پر انہوں نے سرورؔ کی دوسری تصنیف ''گلزار سرور'' میں شامل سرورؔ کے قول کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: جس میں خود سرور نے اپنے وطن لکھنو کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''مخمور اکبرآبادی نے اپنے اس دعوے کے لئے دلیل نہیں پیش کی۔........ یہ بات سرور کی کسی تحریر سے ثابت نہیں ہوتی۔اس لئے لکھنو ہی کو ان کا وطن تسلیم کرنا چاہیے ،جس سے سرورؔ کو وہی والہانہ تعلق ہے جو کسی حساس اور خوددار شخص کو اپنے وطن سے ہوا کرتا ہے۔مثلاً ''گلزار سرور'' (ترجمہ حدائق العشاق) میں اپنے اور لکھنو کے متعلق جو بیان ہے، سرورؔ نے اس عنوان کو اس طرح قائم کیا ہے۔''مذکورۂ آوارۂ وطن، خزاں دیدۂ چمن مترجم حدائق العشاق رجب علی بیگ سرورؔ عفی عنہ'' یہ عنوان اس

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتب اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص: ۲۵

خیال کی توثیق کرتا ہے کہ لکھنؤ ہی سرؔور کا وطن تھا۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں
معلوم ہوتا کہ لکھنؤ کی محبت ہی نے سرؔور کو صاحب طرز نثر نگار بنایا۔'' [۱]

ساتھ ساتھ اطہر پرویز صاحب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سرورؔ کو شعر و شاعری کا بہت شوق تھا اسی لیے انہوں نے سرورؔ تخلص اختیار کیا تھا آغا نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''فسانۂ عجائب'' میں موقع بر موقع اشعار کی بھرمار ہے۔ لیکن انھیں خود شاعری میں کامیابی حاصل نہ ہو پائی۔ اس کا اعتراف انہوں نے بزبان خود کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''شعر کہنے کا خیال خام رہا، جب وہ بھی نہ ہوسکا، نثر کی طرف خیال آیا'' اس کے علاوہ سرور کا مشاہدہ بھی بہت گہرا تھا۔ اور لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کو بیان کرنے میں کمال قدرت حاصل تھی۔ اس حوالے سے اطہر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''سرؔور کا ادبی مذاق تربیت یافتہ ہے۔ لکھنؤ میں سرور نے جو زندگی گزاری
> وہ یقیناً بھرپور ہوگی ''بیان لکھنؤ'' میں اُنھوں نے جس طرح لکھنؤ کے گلی
> کوچوں کی تصویر کشی کی ہے، سیر و تفریح کا ذکر کیا ہے، وہ ایک ایسے آدمی کا
> بیان معلوم ہوتا ہے جو خود تماشا بھی رہا ہے اور تماشائی بھی۔'' [۲]

سرؔور کے تعلق سے یہ بات بھی بہت بحث کن رہی کہ انہیں لکھنؤ سے جلاء وطن کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں پرویز صاحب نے رابابوسکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' اور نیّر مسعود کا تحقیقی مقالہ ''رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامہ'' اور خود سرور کے قول کو پیش کیا ہے جو کہ فسانہ عجائب مطبوعہ نولکشور ۳۹واں ایڈیشن میں مذکور ہے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ایک لمبی چوڑی بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''سرؔور یہ تحریر خود غازی الدین حیدر کے سامنے پیش کرنے کی خواہش
> مند تھے۔ اگر وہ واقعی جلاء وطن کئے گئے ہوتے تو ان کو اتنی جرأت
> ہرگز نہیں ہوسکتی کہ اسی بادشاہ کے سامنے غلط بیانی سے کام لیتے کہ یہ
> صورت تو بادشاہ کی مزید ناراضگی کا سبب ہوسکتی تھی۔ سرؔور اپنے عہد کے
> نمایاں فرد تھے۔ تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے اگر جلاء وطنی بحکم بادشاہ

---

۱ فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص:۲۶

۲ فسانہ عجائب، مرزا رجب علی بیگ سرور، ترتیب، ڈاکٹر اطہر پرویز، سنگم پبلشرز الہ آباد، ص:۲۷

اودھ ہوتی تو اس معاملے پر معاصر تذکرے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔
خود لکھنو والوں سے تو کم از کم سروؔر کے حالات چھپے ہوئے نہ تھے۔
فسانہ عجائب مطبوعہ افضل المطابع کے خاتمۃ الطبع سے یہ صاف طور پر یہ
بات ثابت ہے کانپور کے مخالفوں کا ایک گروہ موجود تھا۔ ....
ان کے مخالفین میں سید محمد فخر الدین حسین خاں متخلص بہ سخن دہلوی
مصنف ''سروش سخن'' نے خاصی شہرت حاصل کی۔اگر سروؔر فی الوقع
جلاء وطن کئے گئے ہوتے تو دوسرے مخالفین کے علاوہ سخن دہلوی ''سروش
سخن'' کے دیباچے میں اس کا ذکر ضرور کرتے۔''[۱]

ہاں تلاش ومعاش کے لیے سروؔر کا کانپور جانا بھی تحقیق طلب ہے۔کیوں کہ انہیں کانپور میں کوئی روزگار ملا کہ نہیں اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔کیوں کہ بڑھاپے میں جب سروؔر کو روزگاری کے لیے بنارس جانا پڑا تو انہیں بنارس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔اس کے برعکس کانپور کی انہوں بہت مذمت کی ہے پرویز صاحب نے سروؔر کے خطوط کے ذریعے اس بات کا انکشاف کیا کہ سرور سے لکھنو میں ایک قتل سرزدہ ہوگیا تھا۔جس کی وجہ سے انہیں کانپور جانا پڑا یہاں وہ نیّر مسعود کی رائے سے متفق ہیں۔ان مباحث کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''ڈاکٹر نیّر مسعود کو شک ہے کہ ممکن ہے اسی کے نتیجے میں انھیں کانپور جانا
پڑا۔میرا قیاس یہ کہتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں جب وہ کانپور گئے تو اس وقت وہ
قتل سے بری ہو چکے تھے۔(ورنہ فسانہ عجائب کے مقدمے میں اس کا
ذکر کسی بھی عنوان سے نہ کرے کہ کوئی وجہ نہیں)البتہ بری ہونے کے
بعد مقتول کے متعلقین کی دشمنی کی وجہ سے ان کے لئے لکھنو کا قیام
خطرے سے خالی نہیں نہ ہوگا۔غالباً اسی لئے کانپور کے قیام کا زمانہ
انہوں نے گوشہ نشینی میں گزارا۔''[۲]

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، سنگم پبلشرز، الہ آباد، ص:۹۱

[۲] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، سنگم پبلشرز، الہ آباد، ص:۲۰

شک وشبہ کی بات یہ ہے جس طرح سرؔور نے کانپور کی ہجو کی ہے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی اور مسئلہ بھی ضرور رہا ہوگا یہاں پرویز صاحب نیّر مسعود کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ سرؔور سے ایک قتل ہو گیا تھا۔ بری ہونے کے بعد لواحقین کی دشمنی بہت بڑھ گئی تھی اسی لیے انھیں کانپور جانا پڑا اور وہی انہیں ایک قصہ لکھنے کی خواہش ظاہر کی اور حکیم اسد خان کی فرمائش پر سرؔور نے فسانہ عجائب لکھی۔

اس طرح اطہر پرویز صاحب نے سرؔور کے قیام کانپور پر بھی بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر نیّر مسعود کو شک ہے کہ ممکن ہے کہ اسی کے نتیجے میں انھیں کانپور جانا پڑا۔ میرا قیاس کہتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں جب وہ کانپور گئے تو اس وقت وہ قتل سے بری ہو چکے تھے۔[۱]

پرویز صاحب نے ''فسانہ عجائب'' کے علاوہ ''شگوفہ محبت'' ''گلشن سرؔور'' شرر عشق'' ''انشائے سرؔور'' غیرہ دوسری تصانیف کا تذکرہ بھی جگہ بہ جگہ کیا ہے۔ اور امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائش پر سرؔور نے ''شگوفہ محبت'' لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ سرؔور نے بہت تنگ حال زندگی گزاری آخر کار واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں سرؔور کو شاہی ملازمت ملی قطب الدولہ کے توسط سے لیکن جب سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا۔ تو پھر سے تنگ دستی نے سرور کا دامن گھیر لیا۔ تو انہوں نے نواب علی قلی خان کی جو کہ وزیر تھے ان کی خدمت میں ایک عرضی لکھی اور بہت ہی دلیری کیساتھ اپنا معاملہ پیش کیا ڈاکٹر نیّر مسعود نے اس عرضی کو جرأت رندانہ سے تعبیر کیا ہے۔ سرؔور بہت خوددار شخص تھے پرویز صاحب نے لکھا ہے اتنی مشکلات کے بعد بھی سرؔور کی شخصیت میں خم نہ آیا۔ انشائے سرور میں سرؔور نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ: ''خط لکھا، طبیعت کیا کیا رکتی ہے، کمر جھک گئی ہے مگر گردن نہیں جھکتی ہے'' ۱۸۵۶ کو سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا بادشاہ کو معزول بنا کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا اور لکھنو کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی بقول سرؔور ''شہر کاٹے کھانے لگا'' سن ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء کو مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ نے سرؔور کو بنارس بلایا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ سرؔور کی زندگی معاشی پریشانیوں میں گزری لیکن بنارس جا کر سکون ہوا اور وہاں ان کا قیام گیارہ سال تک رہا اور وہی ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء کو سرؔور نے اس دار الفانی کو الوداع کہا۔

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، سنگم پبلشرز، الہ آباد، ص: ۲۰

مزید برآں یہ کہ پرویز صاحب نے سروؔر سے مرزا غالب کی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے جس کا تفصیلاً تذکرہ ''تذکرہ غوثیہ'' میں ملتا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ سروؔر نے غالب سے باغ و بہار اور فسانہ عجائب کے اسلوب بیان کے متعلق سوال کیا۔ تو جواب میں غالب نے اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ ''اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے'' لیکن پرویز صاحب نے دلائل کے ذریعے یہ واضح کیا کہ یہ بات محض زیب داستان ہے غالب فسانہ عجائب کے اسلوب بیان کے مداح تھے۔ انہوں نے غالب کے خط جو منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام تھا اس سے اور گلزار سرور کو جس پر غالب نے تقریظ لکھی تھی۔ ان دونوں حوالوں کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے اور انہوں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> ''اس واقعے کی صداقت میں ذرا شبہ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود مرزا غالب اس اسلوب کو پسند کرتے تھے کیونکہ بعد میں انہوں نے ''گلزار سرور'' کی تقریظ بھی لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس تقریظ کو غالبؔ نے کسی مجبوری کے تحت تو لکھا نہیں ہوگا اور غالب بے جا تعریف کے قائل نہ تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہؔ نے اپنی کسی کتاب کی تقریظ کے متعلق مرزا غالب کو شکایتاً لکھا کہ'' آپ نے تقریظ کچھ بھی نہ لکھی یعنی جو طریقہ فرسودہ اس وقت اپنائے روزگار کا تھا۔ آپ نے اس کی تقلید نہیں کی، تو مرزا صاحب جواب میں لکھتے ہیں'' واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی مدح تمہاری کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھئی میری روش نہیں'' اس کے پیش نظر'' گلزار سرور'' کی تقریظ میں مرزا غالب لکھتے ہیں: ''مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان و شوخئ تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے''[1]

---

[1] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص: ۳۲/۳۳

اس طرح پرویز صاحب نے اس بات کو مع دلیل وشواہد سے واضح کیا ہے کہ غالب سرؔور کے اسلوب کو پسند کرتے تھے اور یہ کہ غالب کی شخصیت سے سب واقف ہیں ان سے کوئی مجبوراً کام نہیں کرواسکتا۔

الغرض اس حصے میں پرویز صاحب نے مرزا رجب علی بیگ سرؔور کی حالاتِ زندگی کے بارے میں مفصلاً ذکر کیا ہے۔ مثلاً ان کے شوق ومشغلات، کن کن زبانوں پر عبور تھا، مالی مشکلات، وجہ قیام کانپور، وغیرہ کے متعلق بہت ہی وضاحت وتفصیل کے ساتھ معلومات دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کے زمانے کے بادشاہوں کے بارے میں بھی جانکاری دی گئی ہے جگہ جگہ پر مصنف کی دوسری تصنیفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور سب سے قابل داد کام یہ ہے کہ کتاب کے آخر میں فرہنگ تیار کی ہے اور عربی آیات کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے اور جن اشخاص کا سرؔور نے داستان میں ذکر کیا ہے۔ ان سب کے بارے میں معلومات حاصل کر کے کتاب میں شامل کی گئی ہے اس طرح سے دیکھا جائے تو اس کتاب کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

فسانۂ عجائب مختلف اڈیشنوں کا جائزہ:

سرؔور نے ''فسانہ عجائب'' ''باغ و بہار'' کے جواب میں لکھی اور میر امن کے سادہ اور آسان اسلوب پر طنز کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ادب کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور سرؔور کے مخالفین کا ایک الگ گروہ سامنے آیا۔ اور ان میں سے سخن دہلوی جو خود کو مرزا غالب کا شاگرد بتاتے ہیں۔ انہوں نے فسانہ عجائب کے جواب میں ''سروش سخن'' لکھی۔ اور اس میں سرور کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ یہ کتاب ''فسانہ عجائب'' لکھنے کے انیس سال کے بعد شائع ہوئی۔ اسی لیے سرور نے بہت بار اس میں ترمیم وتنسیخ کا کام جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے یہ کتاب طنز کا نشانہ بنی۔ اس لیے اس کتاب کے مختلف اڈیشن تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ مختلف مطبع خانوں سے شائع ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ فسانہ عجائب کے کئی اڈیشن منظر عام پر آئے۔ اسی لیے پرویز صاحب نے دستیاب کردہ تمام نسخوں تک رسائی حاصل کر کے ان کا ایک تعارفی تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے مندرجہ ذیل دس گیارہ نسخوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں چار نسخوں کو اپنے مخطوطے کا بنیادی ماخذ بنایا ہے۔ (میر حسن کے مطبع، مطبع مصطفائی، مطبع مراۃ الاخبار، مطبع رفاء عام دہلی، مطبع محمدی کانپور، (اس نسخے میں مولوی محمد حسین کی فرمائش پر سرؔور نے نظر ثانی کی ہے) مطبع جمنا داس اور بلدیو سہائے مولوی فضل حسین کی کوشش سے

۱۲۷۱ھ میں چھپا، مطبع جمنا داس کانپور (اس اڈیشن کے بارے میں پرویز صاحب نے بتایا ہے کہ یہ اڈیشن ۱۲۶۷ھ کی اڈیشن کی نقل ہے فرق بس یہ ہے کہ خاتمۃ الطبع کی عبارت میں جہاں حاجی حرمین محمد حسین کا ذکر ہے اس اڈیشن میں لالہ جمنا داس کا نام لکھ دیا گیا ہے۔) یہ کلکتہ میں ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا لیکن اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ طلباء کے لیے شائع کیا گیا تھا اسی لیے اس میں بعض چیزیں حذف کی گئیں۔ اس کے بعد فسانہ عجائب نولکشوری دور میں داخل ہوتی ہے اور سالہا سال یہی سے شائع ہوتی رہی۔

اس کے علاوہ پرویز صاحب نے جن چار نسخوں پر اپنے مخطوطے کی بنیاد رکھی ان میں سے دو کا ذکر خاص طور پر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے متعلق پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے اپنے نسخے کی بنیاد ان دو نسخوں پر رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ ان سے بہتر نسخے ہیں بھی نہیں۔ مطبع احمدی کا نسخہ سرور کے انتقال سے چھ سال پہلے چھپا'' [1]

اس نسخے کو مولوی یعقوب نے بہت ہی عرق ریزی سے ۱۲۷۶ھ میں مطبع افضل المطابع محمدی سے شائع کیا۔

یعقوب مشہور صحافی تھے۔ ''اخبار طلسم'' نکالتے تھے۔ اور اس دور کے مقفٰی و مسجع عبارت کے خواہاں تھے ان کا شمار سرورؔ کے خاص رفقاء میں ہوتا ہے سرور نے اپنے بیٹے کے نام جو خط لکھے ہیں ان میں کئی بار ان کا ذکر آیا ہے اس لیے یہ نسخے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ جب اس نسخے کی اشاعت کی تیاری ہو رہی تھی تو اس وقت سرور خود بنارس میں مقیم تھے لیکن مولوی یعقوب صاحب کی غیر معمولی محنتوں کی وجہ سے بنارس سے ہی سرور نے ان کے اسرار پر فسانہ عجائب میں نظر ثانی کی۔ (خاتمۃ الطبع اور بیان لکھنو میں سرور نے ان کے مطبع اور ان کا ذکر کیا ہے۔) مزید برآں یہ کہ پرویز صاحب کو ایک قلمی نسخہ بھی ملا لیکن اس میں نہ سن اشاعت درج ہے اور نہ کاتب کا نام بلکہ مرتضٰی حسین نامی کسی شخص کی ملکیت میں تھا۔ جو میں مولانا آزاد لائبیریری میں ہے اس نسخے میں بیان لکھنو کے ضمن میں چند ایسے صفحات ہیں جو کسی دوسرے مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتے۔ پرویز صاحب نے ان کو متن میں شامل کیا ہے۔ اور حاشیہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح سے سرور نے کئی بار فسانہ

---

[1] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص:۵۴

عجائب کی ترمیم و تنسیخ کی پرویز صاحب نے ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''ان مختلف نسخوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے۱۲۹۲ کہ سرؔور نے اپنی اس اہم کتاب پر بار بار نظر ثانی کی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی تصحیح سے خود مطمئن نہیں ہوئے اور خوب سے خوب تر بنانے کی فکر میں لگے رہے یہاں تک کہ نظر ثانی کرنے کے بعد پھر اس کو ٹھیک کرنے کا خیال رکھتے تھے جیسا کہ افضل المطابع کے اڈیشن سے معلوم ہوتا ہے'' دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا ارادہ ہے اور مصنف بھی بشرط فرصت نیا کر دینے کا آمادہ ہے''۔[۱]

تاہم اطہر پرویز نے فسانہ عجائب کے مذکورہ بالا دس گیارہ متفرق نسخوں کو جمع کر کے ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا اور ان نسخوں پر تعارفی گفتگو کی۔سرور نے متن سے زیادہ دیباچے میں تبدیلیاں کی ہیں۔فقروں اور ترکیبوں میں بھی بعض جگہ تبدیلی کی ہے پسر مجسٹن کا قصہ نصیرالدین حیدر کے عہد میں لکھ کر شامل کیا گیا،اس کے علاوہ انجمن آراء کے جہیز کا ذکر، بندر کی تقریر کی نثر اور احوال محمد شاہ جس کا ذکر انہوں نے فسانہ عبرت میں کیا ہے ان دونوں کی نثر میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے اسی لیے پرویز صاحب کا خیال ہے کہ یہ اسی کا حصہ ہے بعد میں سرؔور نے فسانہ عجائب کی مقبولیت کے حساب سے اس حصے کو اس میں شامل کر دیا ہوگا۔

مزید برآں قصے کے اندرونی اور بیرونی شواہد پر بحث کر کے پرویز صاحب نے داستان'' فسانہ عجائب'' کے زمانۂ تصنیف کا تعین کرنے کی سعی کی ہے۔اس کے علاوہ فسانہ عجائب کے مختلف اڈیشنوں کو جمع کیا۔اس کے بعد ان کا انہوں نے تدوین متن کے سلسلے میں ممکنہ دستیاب نسخوں تک رسائی حاصل کی اور ان کا تنقیدی مطالعہ بھی کیا۔ان نسخوں میں انہیں بعض اضافی چیزیں ملی جن کو انہوں نے اپنے مخطوطے میں شامل کیا۔ اور حاشیے میں اس کے متعلق تفصیلات دے دی ہیں۔یہ اضافی تفصیلات متداول کسی نسخے میں نہیں تھی۔

فسانہ عجائب ایک تنقیدی مطالعہ:

اس حصے میں پرویز صاحب نے فسانہ عجائب کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔اور اردو ادب میں

---

[۱] فسانہ عجائب،مرتبہ اطہر پرویز،جدید ترتیب،سیما پرویز،براؤن بک،پبلی کیشنز،نئی دہلی ص:۵۶

داستانوں کی اہمیت کو واضح کیا ہے ناولوں و داستانوں کا تقابل پیش کیا ہے۔فسانہ عجائب ایک ایسے دور میں تحریر کی گئی داستان ہے۔جس میں تقریباً داستانیں اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی اور داستان کی جگہ ناول اپنے قدم جمانے کی کوشش کررہا تھا داستان کے متعلق پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''داستانوں میں وہ معصومیت ہوتی ہے جو ابتدائی انسان کا خاصہ تھیں یہاں زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے،نیک و بد میں ہماری موجودہ تہذیب اس طرح دو خانوں میں نہیں بانٹی جاسکتی۔داستان کا ہیرو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے جہاں اسے نہ روٹی کا مسئلہ پریشان کرتا ہے اور نہ اس کے ذمے کوئی فرائض ہیں۔'' [1]

اس کے برعکس ناولوں میں زندگی کا تصور بالکل مختلف تھا۔جیسا کہ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے عہد کے ناولوں میں زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار ملتا ہے۔ ناول کے لئے زندگی کی ترجمانی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔یہاں اگر زندگی سے کوئی انحراف ہے تو صرف اتنا کہ زندگی کا دریا آزادانہ بہتا ہے، اسے فن کے سانچے میں ڈھال کر ایک مخصوص ہیئت دے دی جاتی ہے۔ داستانوں میں آرزومندی ملتی ہے جب کہ ناول میں بے درد حقیقتوں کا سامنا کیا جاتا ہے۔'' [2]

فسانہ عجائب کو داستان یا ناول دونوں میں سے کسی ایک خانے میں رکھنا مشکل ہے گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فسانہ عجائب داستان کے مقابلے میں ناول سے قریب تر ہے کیوں کہ اس کا پلاٹ کئی حد تک مربوط ہے، اور ایسے کردار ہیں کہ جو اس عہد کی معاشرت کی عکاسی بخوبی کرتے ہیں۔جب کہ اس عہد میں قصوں میں کردار نگاری کا تصور زیادہ نہیں تھا خال خال ہی کسی داستان میں کردار نگاری دیکھنے کو ملتی تھی اس سلسلے میں پرویز صاحب فسانہ عجائب کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''ایک مربوط قصہ ہے جو اپنے منطقی انجام تک پہنچتا ہے، جہاں واقعات

---

[1] فسانہ عجائب،مرتبہ اطہر پرویز،جدید ترتیب،سیما پرویز،براؤن بک،پبلی کیشنز،نئی دہلی ص:۶۳

[2] فسانہ عجائب،مرتبہ اطہر پرویز،جدید ترتیب،سیما پرویز،براؤن بک،پبلی کیشنز،نئی دہلی ص:۵۴

اور حادثات کو ایک پلاٹ کے اندر ایک ڈور میں پرو دیا گیا ہے۔ یہ ڈور
نہ کہیں ٹوٹتی ہے اور نہ کہیں سے لٹکتی ہے بلکہ اس میں تناؤ بھی ہے اور
ہمواری بھی۔ اس کے پلاٹ میں وحدت بھی ہے اور تسلسل بھی۔ یہ اس
طرح قائم رکھا گیا ہے کہ ہر کردار اور ہر واقعہ اپنے اپنے زاویے سے
پلاٹ کی طرف روشنی ڈالتا ہے۔ یہ اسے داستان سے زیادہ ناول کی
طرف لے جاتا ہے۔'' [۱]

فسانہ عجائب اردو کی پہلی طبع زاد داستان ہے۔ یہ داستان معاشرت نگاری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس میں اس زمانے کی ہندوستانی معاشرت بالخصوص لکھنو کی تہذیب وتمدن کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہندی معاشرے کے زیر اثر تشکیل پانے والے مسلم معاشرہ کی نہایت عمدہ طریقے سے عکاسی کی گئی ہے۔ لکھنو کی طرز معاشرت، رسم ورواج، کھیل تماشوں، لکھنوی امراء ورؤساء کا رکھ رکھاؤ، بازاروں کی رونقیں، جلس وجلوس، وغیرہ کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔ غرض لکھنو کے ہر طبقہ فکر اس کے رسم ورواج، چال ڈھال کی عکاسی ملتی ہے۔ سرورؔ کو لکھنو سے والہانہ محبت تھی۔ اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''رجب علی بیگ سرورؔ نے اپنے ماحول سے پورے طور پر فائدہ اٹھایا
ہے اور اس ماحول کو اس خوبصورتی سے قصے میں سمولیا ہے کہ کبھی کبھی
پڑھنے والوں کو یہ ماحول حقیقی کے بجائے تخیلی معلوم ہوتا ہے۔'' [۲]

فسانہ عجائب کی دوسری اہم خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے۔ سرور کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے داستان کے کراداروں کی معاشرت میں لکھنوی معاشرت کی تصویر کشی کی ہے۔ یہی وجہ ہے اگر چہ داستان کے کردار غیر ملکی اور مافوق الفطرت اور خیالی ہیں۔ لیکن سرور نے ان کرداروں کے ماحول، رسم ورواج، طرز معاشرت میں لکھنوی تہذیب وتمدن کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور داستان میں اس عہد کا لکھنو جیتا جاگتا نظر آتا ہے انہیں اپنے وطن لکھنو سے بے انتہا محبت ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ وبہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص: ۵۶

[۱] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص: ۵۶

پر باوضع قطع دار ہے ہر چند ہر محلے میں جہاں کا ساز وسامان مہیا ہے۔
لیکن اکبری دروازے سے جلو خانے اور پکے پل تک صراط مستقیم ہے۔
کیا جلسہ ہے۔نانبائی سلیقہ شعار، شیر مال، کباب، نان، نہاری، جہاں
کی نعمت اس آبداری کی، جس کی بو باس سے دل طاقت پائے دماغ
معطر ہو جائے۔'' [۱]

کرداروں کی طرز زندگی میں ہندوستانی معاشرت، تہذیب وتمدن کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اس زمانے میں ہندی معاشرے کے زیر اثر تشکیل پانے والے مسلم معاشرہ کی نہایت عمدہ طریقے سے تصویر کشی کی گئی ہے یہی ہندوستانی مزاج اس داستان کی خصوصیت ہے اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''فسانہ عجائب کی اہم خصوصیت، جس کی طرف میں خاص طور پر اشارہ
کرنا چاہتا ہوں، اس کا ہندوستانی۔ یہ ہندوستانی مزاج نہ صرف نفس
قصّہ میں نظر آتا ہے بلکہ پلاٹ کی بناوٹ میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔
ہندوستانی قصوں میں توتے کی اہمیت غیر معمولی رہی ہے اور اکثر اس کی
حیثیت ایک کردار کی رہی ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے بھی اس قصے کا
محرک توتے ہی کو بنایا ہے۔'' [۲]

ہندوستانی مزاج کہ ہمیں داستان کے کرداروں میں اس وقت کا لکھنؤ زندہ نظر آتا ہے۔

سرور نے اس تہذیب کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ جس میں ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ اور نہ اس سماج میں کسی طرح کی منفی قدریں پائی جاتی تھیں کہ جس سے نفرت کا جذبہ ابھرے، بلکہ رواداری اس سماج کی بنیادی قدر تھی۔ یہ سماج مشترکہ تہذیب کا دلدادہ تھا۔ شادی کے بعد کی دیگر رسومات جن میں ڈومنیوں کا سیٹھنیاں اور پاہونی گانا، رخصتی کے وقت شہنائیں، بھباس الیاس للت، رام کلی کا پھونکنا، نقیب اور چوبدار کا کوئل کی طرح کوکنا، اور ان پر مستزاد بکرا ذبح کرنا اور انگوٹھے میں لہو لگانا خالص ہندوستانی معاشرت کی دین ہے۔ اس وقت جو تصورات ہندوستان میں رائج تھے ان کو سرور نے بہت ہی خوبصورتی

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص:۱۱٦

[۱] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص:۲۷

سے اپنے قصے میں پیرویا ہے۔اس زمانے میں تصوف اور بھکتی تحریک کا زور تھا ہندو مسلمان دونوں کا ان پر ایمان تھا۔

داستان کی معاشرتی عکاسی کا جائزہ لینے کے بعد پرویز صاحب نے ''فسانہ عجائب'' اور'' باغ و بہار'' کا موازنہ کیا ہے۔ یہ دونوں داستانیں ' باغ و بہار'' اور ''فسانہ عجائب' اردو کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ جب کہ باغ و بہار ترجمہ ہے۔لیکن طرز نگارش کی خوبی سے یہ ترجمہ نہیں لگتا اوراس کے ۲۲ سال کے بعد فسانہ عجائب لکھی گئی فسانہ عجائب کی زبان مقفیٰ و مسجع ہے۔عبارت میں قافیہ پیمائی ہے عربی و فارسیت کا غلبہ ہے۔ دراصل میرامن کا تعلق دہلی سے تھا اور سرور کا لکھنو سے یہی وجہ تھی کہ میرامن کو دہلی کی ٹکسالی زبان پر فخر تھا اور سرور لکھنوی زبان کے مداح تھے۔غرض کی فسانہ عجائب میں مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی ،تکلف و آورد اور دورد ہے تو باغ و بہار میں سادگی ،سلاست ،بے تکلفی روانی اور تسلسل ہے۔

اسی مناسبت سے یہ دونوں داستانیں ہی سب سے زیادہ ناقدیں کی نظر کا نشانہ بنی رہیں اور اردو تنقید میں بحث کا حصہ بنی۔اور اردو کے نامور ناقدین نے فسانہ عجائب کے اسلوب کو نشانہ بنایا ہے اسی حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

> ''سرور نے جو سخن گسترانہ بات کہہ دی تھی اس کا رخ باغ و بہار والے میرامن کی طرف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 'فسانہ عجائب' کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ شرط لازمی قرار دی گئی کہ اس کو باغ و بہار سے ٹکرا کر دیکھا جائے۔تنقید کا ایک میکانکی انداز ، جو بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس تیس سال تک بہت مقبول تھا ''فسانہ عجائب'' کو بھی اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معلموں نے روایتی طریقے سے دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کو ایک ہی چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اگر ان تنقیدی رایوں کو دیکھا جائے تو یہ پلڑا ہمیشہ باغ و بہار کی طرف جھکتا نظر آتا ہے اور اس کی وجہ صرف اتنی بتائی جاتی ہے کہ باغ و بہار کی زبان صاف ستھری اور بول چال کی زبان ہے۔اس میں صنائع لفظی و

معنوی کی بھر مار نہیں ہے۔اس میں تصنع کا نام ونشان نہیں اور اس کے
برخلاف فسانہ عجائب کی زبان روزمرہ کی زبان نہیں۔ یہ ادبی زبان ہے۔
لکھنو کی ملمع شدہ تہذیب کی زبان ہے اس زبان میں آمد نہیں آورد ہے۔
یہ فطری ہونے کے بجائے اکتسابی اور عامیانہ ہونے کے بجائے عالمانہ
ہے۔''[۱]

دراصل اس زمانے میں ادبی معیار کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ کسی بھی فن پارے کو پرکھنے اور اس کی اہمیت تعیّن کرنے کے لیے زبان پر ہی زور دیا جاتا تھا۔مواد سے کوئی سرکار نہیں ہوتا تھا۔لہذا ناقدین کی زیادہ تر توجہ زبان و بیان پر ہی ہوتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ جب باغ و بہار اور فسانہ عجائب کا تقابل کیا گیا تو فیصلہ ان فنی مطالبوں کو سامنے رکھ کر ہی کیا گیا۔جیسا کہ اطہر پرویز صاحب نے بھی ذکر کیا ہے کہ:

''نئے معیاروں نے زبان کی سلاست اور روزمرہ کی سادگی کو ان سب
پر مقدم سمجھا اور نتیجے کے طور پر اس کسوٹی پر جب کھرے کھوٹے کو پرکھا
گیا تو فسانہ عجائب پوری نہ اتر سکی''[۲]

انہوں نے اردو ناقدین سے شکوہ کیا ہے کہ ''فسانہ عجائب'' کو ایک الگ نگاہ، تعصب کے بغیر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ باغ و بہار اور فسانہ عجائب کا موازنہ کرنے کے بعد اطہر پرویز ان داستانوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ارادی اور غیر ارادی طور پر فسانہ عجائب کا اثر قبول کیا ہے۔اول تو ''سروش سخن'' جو کہ سخن دہلوی نے فسانہ عجائب کے جواب میں لکھی تھی۔اور ''تسخیر جادو'' بھی فسانہ عجائب کے تتبع میں لکھی گئی داستان ہے۔ پرویز صاحب نے مثالوں سے واضح کیا ہے ان داستانوں نے کردار نگاری، اسلوب نگاری میں فسانہ عجائب کا اثر قبول کیا ہے۔اس کے بعد پرویز صاحب نے فسانہ عجائب کے کرداروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔سرور نے داستان کے کرداروں کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے اور ہر کردار کی شخصیت ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں واقعات کی منظر کشی، کرداروں کے ماحول کی تصویر کشی کرنے میں مہارت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ کرداروں کی زبان میں لکھنوی زبان، لہجہ، محاورہ بندی، اور خالص ورزمرہ کی زبان انداز گفتگو اور مزاج کو ملحوظ

---

[۱] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص:۸۷
[۲] فسانہ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز، جدید ترتیب، سیما پرویز، براؤن بک، پبلی کیشنز، نئی دہلی ص:۷۹

خاطر رکھا گیا ہے۔ان تمام پہلوؤں پر پرویز صاحب نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اس کے بعد اصل متن پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ پرویز صاحب نے ۷۷صفحات کا ضمیمہ لکھا ہے جس میں انہوں نے شادی کی رسومات جن کا ذکر سرور نے فسانہ عجائب میں کیا ہے ان کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے کیوں کہ رسم ورواج سے ہی ایک سماج تشکیل پاتا ہے اوران رسموں کا اثر ادب پر پڑتا ہے کیوں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔مزید برآں ان ہنرمندوں اور فنکاروں کے بارے میں پرویز صاحب نے معلومات جمع کی ہیں۔جن کا ذکر مرزا رجب علی بیگ سرؔور نے بیان لکھنو میں کیا ہے ان کے متعلق تمام تر تفصیلات دی گئی ہیں۔کیوں کہ انہوں نے طالب علموں کی ضرورت کے تحت اس کتاب کو تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق ترتیب دیا ہے۔(چوں کہ داستان میں فارسی اور عربی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہوا ہے)اسی لیے کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ پیش کی گئی ہے جس کو بڑی محنت ولگن سے تیار کیا گیا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے فرہنگ میں بھی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مشکل الفاظ کی الگ فرہنگ تیار کی ہے اور عربی آیات وفقروں اور محاوروں اور امثال کی الگ۔اس کتاب کو پڑھنے کے لیے ہمیں کسی دوسری لغت کی ضرورت نہیں ہوگی۔اس کو سمجھنے کے لیے کوئی اور سہارا نہیں لینا پڑے گا۔بڑی ہی آسانی سے ہم فسانہ عجائب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اطہر پرویز صاحب کا یہ کام کسی کار خیر سے کم نہیں بلاشبہ وہ داد کے پوری طرح مستحق ہیں۔

اوران تمام نسخوں کا بھی ذکر کا کیا ہے جوان کی نظر سے گزرے ہیں۔تحقیق میں کوئی فیصلہ حتمی نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ آگے آنے والے محقق اپنی دلیلوں سے کوئی نئی بات پیدا کر سکتے ہیں۔تحقیق کا کام بہت باریک بینی کا ہے۔اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی مثالیں اور دلیلیں لانی پڑتی ہیں تاکہ وہ بات صحیح ثابت ہو سکے جس پر ہم تحقیق کر رہے ہیں۔ڈاکٹر اطہر پرویز صاحب نے بھی ان باتوں خیال رکھا ہے۔

اورحتی امکان قاری کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

اطہر پرویز صاحب نے تحقیق کے جدید اصولوں پر عمل پیرا ہوکر ''فسانہ عجائب'' کا ایک مستند ایڈیشن تیار کیا ہے۔

''فسانہ عجائب'' کی ترتیب وتصحیح میں انہوں نے جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ بلاشبہ قابلِ تعریف ہے،ان کی اس سعی نے ان کے معاصرین میں داستانوں کے مطالعہ،مشاہدہ، تجزیہ اورتنقید کا شوق بیدار کیا۔خاص کر''فسانہ عجائب'' کی طرف جس طرح دوسرے محققین کی توجہ مبزول ہوئی۔اوران کے ایڈیشن کے بعد'فسانہ عجائب'' کے ایک کے بعد دیگر کئی ایڈیشن منظر عام پر آئے۔مثلاً اطہر پرویز کے بعد ۱۹۷۳ءکو ڈاکٹر محمود الٰہی نے فسانہ عجائب مرتب کی۔اورڈاکٹر رفیق حسین نے ۱۹۷۵ء میں بعنوان ''افسانوی اصول اور فسانہ عجائب'' مرتب کی اور ۲۱۲ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ انہوں نے ۱۱۱ صفحات میں افسانوی اصول کی شرح بیان کی ہے اور باقی صفحات میں فسانہ عجائب اور سرور کے متعلق تحقیقی وتنقیدی بحث کی گئی ہے نیز مسعود کی اکثر تحقیقات سے اختلاف کیا ہے۔ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے بھی ۱۹۸۱ء کو فسانہ عجائب کو ترتیب دیا۔اس کے بعد رشید حسن خان نے ۱۹۸۹ء میں فسانہ عجائب کا ایک عمدہ ایڈیشن تیار کیا۔

اطہر پرویز نے فسانہ عجائب کا جو اڈیشن ۱۹۶۹ء میں تیار کیا تھا۔اس میں انہوں نے مندرجہ ذیل باتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کو ترتیب دیا۔

چونکہ طالب علموں کی ضرورت کے تحت اس کتاب کو ترتیب دیا گیا تھالہذا انہوں نے ایک مفصل فرہنگ تیار کی۔ تاکہ فسانہ عجائب کے مشکل الفاظ اور متروکات کو سمجھنے میں سہولت ہوجائے ۔ خاص طور پر طالب علموں کے لئے یہ فرہنگ اور بھی ضروری ہے:

☆ فسانہ عجائب میں بیان لکھنو میں جن ہنرمندوں اور فنکاروں کا ذکر آیا ہے،ان کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھا کردی جائیں تاکہ پڑھنے والے ان لوگوں سے کسی حد تک واقف ہوجائیں ۔جن اشخاص کے نام اس میں آئے ہیں،ان کے حالات تحریر کردیے جائیں۔یہ بات اس لیے زیادہ اہم ہے کہ خود بقول سرورؔ''خانۂ مؤلف اختصار رقم ہے''

☆ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے یہاں لکھنو کے محاورات کا جگہ بہ جگہ استعمال ملتا ہے ان محاوروں کی تشریح کردی جائے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔

☆ انہوں نے جابجا عربی کے فقرے اور آیتیں بھی تحریر کی ہیں،جن کو سمجھنے میں آج کے طالب علم کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ان کو علیحدہ مع ترجمے کے مرتب کردیا جائے۔

☆ فسانہ عجائب میں رسومات لکھنؤ کا ذکر بھی ہے۔ ہر چند یہ رسمیں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ پھر بھی عام قاری کے لیے ان کی تفصیل اور تشریح ضروری معلوم ہوئی۔

☆ فسانہ عجائب کو مصنف نے خود اپنی زندگی میں بار ہا بہ نظر اصلاح دیکھا اور جو فقرہ سست پایا اسے چست کیا اسی لئے ان تمام نسخوں کی مدد سے فسانہ عجائب کا صحیح متن تیار کیا جائے۔

☆ رشید حسن خان نے فسانہ عجائب کا جو ایڈیشن ۱۹۳۸ء تیار کیا۔ اس میں انہوں نے مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب کی تدوین کی ہے۔ گر چہ اطہر پرویز نے اپنے نسخے میں یہ اطلاع دی تھی کہ رشید حسن خان بھی اس کتاب کو تدوین کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

☆ انہوں نے فسانہ عجائب کو منشائے مصنف کے عین مطابق ترتیب دیا ہے۔ چوں کہ فسانہ عجائب کی سرورؔ نے خود کئی بار ترمیم وتصحیح کی ہے۔ لہذا رشید حسن خان نے ان تمام نسخوں میں سے اس نسخے کو تلاش کیا جس پر سب سے آخر میں مصنف نے ترمیم کی ہے اسے ہی بنیادی نسخہ بنایا۔ اور آٹھ نسخوں پر بحث کی ہے۔

☆ رشید صاحب نے فسانہ عجائب میں اعراب و رموز واوقاف، علامات، نشانات وغیرہ کا خاص اہتمام کیا ہے۔ اس کے علاوہ سات ضمیمے لکھے پہلے ضمیمے میں انہوں نے نثر ہائے خاتمہ کتاب کے متعلق تفصیلات دی ہے۔

☆ دوسرے ضمیمے میں تشریحات ہے چوں کہ اس کتاب میں بہت سے ایسے مقامات جن کی تشریح یا وضاحت ضروری تھی۔

☆ تیسرا ضمیمہ انتساب اشعار کا ہے سرورؔ نے اپنے استاد آغا نوازش کے بہت سے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ ان اشعار میں سے جن اشعار کا رشید صاحب کو انتساب کا سراغ مل سکا ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

☆ چوتھے ضمیمہ میں افراد، مقامات، عمارات کے جو نام آئے ہیں اس میں شعراء کے تخلص بھی شامل ہے۔ انہیں ہی کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔

☆ پانچواں ضمیمہ تلفظ اور املا سے متعلق ہے جس میں یہ معلومات دی گئی ہے کہ خاص خاص الفاظ پر جو اعراب لگائے گئے ہیں یا جو املا اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہات اور بنیاد کیا ہے۔

☆ چھٹا ضمیمہ الفاظ اور طریق استعمال پر مشتمل ہے اس میں ایسے لفظوں اور عبارت کے ٹکڑوں کو یک جا کر دیا گیا ہے جو اس عہد کی زبان پر کام کرنے والوں کے مفید مطلب ہو سکتے ہیں۔

☆ ساتویں ضمیمہ اختلاف نسخ کا ہے۔

☆ اس کے بعد فرہنگ ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کو ذہن میں رکھ کر دونوں محققوں نے فسانہ عجائب کو تحقیق کے جدید اصولوں پر عمل پیرا ہو کر تدوین کیا ہے۔ جب اطہر پرویز نے فسانہ عجائب کو مرتب کیا۔ اس وقت تک نیّر مسعود کا تحقیقی مقالہ ''رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامہ'' اور سید ضمیر حسن کی کتاب ''فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ'' منظر عام پر آ چکے تھے۔ اس وقت تک جتنے نسخے سامنے آئے تھے اس کے مطابق انہوں نے کتاب کو مرتب کیا۔ ہاں وہ متن پر زیادہ توجہ صرف نہیں کر سکے اعراب کا زیادہ اہتمام نہیں ہو پایا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اطہر پرویز کا خاص میدان ادب اطفال رہا ہے۔ اور فسانہ عجائب کی تدوین ان کی اس سلسلے کی پہلی کوشش رہی ہے اس کے بعد انہوں ''قصہ حاتم طائی'' اور افسانوی انتخاب کو ترتیب دیا ہے۔ اس کے برعکس رشید حسن خان کا خاص میدان تحقیق و تدوین ہی رہا ہے اور انہوں نے بہت سے کلاسیکی شعری و نثری متون کو مرتب کر کے زندی جاوید کیا ہے اسی لیے انہیں خدائے تدوین کہا جاتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اطہر پرویز نے اس کام کا بیڑا نصابی ضرورت کے تحت اٹھایا۔ جب کہ رشید حسن خان کا شیوہ یہی رہا ہے کہ وہ متن کو منشائے مصنف کے عین مطابق پیش کرنے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے متن میں اعراب و اوقاف کا خاص التزام رکھا ہے۔ جب کہ اطہر پرویز نے بھی پیرا گراف اور اعراب کا تھوڑا بہت التزام کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ رشید حسن خان کا طریقہ کار ہی یہی رہا ہے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ رشید حسن خان کا مرتبہ ایڈیشن اطہر پرویز کے مرتبہ ایڈیشن کے چودہ سال بعد منظر عام پر آیا ہے۔ گرچہ پرویز صاحب نے اپنے ایڈیشن میں یہ اطلاع دے دی تھی کہ: ''دلی میں محترم رشید حسن خان اور ڈاکٹر فضل الحق اور لکھنو میں جناب سید سلیمان صاحب فسانہ عجائب کو مرتب کر رہے ہیں۔'' تب تک فسانہ عجائب کے تین ایڈیشن سامنے آ چکے تھے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کا مرتبہ ۱۹۷۳ء کا ایڈیشن، ڈاکٹر رفیق حسین کا ۱۹۷۵ء اور سید سلیمان کا مرتبہ اڈیشن ۱۹۸۱ء وغیرہ سامنے آ چکے تھے۔ جب کہ اطہر پرویز سے پہلے محمو

الہ آباد کا ایک مرتبہ ایڈیشن ۱۹۲۸ء سامنے آیا تھا۔

ظاہر ہے کہ رشید حسن خان کا ایڈیشن معیار اور قابل قدر ہے۔لیکن اطہر پرویز کے مرتبہ ایڈیشن کو بھی خاصی مقبولیت حاصل رہی ہے۔اور طلباء مستفید ہوتے رہے ہیں تحقیق میں کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہوتا۔اطہر پرویز کے ذریعے اس خطی نسخے کا پتا چلا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے جس میں ''بیان لکھنو'' کا کچھ حصہ زیادہ تھا۔اسے پرویز صاحب نے اپنے نسخے میں شامل کر لیا ہے۔رشید حسن خان کے ذریعے یہ ۱۲۸۰ھ والہ نسخہ سامنے آیا جو کہ پہلے کسی کے علم میں نہیں تھا یہ نسخہ مولا بخش پٹنہ لائبریری میں ملا۔اس نسخے کی خاصیت یہ کہ سرور نے اسے آخر میں نظر ثانی کی ہے۔

الغرض دونوں کے ایڈیشن طلباء کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

قصہ حاتم طائی:

''فسانہ عجائب'' کے علاوہ پرویز صاحب نے ''قصہ حاتم طائی''یعنی'' آرائش محفل'' کو بھی مرتب کیا ہے۔ یہ حیدر بخش حیدری کی کتاب ہے جو انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر آسان اردو میں منتقل کی تھی ۱۸۰۲ء میں اس میں حاتم طائی کے سات سفر کا تذکرہ کیا گیا ہے اسی لیے اسے ''قصہ حاتم طائی'' بھی کہتے ہیں۔اسی مناسبت سے پرویز صاحب نے بھی اس کتاب کو'' قصہ حاتم طائی'' کا ہی نام دیا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں دوسرے مصنف میر شیر علی افسوس نے بھی'' آرائش محفل'' کے نام سے ایک کتاب ترجمہ کی تھی ۔حیدر بخش حیدری کے اباءاجداد نجف سے ہندوستان آئے تھے۔اور دہلی میں مقیم پذیر تھے لیکن جب دہلی کے حالات خراب ہوئے تو حیدری کے والد سید ابوالحسن صاحب تلاش ومعاش کے سلسلے میں لالہ سکھ دیو کے ساتھ بنارس گئے ۔اورحیدری نے بنارس میں ہی اپنی تعلیم مکمل کی ۔ وہاں انہیں نواب ابراہیم خاں خلیل کی شاگردی میں دیا گیا ان کے فیضِ تربیت سے بہت جلد علوم متعارفہ میں مہارت حاصل کی ۔ادبیات کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کا شوق بھی پایا۔حیدر تخلص کرتے تھے۔لیکن شعروشاعری میں انہیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ بنارس میں ہی اپنے والد کے ساتھ مقیم تھے کہ اسی دوران انہیں خبر ملی کہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج میں اردو مترجمین کی ضرورت ہے۔سید حیدر بخش حیدری نے ایک قصہ بعنوان'' قصہ مہر وماہ'' لکھا جو کہ فارسی قصے کا ترجمہ تھا۔اسے گلکرسٹ کی خدمت میں پیش کیا تاکہ انہیں فورٹ ولیم کالج میں ملازمت مل سکے۔

گلکرسٹ کو قصہ بہت پسند آیا اور انہوں نے حیدری کو منشی کے عہدے پر فائز کیا۔وہ بارہ برس تک فورٹ ولیم کالج سے منسلک رہے اس مدت کے درمیان حیدری نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کی ہیں:

۱۔ قصہ مہر وماہ : یہ بھی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۲۔ قصہ لیلیٰ مجنوں : یہ امیر خسرو کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ ہے ۔جس کو خواجہ یٰسین نے بعہد شاہجہاں میں زبان ریختہ میں نظم کیا تھا۔ پھر حیدری نے گلکرسٹ کی فرامائش پر اسے عام اردو بول چال میں ترجمہ کیا۔ یہ نثری قصہ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔

۳۔ ہفت پیکر : یہ فارسی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی کی معروف مثنوی ''ہفت پیکر'' کے جواب میں ۱۸۰۵ء کو تحریر کی گئی ہے۔

۴۔ تاریخ نادری : یہ کتاب فارسی ''تاریخ جہاں کشائے نادری'' کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کے مصنف مرزا محمد مہدی ہیں۔

۵۔ گلزار دانش : یہ کتاب ''بہار دانش'' کا ترجمہ ہے۔ جو کہ شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف ہے۔

۶۔ جامع القوانین : یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں پائے تکمیل کو پہنچی۔ اس پر مصنف کو کالج کی طرف سے انعام ملا تھا۔

۷۔ گلشن ہند : حیدری نے ۱۸۰۰ء میں اردو شعراء کا تذکرہ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد اور مالک رام نے اس تذکرے کو مرتب کیا ہے۔

۸۔ طوطا کہانی : یہ محمد بخش قادری کے مشہور فارسی قصے ''طوطی نامہ'' کا اردو ترجمہ ہے اس کو حیدری نے گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء لکھا اور ۱۸۰۵ء میں منظر عام پر آئی۔

۹۔ گل مغفرت : یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' سے ماخوذ ہے۔ یہ فورٹ ولیم کالج سے باہر سن ۱۸۱۲ء کو لکھی گئی ہے اور اسی سال کلکتے سے شائع ہوئی۔

۱۰۔ گلدستہ حیدری : یہ بہت ضخیم کتاب ہے۔ اس میں بعض کہانیاں، بعض اخلاقی حکایات، بعض نقلیں، بعض انشائیہ اور لطائف ہیں۔ اس کے علاوہ ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''مہر و ماہ'' کا دیباچہ، اور مراثی، غزلیات وقصائد بھی شامل ہیں۔ اس کو عبادت بریلوی نے ''مختصر کہانیاں'' کے عنوان سے سن ۱۹۶۴ء میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر حیدری کو کالج کاونسل کی طرف سے انعام بھی نوازا گیا۔

۱۱۔ آرائش محفل یعنی قصہ حاتم طائی: اس کتاب پر مولف کو جان گلکرسٹ کی فرمائش پر چار سو روپیہ انعام دیا گیا۔

ان میں سے طوطا کہانی'' اور ارائش محفل'' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ آرائش محفل'' حیدری کی طبع زاد نہیں ہے بلکہ ترجمہ ہے۔ حیدری کی انفرادیت اس کے اسلوب میں پوشیدہ ہے۔ اپنے

اسلوب بیان کی وجہ سے مقبول ہے حیدری نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ آزاد ترجمہ کیا ہے۔انہوں نے قصہ پڑھ کر آسان وسلیس زبان میں قلمبند کیا ہے۔ یہ داستان فارسی قصے کا ترجمہ ہے۔لیکن حیدری نے اپنے مزاج کے مطابق قصے میں اضافہ کیا ہے اس میں حاتم طائی کی سات مہموں کو قصے کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کو حیدری نے گلکرسٹ کی فرمائش پر اردو کی عام فہم وسلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔اسلوب بیان کے لحاظ سے متانت وسنجیدگی کے ساتھ ساتھ سادگی اور بے تکلفی کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

پرویز صاحب نے ''قصہ حاتم طائی'' کو ۱۹۷۲ء میں مرتب کر کے شائع کروایا۔انہوں نے کتاب کے شروع میں ایک مختصر وفاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔جو معلومات سے پُر ہے اس میں انہوں نے حیدر بخش حیدری کے آباء اجداد کے اصلی وطن ،اور پھر حیدری کے والد کا تلاش و معاش کے سلسلے میں بنارس میں قیام کرنا ،سید حیدر بخش حیدری کا فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہونا ،سید حیدری کی ابتدائی تعلیم ،وغیرہ تام تر معلومات عطا کی ہے۔اور'' آرائش محفل'' کی ادبی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ان رسموں کا بھی ذکر گیا ہے جو ہندوستانی تہذیب وتمدن کی نمائندگی کرتی ہیں ۔اس کے علاوہ اس زمانے کی مقبول رسموں جو بعد کے زمانے میں اتنی رائج نہیں رہی تھیں ۔انہیں پوری واضاحت کے ساتھ واضح کیا ہے۔اور کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ ،غیر مانوس الفاظ ومحاورات کی فرہنگ تیار کی ہے۔داستان'' آرائش محفل'' کا مختصر تنقیدی وتحقیقی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔اور جن جن کتابوں سے داستان کا متن تیار کیا ہے ان کی فہرست بھی آخیر میں دی ہے۔ پرویز صاحب کو داستان گوئی سے بہت دلچسپی تھی۔اسی لیے داستان'' قصہ حاتم طائی'' کے اگلے سال انہوں پنچ تنتر کی کہانیوں کا عام فہم وسلیس زبان میں ترجمہ پیش کیا۔

الغرض اطہر پرویز صاحب نے'' فسانہ عجائب'' اور قصہ حاتم طائی'' میں جس محنت ومشقت اور عرق ریزی سے جدید تحقیق کے تمام ضروری واحتیاطی تدابیر کو برتا ہے وہ قابل تعریف اور لائق تحسین ہے۔اس طرح انہوں نے تحقیق وتدوین اور تنقید متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں اردو کی دو اہم داستانوں کو مرتب کیا۔اور اردو ادب میں اعلیٰ درجے کے محققوں کی صف میں بحیثیت مدّون اپنے نقش ثابت کیے ہیں۔

اطہر پرویز بحیثیت مرتب:

اطہر پرویز کی شناخت مدون، مترجم، ادیب، کہانی نویس، مدیر ہونے ساتھ ساتھ بحیثیت مرتب بھی کی جاتی ہے۔ انہوں نے بائیس کتابیں ترتیب دی ہیں۔ جن میں سے بعض کا شمار ادب اطفال کے زمرے میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو کے کلاسیکی سرمائے ادب کو بچوں کی ضرورت کے پیش نظر آسان وسہل اور عام فہم زبان میں از سر نو ترتیب دیا ہے۔ اور بچوں کی ضرورت کے تحت اردو کے نامور ادیبوں وشعراء کے سوانحی حالات اور ان کی نظموں، کہانیوں کو منتخب کیا۔ ان کے یہ انتخابات تعلیمی نصاب کی ضرورت کو بھی پُر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ''بچوں کے اقبال'' ''بچوں کے حالی'' ''بچوں کے نظیر'' ''خلا کا سفر'' ''بچوں کی معلومات'' ''اکبر اور بیربل'' وغیرہ قابل ذکر انتخابات ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے اور کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ جن کی حد درجہ پذیرائی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں منٹو، بیدی، کرشن چندر کے افسانوں کے انتخابات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ''اردو کے تیرہ افسانے'' اور'' ہمارے پسندیدہ افسانے'' بھی مرتب کیے ہیں۔ جن میں اس عہد کے نمائندہ افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ انتخابات اردو افسانے کے باب میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ انتخابات کئی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب بھی ہیں۔ جس سے ہم ان کی مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اطہر پرویز جدید فکشن پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے انہوں قصہ وکہانی کے ساتھ اردو افسانے کی نئی سمتوں کے شعور کا احساس دلایا اور اردو کے بہترین افسانوں سے قاری کو متعارف کروایا۔ اور اردو افسانوی ادب سے متعلق کئی اہم کتابیں ترتیب دیں۔ جنھیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس لیے یہ انتخاب مثالی بن گئے ہیں۔ ان کتابوں کے مقدمے میں انہوں نے اردو فکشن کی مشہور ومعروف شخصیات کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اور سعادت حسن منٹو کے نمائندہ افسانوں کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اور ان پر اپنی ناقدانہ صلاحیت وقابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے منتخب افسانوں کے ذریعہ زندگی کے حقائق کی تفہیم میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور ہم زندگی کے نشب و فراز سے بخوبی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ مزید برآں انہوں نے ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' کے عنوان سے پریم

چندر سے لے کر سلام بن رزاق تک بیس عظیم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ’’اردو کے تیرہ افسانے‘‘ کے عنوان سے جو انتخاب ہے۔وہ بھی غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔

اردو کے تیرہ افسانے:

’’اردو کے تیرہ افسانے‘‘اس کتاب کا تعلق اردو کے معروف و مقبول افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں سے ہے۔ جسے اطہر پرویز نے ۱۹۷۶ء میں ترتیب دیا ہے۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے اس انتخاب کو ۱۹۷۶ء کو شائع کیا گیا۔اس کا انتساب انہوں نے اپنے ایک دوست شوکت علی سلطان کے نام کیا ہے جن کا شمار ان کے عزیز رفقاء میں ہوتا تھا۔انہیں اپنے دوستوں سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے اردو کا تیس سالہ انتخاب پیش کیا ہے۔جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے افسانہ نگاروں سے زیادہ افسانوں پر توجہ دی ہے۔جس کی وجہ سے کئی مقبول افسانہ نگار اس فہرست میں شامل نہیں ہو سکے۔انتخاب میں شامل افسانوں کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔	کفن	پریم چند
۲۔	مہالکشمی کا پل	کرشن چندر
۳۔	آنندی	غلام عباس
۴۔	اپنے دوکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی
۵۔	رئیس خانہ	احمد ندیم قاسمی
۶۔	ٹوبہ ٹیک سنگھ	سعادت حسن منٹو
۷۔	چوتھی کا جوڑا	عصمت چغتائی
۸۔	آخری کوشش	حیات اللہ انصاری
۹۔	آپا	ممتاز مفتی
۱۰۔	منزل منزل	اے حمید
۱۱۔	گڈریا	اشفاق احمد

۱۲۔ آخری آدمی انتظار حسین

۱۳۔ نظارہ درمیان ہے قرۃ العین حیدر

اطہر پرویز نے اپنی ناقدانہ بصیرت سے ان افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔اور ۹ صفحات کا پیش لفظ لکھا ہے۔جس میں وہ پہلے پوری افسانوی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔افسانہ کیا ہے؟ اور افسانے سے متعلق رائج غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتے ہیں۔ناول اور افسانے کے فرق پر بھی بحث کرتے ہیں۔اسی گفتگو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''افسانہ نگار کا کمال ہے یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ کا استعمال کرے۔وہ لفظوں سے زیادہ احساسات سے اپنے افسانے کو نمایاں کرے۔عام طور پر لوگ لفظوں کے ذریعہ نہیں سوچتے۔
>
> انسان کے ذہن میں خیالات اور تصورات آتے ہیں اور پھر وہ ان کو لفظوں کا لباس پہناتا ہے۔افسانہ ایک خیالی پیکر کی عملی تشکیل ہے۔اسی لئے یہاں احساسات سے کام لیا جاتا ہے۔یہ بات سننے میں عجیب سی لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ نہیں کہا جاتا، انسانی تجسس اسے تلاش کرتا ہے۔''[۱]

مختصر افسانے میں الفاظ کا انتخاب کس قدر نازک کام ہے اس پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔اور مغربی مفکرین کے حوالے سے اپنی بات کو ثابت کرتے ہیں۔غیر ضروری الفاظ سے احتراز فضا اور ماحول کے مطابق زبان کا استعمال مختصرم افسانے کے لیے ضروری ہے۔زبان کا غیر معمولی استعمال ہی مختصر افسانے کو کامیاب بناتا ہے۔ البتہ مختصر افسانے کے متعلق کافی باریکی سے مطالعہ کیا گیا ہے۔اور ہر چیز کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اطہر پرویز نے افسانے کی تاریخ کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاروں کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اور افسانہ نگاروں کے حوالے سے اس خصوصیت کو بیان کرتے ہیں مثلاً کرشن چندر کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ افسانے کا فن اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ تبلیغ کا

---

[۱] اردو کے تیرہ افسانے، مرتب اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص:۸

بوجھ برداشت نہیں کرسکتا لیکن اگر ہم ''مہالکشمی کا پل'' کے علاوہ بھی
کرشن چندر کے افسانے پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہی تبلیغ کرشن
چندر کے افسانے کے فن کی جان ہے۔روایت کی خوبی یہ ہے کہ راوی
نظر نہ آئے لیکن کرشن چندر کے یہاں راوی محض جھانکتا ہی نہیں بلکہ خود
بھی اچھل کر سامنے آتا ہے۔'' [1]

مزید برآں یہ کہ ہندوستان میں اردو افسانے کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ:

''اردو افسانہ ہندوستان کے بدترین اقتصادی دور کی پیداوار ہے۔
معاشرے میں تیزی سے تبدیلی بھی نہیں ہو رہی تھی ۔ اس لئے اردو
افسانے نے اپنی نظریں خوب اچھی طرح ان مسائل کی طرف گاڑ دیں
اور ان کو اپنا موضوع بنایا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا افسانہ زندگی کی تصویر
ہی نہیں تعبیر بھی ہوگیا۔آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی ، اشتراکیت
کے نعرے فضا میں گونجنے لگے ، اردو افسانہ ہندوستان کی اسی فضا میں
سانس لے رہا تھا۔'' [2]

اطہر پرویز مندرجہ بالا گفتگو کے بعد انتخاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔کہ انہوں نے اردو افسانوں کو عالمی معیاروں کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔اور اس سلسلے میں انہوں نے دقت نظر سے کام لیا ہے۔اسی وجہ سے اس انتخاب میں کچھ اہم افسانہ نگار شامل نہ ہوسکے۔

جن افسانوں کو اطہر پرویز نے اپنے انتخاب میں شامل کیا ہے، وہ اردو ادب کے افسانوی ادب میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔کفن نہ صرف پریم چند کا اہم کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ اردو افسانے میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔کفن سے ہی افسانہ نگاری کی دنیا میں انقلاب رونما ہوتا ہے۔جس کی ترقی یافتہ شکل بعد کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔کرشن چندر کا ''مہالکشمی کا پل'' بھی اردو افسانے کی تاریخ میں اہم کڑی ہے۔کرشن چندر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ماحول ، پس منظر زندگی کی کشمکش کے متعلق کرداروں کو پیش

---

[1] اردو کے تیرہ افسانے ،مرتب اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گھر ،ص:۱۰

[2] اردو کے تیرہ افسانے ،مرتب اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گھر ،ص:۱۳

کرتے ہیں جس سے زندگی سے قربت کا احساس ان کے افسانوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ آنندی غلام عباس کا بہترین افسانہ ہے جہاں بظاہر کوئی خاص کردار نظر نہیں آتا۔ افراد کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو عقائد کے لیے اذیت و کرب سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور کس طرح معاشرتی جبر کے نتیجے انہیں بھگتنے پڑتے ہیں۔ اطہر پرویز اسے مثالی کہانی قرار دیتے ہیں۔

غرض یہ کہ اطہر پرویز کا یہ انتخاب اور مقدمہ مختصر اور مگر جامع ہے مقدمے میں انہوں اردو افسانہ کے اسلوب، ہیئت اور اس کے ارتقائی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ان تیرہ افسانوں میں تمام تر افسانے اردو افسانوی ادب کے بہترین نمائندے ہیں۔ اس انتخاب سے ان افسانوں کو زیادہ آسانی سے عوام تک رسائی کا راستہ میسر ہوا۔ جس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ یہ انتخاب نوجوان نسل کے لیے اہم ہے۔ یہ انتخاب کئی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب بھی ہے۔

ا

ہمارے پسندیدہ افسانے:

''ہمارے پسندیدہ افسانے'' اطہر پرویز کی مرتب کی ہوئی کتاب ہے۔ جو انہوں نے ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۲ء میں ترتیب دی۔ اور یہ کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔ اس کتاب میں بیس افسانوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب ان کی سابقہ مرتب کی گئی کتاب ''اردو کے تیرہ افسانے'' ہی کے سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس انتخاب میں شامل افسانوں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

۱-	اماوس کی رات	پریم چند
۲-	میلہ گھومنی	علی عباس حسینی
۳-	آزمائش	سدرشن
۴-	کنول	اعظم کریوی
۵-	نیا قانون	سعادت حسن منٹو
۶-	کالو بھنگی	کرشن چندر
۷-	سیاہ و سفید	غلام عباس
۸-	کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی
۹-	ہماری گلی	احمد علی
۱۰-	الحمدللہ	احمد ندیم قاسمی
۱۱-	لاجونتی	راجندر سنگھ بیدی
۱۲-	الاؤ	سہیل عظیم آبادی
۱۳-	ننھی کی نانی	عصمت چغتائی
۱۴-	یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے	قرۃ العین حیدر
۱۵-	لو ایک قصہ سنو	اختر انصاری

۱۶-	قانون کی بستی	ش۔ مظفر پوری
۱۷-	ڈائن	شکیلہ اختر
۱۸-	دیمک	غیاث احمد گدی
۱۹-	بجوکا	سریندر پرکاش
۲۰-	کالے ناگ کے پجاری	سلام بن رزاق

مندرجہ بالا انتخاب کے افسانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطہر پرویز نے اس انتخاب کو نہایت باریک بینی اور ناقدانہ بصیرت سے ترتیب دیا ہے۔ کیوں کہ اس انتخاب میں شامل افسانے اردو افسانے کی تاریخ میں بہت اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ اوران افسانوں کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی ہے۔ پریم چند سے لے کر سلام بن رزاق تک کے افسانے شامل کر کے گویا افسانے کے ارتقائی سفر کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ افسانے کے ابتدا سے لے کر آخر تک بدلتے رجحانات کا بھی قاری کو اندازہ ہو سکے۔

اطہر پرویز نے اس انتخاب میں افسانے کے بارے میں ابتدا میں گیارہ صفحات کا پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ جس میں وہ پریم چندر اوران کے معاصرین کے حوالے سے افسانے کے آغاز کے متعلق مدلل گفتگو کرتے ہیں۔ پریم چند ادب کی افادیت مقصدیت کے قائل تھے۔ اس لیے وہ ادب اس کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانے اس دور کے عکاس نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اطہر پرویز رقمطراز ہیں کہ:

> ''شاید ہمارے قارئین بھی اسی مقصدیت کے کی تلاش میں تھے۔ اور وہ افسانے میں شعریت اور فنی رعنائیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ اسی لیے پریم چند کو سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے مقابلے میں زیادہ بڑا قارئین کا حلقہ ملا۔ پریم چند کو جو زمانہ ملا وہ سیاسی ہنگاموں کا تھا۔ قومی آواز کی تحریک بڑے زور شور سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پریم چند نے اسی کے ساتھ اپنی آواز ملائی۔ ہندوستانی مزاج کی ترتیب بھی اسی زمانے میں ہو رہی تھی۔ پریم چند کے افسانوں میں

لوگوں کو اپنے دل کی آواز سنائی دی۔ چنانچہ پریم چند کو مقبول ہونے میں
زیادہ وقت نہیں لگا۔'' ۱؎

اس کے بعد اطہر پرویز اافسانوی ادب میں انگارے نے کیا کارنامہ انجام دیا اس پر بھی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ کہ کس حد تک انگارے کے افسانوں نے بعد تک کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ناقدین کے اقوال سے اپنی بات کو مدلل کرتے ہیں۔ کہ ''انگارے'' کی اشاعت سے کس طرح تکنیک کے تجربوں کا آغاز ہوا۔ اور ان موضوعات کو بھی برتنے کی آزادی ملی جواب تک ادب کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

پریم چند کے بعد کا دور جیسے اردو افسانے کا سنہرا دور کہا جاتا ہے کے بارے میں اطہر پرویز کا خیال ہے کہ جہاں افسانہ اپنے ارتقائی منزل طے کرتا ہے اور افسانے میں نئے نئے تجربات اور موضوعات کو جگہ ملتی ہے۔ اور فسانہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس پر بحیثیت صنف بحث کی جا سکے۔ افسانے میں یا افسانہ نگاروں پر ابتدا میں مغربی مصنفین کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ اور بہت سے افسانہ نگار انہیں کی تقلید میں افسانے لکھتے نظر آتے ہیں۔ نتیجتاً مغرب کے ہی تنقیدی اصول افسانے کو پرکھنے کے لیے استعمال کیے گئے اور ناقدین نے اپنے اصول وضع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس کے علاوہ انہوں نے افسانے کی تکنیک کے حوالے سے بھی بحث کی ہے۔ اسلوب اور ہیئت پر زیادہ زور دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

> ''اگر افسانہ نگار اپنے افسانے کی صحیح تکنیک دریافت کر لیتا ہے تو افسانہ یقیناً کامیاب ہوتا ہے۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' اگر بیانیہ اور قصہ گوئی کے انداز میں لکھا جاتا تو اتنا موثر نہ ہوتا لیکن اس کے فنی اسلوب اور تکنیک نے اس کے تاثر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور ترقی پسند نقادوں نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا ورنہ اس افسانے پر ''عوام دشمن'' خیالات کے پرچار کا الزام لگ سکتا تھا۔'' ۲؎

۱؎ ہمارے پسندیدہ افسانے، مرتبہ، اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص:۵

۲؎ ہمارے پسندیدہ افسانے، مرتبہ، اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص:۱۱/۱۲

الغرض وہ مغرب کے مصنفین سے استفادہ اور جدید افسانے پر ان کے اثرات کی بھی وضاحت سے گفتگو کرتے ہیں کہ کس طرح جدید دور میں بھی مغرب کے مصنفین کے زیر اثر ادب تخلیق کیا جا رہا ہے اور آخر میں ان منتخب افسانوں کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ یہ کس قدر اہم ہیں۔ اور ان کا مطالعہ کتنا ضروری ہے۔

> ''ان تمام افسانوں کے بارے میں، میں اتنا فیصلہ کن تو نہیں ہوسکتا کہ یہ کہوں کہ ان کے بغیر اردو افسانے کا مطالعہ نامکمل ہے۔ لیکن یہ ضروری کہوں گا کہ اردو افسانے کو پڑھنے اور سمجھنے میں ان افسانوں سے ضروری مدد ملے گی۔ آج جدید افسانے میں جو قلمیں لگائی جا رہی ہیں شاید وہ یہیں سے قلم کی گئی ہیں۔ یہ عمل شعوری بھی ہوسکتا ہے اور غیر شعوری بھی۔''[۱]

اور آخر میں افسانے کی آگے کی ترقی وارتقاء کے بارے میں خوش گمان نظر آتے ہیں کہ افسانہ مزید تکنیک اور نئے اسلوب میں سرگرداں ہے۔ اس کے علاوہ اپنے انتخاب سے متعلق بھی امید کرتے ہیں کہ قارئین اسے پسند کریں گے۔ اس انتخاب میں بلاشبہ کئی افسانے ایسے ہیں جن کے بغیر افسانے کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی کیوں کہ مندرجہ بالا افسانوں جو اردو افسانے کی تاریخ میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اور یہ تمام تر افسانے افسانوی دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ انتخاب طلباء کے لیے بہت مفید ہے اور اسی وجہ سے یونیورسٹیوں میں شامل نصاب بھی ہے جس سے اس کی توقیر مزید بڑھ جاتی ہے۔

☆☆☆

۱؎ ہمارے پسندیدہ افسانے، مرتبہ، اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص: ۱۵/۱۴

منٹو کے نمائندہ افسانے:

''منٹو کے نمائندہ افسانے'' یہ کتاب ۲۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کا تعلق منٹو کے افسانوں کے انتخاب سے ہے۔ منٹو کی زندگی ان کے افسانوں کی طرح نہ صرف یہ کہ دلچسپ تھی بلکہ مختصر بھی تھی۔ محض ۴۲ سال ۸ ماہ اور چار دن کی چھوٹی سی زندگی کا بڑا حصہ منٹو نے اپنی شرائط پر نہایت لاپروائی اور لاابالی پن سے گزاری ہے۔ انہوں نے زندگی کو ایک بازی کی طرح کھیلا اور ہار کر بھی جیت گئے۔ غیر اردو داں طبقہ اردو شاعری کو اگر غالب کے حوالہ سے جانتا ہے تو فکشن کے لیے اس کا حوالہ منٹو ہیں۔

سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو لدھیانہ کے قصبہ سمبرالہ کے اک کشمیری گھرانے پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی غلام حسین تھا اور وہ پیشہ سے جج تھے۔ منٹو ان کی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ تقریباً ۲۰ سالہ ادبی زندگی میں منٹو نے ۲۷۰ افسانے، ۱۰۰ سے زیادہ ڈرامے، کتنی ہی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے، اور ڈھیروں نامور اور گمنام شخصیات کے خاکے لکھے۔ ان کے افسانے ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیتے تھے۔ ان پر کئی پر فحش نگاری کے مقدمے بھی چلے اور پاکستان میں ۳ ماہ کی قید اور ۳۰۰ سو روپے جرمانہ بھی ہوا۔ لیکن پھر اسی پاکستان نے ان کے انتقال کے بعد ملک کے سب سے بڑے سیویلین ایوارڈ ''نشان امتیاز'' سے نوازا۔ جن افسانوں پر فحش کے مقدمے چلے ان میں سے بس کوئی ایک بھی منٹو کو زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی تھا۔

اطہر پرویز نے قصہ کہانی کے ساتھ ساتھ اردو افسانہ کو نئی سمتوں کے شعور کا احساس دلایا اور اردو کے بہترین افسانہ نگاروں کے افسانوں کو ترتیب دے کر قارئین کو متعاف کرایا۔ وہ جدید فکشن پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ''منٹو کے نمائندہ افسانے'' ''کرشن چندر کے افسانے'' ''راجندر سنگھ بیدی کے افسانے'' وغیرہ اہم افسانہ نگاروں کے افسانوں کو بہت ہی غور و خوض سے مطالعہ کیا اور اپنی ناقدانہ صلاحیت کا اظہار کیا۔ اس لیے یہ انتخاب مثال بن گیا۔ اور مقبول عام کی سند حاصل کر لی۔

اطہر پرویز نے ''منٹو کے نمائندہ افسانے'' کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب ایجوکشنل بک ہاؤس سے

شائع ہوکر منظر عام پر آئی اور قارئین کی توجہ کا مرکز بنی۔ انہوں نے شروع میں ۲۹ صفحات کا تنقیدی مقدمہ لکھا۔ جس میں انہوں نے اردو افسانہ نگاری میں منٹو کی اہمیت، منٹو کے مزاج، ان کے فن، کردار نگاری، اسلوب بیان اور ان کے افسانوں کو اہمیت، گویا ایک سیر حاصل مقدمے میں ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ تاکہ ان کے افسانوں کو قاری آسانی سے سمجھ سکے۔ انہوں نے نمائندہ افسانوں کو منتخب کیا ہے۔ جن کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔	نیا قانون	۲۔	کالی شلوار
۳۔	ہتک	۴۔	ممّد بھائی
۵۔	بو	۶۔	موذیل
۷۔	ٹھنڈا گوشت	۸۔	بابو گوپی ناتھ
۹۔	کھول دو	۱۰۔	ممی
۱۱۔	ٹوبہ ٹیک سنگھ	۱۲۔	سڑک کے کنارے
۱۳۔	جانکی	۱۴۔	پُھندنے

اردو افسانوی دنیا میں سعادت حسن منٹو کا شمار پہلی صف کے فنکاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ وہ ایک سچے اور بے باک فنکار تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جنس کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ غلاظت کو چھپانے کے بجائے اسے کریدنا اور صاف کرنا چاہیے، بے شک اسے بدبو پھیلتی ہے لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں۔ منٹو کے ساتھ ادبی معاشرے کے وہی سلوک کیا جو غالب کے ساتھ ہوا جس طرح غالب کے زمانے میں لوگوں نے غالب کی اور ان کی شاعری کی قدر نہیں کی ٹھیک اسی طرح اردو فکشن کی معروف شخصیت منٹو کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ ان کے افسانوں کی اور ان کے زمانے نے قدر نہیں کی جب کہ آج اردو افسانوں کے بڑے فنکاروں میں منٹو کا نام سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ دراصل منٹو نے جنس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید کا نشانہ بنے اور ان پر فحشی کا الزام بھی لگا انہوں نے سب سے پہلے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جن موضوعات کے متعلق اس زمانے میں سوچنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اس حوالے اطہر پرویز رقم طراز ہیں کہ:

''منٹو سے ناراضگی کا بڑا سبب یہ رہا ہے کہ اس کے بعض افسانوں کا تعلق
جنسیات سے بھی ہے، اور جنسیات کی حیثیت ہمارے یہاں شجر ممنوعہ کی
رہی ہے۔'' [۱]

اطہر پرویز نے منٹو کے فن پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ جس کے مطالعے سے قاری کو ان کے افسانوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان خیال تھا کہ منٹو کے افسانے سمجھنے کے لیے فن افسانہ نویسی سے واقفیت کے علاوہ منٹو کے اقوال اور ان کی تحریروں سے واقفیت بہت ضروری ہے کیوں کہ ان کی تحریریں ان کے افسانوی فن کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ منٹو نے جس موضوع کو اپنے افسانوں میں پیش کیا بہت ہی خلوص اور ایمانداری سے لکھا۔ ان کے فن کی انفرادیت یہی تھی کہ انھوں نے سماج کے گرے ہوئے کرداروں کے لیے انسانوں کے دل میں محبت پیدا کی۔ انھوں نے منٹو کو ایک معصوم ضدی بچے سے تعبیر کیا ہے اور اسی ضد پن کی وجہ سے منٹو وہی کرتا تھا جس سے اس کو روکا جاتا تھا۔ اس حوالے سے اطہر پرویز رقمطراز ہیں کہ:

''ان کی شخصیت میں بے باکی تھی اور مزاج میں ضد شخصیت کی بے باکی
اور مزاج کی ضد نے ان کے افسانوں میں ایک تلخی اور تیکھا پن پیدا کر دیا
ہے اور یہی منٹو کا فن بن گیا ہے۔'' [۲]

منٹو افسانہ نگار سے زیادہ حقیقت نگار ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ حقائق پر مبنی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے انھوں نے جو دیکھا اسے من و عن اپنے افسانوں میں بیان کر دیا۔ اس میں کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کی۔ جب منٹو کے افسانوی مجموعے ''ٹھنڈا گوشت'' پر مقدمہ چلا تو انھوں نے عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ: ''سوال ہے جو چیز جیسی ہے اسے من و عن کیوں نہ پیش کیا جائے ٹاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے، غلاظت کے ڈھیر کو عُود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے حقیقت سے انحراف کیا ہمیں بہتر انسان بننے میں مدد و معاون ہو سکتا ہے؟'' اور ان کی نگارش کسی عظیم مصور سے کم درجہ نہیں رکھتی اچھوں میں اچھائی تلاش کرنا مشکل کام نہیں ہے بلکہ برے اور سماج کے گرے ہوئے لوگوں میں اچھائی تلاش کرنا مشکل امر ہے۔ لیکن منٹو سماج کی غلاظت سے اس کے باطنی حسن کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے

۱۔ منٹو کے نمائندہ افسانے، مرتب، اطہر پرویز، ایجوکیشنل، بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ، سن اشاعت ۱۹۹۶ء ص: ۸
۲۔ منٹو کے نمائندہ افسانے، مرتب، اطہر پرویز، ایجوکیشنل، بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ سن اشاعت ۱۹۹۶ء ص:

ہیں عصمت چغتائی منٹو کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

''وہ دنیا کی ٹھکرائی گھورے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکلتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اسے شوق ہے کیوں کہ اسے دنیا کے سنوارے والوں پر بھروسہ نہیں'' ۱؎

اطہر پرویز کا ماننا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں کا خمیر براہ راست زندگی سے لیا ہے۔ اور ان کی نمایاں خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے ۔ وہ اپنے افسانوں میں حقیقی رنگ بھرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرتا ہے ۔ اور نہ صرف یہ کرداروں میں جان ڈالنے کے لیے ایسا ماحول پیش کرتا ہے کہ ہمیں وہاں گوشت پوست کے انسان نظر آتے ہیں ۔ بلکہ وہ ان میں اپنے آپ کو شامل کر کے ان کرداروں کو قاری سے اور قریب کر دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے وہ اپنے افسانوں کے کرداروں میں جا بجا خود بھی نظر آتا ہے، لیکن منٹو خود کو بھولتا نہیں ، اور بعض موقعوں پر وہ اپنے آپ کو برا بھلا سنانے سے بھی گریز نہیں کرتا ، وہ اپنے اکثر وبیشتر افسانوں کا لازمی کردار رہا ہے، جو کہ ایک سچے فنکار کی پہچان ہے ۔ اس حوالے سے اطہر پریز لکھتے ہیں کہ:

''میں کی تکلینک کو اتنے فنکارانہ انداز میں کسی اور افسانہ نگار نے نہیں پیش کیا منٹو جب صیغۂ متکلم استعمال کرتا ہے تو کسی سے خطاب نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے آپ کو کرداروں کی صف میں لاکھڑا کر دیتا ہے اور اس طرح اسے کرداروں کو سمجھنے اور اپنے قاری کو سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے۔'' ۲؎

الغرض اطہر پرویز کو اردو افسانہ اور منٹو کے فن پر مکمل دسترس حاصل تھی ۔ اس مجموعے کے مختصر ہونے کا فائدہ پرویز صاحب کی نظر میں یہ ہے کہ منٹو کے قارئین میں اضافہ ہوگا علاوہ ازین جو لوگ سعادت حسن منٹو کی فکر سے متفق نہیں وہ بھی ان کے فن کے گرویدہ ہو جائیں گے۔

☆☆☆

۱؎ منٹو کے نمائندہ افسانے ، مرتب ، اطہر پرویز ، ایجوکیشنل ، بک ہاؤس ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ، سن اشاعت ۱۹۹۶ء ، ص: ۱۲

۲؎ منٹو کے نمائندہ افسانے ، مرتب ، اطہر پرویز ، ایجوکیشنل ، بک ہاؤس ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ، سن اشاعت ۱۹۹۶ء ، ص: ۱۴

راجندر سنگھ بیدی کے نمائندہ افسانے:

اطہر پرویز کے اکثر انتخابات ایجوکیشنل بک ہاؤس نے شائع کیے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ اطہر پرویز نے اسد یار خاں مالک ایجوکیشنل بک ہاؤس کی تحریک سے ہی اردو کے افسانوں کے انتخابات پیش کیے۔ان انتخاب کے اشاعت کے اسباب کیا تھے اس پر اس کتاب کے شروع میں اسد یار خاں لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم اردو کے اہم افسانہ نگاروں کا ایک مختصر مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔ آج افسانے کے قارئین چاہتے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ افسانہ نگاروں کے چیدہ چیدہ افسانے پڑھیں بلکہ ان کی خواہش یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محبوب افسانہ نگاروں کو اور قریب سی دیکھیں اور ان کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ خاص طور پر نوجوان ہمارے پیش نظر ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مطالعے کو اور افادی بنایا جائے ،ان کی کچھ رہنمائی بھی کی جائے اور ایسا مختصر لیکن جامع مطالعہ پیش کیا جائے تا کہ افسانہ نگاروں کی شخصیت اور ان کے فن کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع مل سکے۔اس طرح ان فن کاروں کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔'' [۱]

مذکورہ باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اطہر پرویز نے یہ انتخابات پیش کیے ہیں۔اس ضمن میں ''راجندر سنگھ بیدی کے نمائندہ افسانے'' اور ''کرشن چندر کے نمائندہ افسانے'' شامل ہیں۔ یہ کتابیں طلباء کے لیے مفید اور معلومات سے پُر ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے'' یہ کتاب ۱۹۹۸ء کو ایجوکیشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ کی جانب سے شائع کی گئی۔ یہ کتاب ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔اس کی ابتدا میں اسد یار خاں کی عرض ناشر کے عنوان سے جو گفتگو کرتے کرتے انہوں نے اطہر پرویز کا شکریہ ادا کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

---

[۱] راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے ،مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز ،ایجوکشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ ،سن اشاعت ۱۹۹۸ء ص:۵

''ہمیں خوشی ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں اطہر پرویز صاحب کی خدمات
حاصل ہیں۔ پرویز صاحب نے اردو فکشن کا مطالعہ بڑے غور وفکر سے
کیا ہے۔اور ہمارے قارئین ان کی رایوں پر بھروسہ بھی کرتے ہیں۔
انہوں اب تک جو افسانوی انتخابات پیش کئے ہیں وہ پہلے ہی مقبول ہو
چکے ہیں۔امید ہے کہ یہ نیا انتخابی سلسلہ بھی اسی طرح مقبول ہوگا۔'' [۱]

اس کے بعد اطہر پرویز کا ۸ صفحات پر مشتمل ''پیش لفظ'' ہے۔جس میں انہوں نے بیدی کے فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اس ترتیب کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر ہم بیدی کی شخصیت اور بحیثیت فنکار بخوبی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔جس سے ان کے افسانوں کو سمجھنے میں بھی خواطر خواں مدد ملتی ہے۔

بیدی کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ بیدی اردو افسانہ کے چار ستونوں میں سے ایک ہیں۔ان کا نام اردو کے نامور افسانہ وناول نگاروں میں لیا جاتا ہے۔ بیدی اردو ادب کے سب سے زیادہ جذباتی افسانہ نگار تصور کیے جاتے ہیں۔لیکن ان کی جذباتیت میں گہرائی اور سکون ہے۔ بیدی کا تعلق پنجاب سے تھا اس لیے ان کی کہانیوں میں پنجابی معاشرے کی بے حد خوبصورت جھلک نظر آتی ہے۔ بیدی اردو کے ان افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔جن کے افسانے پنجاب کی تہذیب،کلچر،زبان اور سماجی روایات کی سچی اور حقیقی تصویریں پیش کرنے کے بنا پر ہمارے سماجی مطالعے کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ بیدی اپنے افسانوں میں جس قدر حقیقی اور سچی تصویر پیش کرتے ہیں ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں بیدی کے سماجی مشاہدے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بیدی کے متعلق اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''عصمت نے زندگی کے واقعات کو افسانہ بنایا ہے۔لیکن راجندر سنگھ
بیدی نے ان واقعات میں جو انسان دوستی کے نمونے پیش کئے ہیں ان
میں دردمندی کا اظہار ہے۔یہ واقعات ہماری روح کو چھو لیتے ہیں۔
بیدی المیہ کے افسانہ نگار نہیں ہیں۔لیکن ان کے افسانوں کے خوشگوار
انجام بھی ہماری آنکھوں کو نمناک کر دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ

---

[۱] راجندر سنگھ بیدی اوران کے افسانے،مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز،ایجوکشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،سن اشاعت ۱۹۹۸ء ص:۵

انسان اپنے اوپر نہیں روتا۔اس کا اصل غم دوسروں کا غم ہے۔وہ ماں ،باپ،،بہن، بھائی، بیوی، بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے روتا ہے اور یہی نہیں ان کے لئے بھی روتا ہے جن کا حقیقی زندگی میں کوئی وجود نہیں ہوتا، جو محض ادبیات کی دنیا میں بستے ہیں یا جو سنیما کے پردوں پر دکھائی دیتے ہیں۔گویا یہ انسان کی بنیادی سرشت ہے۔بیدی نے اس راز کو دریافت کرلیا ہے'' [۱]

بیدی نے اپنی کہانیوں میں ہرطرح کے کردار پیش کیے ہیں لیکن عورت کے کردار کو خاص طور پر اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ان کے افسانوں میں نسوانی کردارا کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔انہوں نے اپنی کہانیوں میں عورت کو پاک دامن اور وفا شعار بتایا ہے۔ان کے افسانوں میں ہمیں عورت اکثر وبیشتر ماں یا بیوی کے روپ میں نظر آتی ہے۔بیدی کی کہانیوں کی عورت خاص ہندوستانی روپ میں قارئین کے سامنے آتی ہے۔بیدی کے یہاں عورت کے کردار مرد سے زیادہ توانا اور باوقار نظر آتے ہیں۔ان کے نسوانی کرداروں میں جنسیت کے مقابلے مادرانہ شفقت اور تخلیقات کے جذبے کی کارفرمائی ہے۔انہوں نے شروع سے ہی عورت کو اپنے فن کا محور و مرکز بنانے کی کوشش کی ہے۔اس حوالے سے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

'' مجھے خیال ہوتا ہے۔کہ وہ عورتوں کے افسانہ نگار ہیں۔عورتوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ مرد تو مرد بیشتر خواتین افسانہ نگار بھی ان کو ''سکس سمبل'' سمجھ کر قلم اٹھاتی اور اس سے آگے مشکل سے قدم بڑھاتی ہیں۔لیکن بیدی ان سب سے مختلف ہیں۔بیدی کی عورتیں بنیادی طور پر ماں ہوتی ہیں۔وہ ماں کا دل و دماغ رکھتی ہیں۔وہ چاہے ''کوکھ جلی'' میں گھمنڈی کی ماں ہو یا ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی اندو یا پھر ''گرم کوٹ'' کی شمی یا ''ببل'' کی سیتا۔محبت کا یہ جذبہ ان سب کے یہاں ماورانہ احساس رکھتا ہے۔........منٹو کو بھی میں عورت کا افسانہ نگار خیال کرتا ہوں۔منٹو کے یہاں بھی عورت محبت کا اتھاہ سمندر ہے۔منٹو کے یہاں بھی عورت کا

---

[۱] راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے،مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز،ایجوکشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،سن اشاعت ۱۹۹۸ء ص:۸

سب سے مقدس لمحہ وہی ہوتا ہے جب اس کے اندر ماں کی ماتا جاگتی ہے۔لیکن بیدی کے یہاں ذرا سا فرق ہے۔ بیدی کے یہاں عورت مکمل طور پر ماں ہے۔وہ شاید ہندو دیو مالا سے متاثر ہیں، جہاں عورت ماں کی علامت ہے۔ وہ اپنے شوہر کو بھی اسی پیار سے دیکھتے ہے جس پیار سے اپنے بچے کو دیکھتی ہے۔'' [1]

بیدی کے کردار کی پیش کش میں اس کی گرد و پیش کے ماحول کی صحیح عکاسی ملتی ہے جس سے کردار اپنی زمین میں پیوست نظر آتا ہے۔ بیدی کے افسانوں کی طاقت کا راز بھی اسی میں پنہاں ہے کہ انہوں نے عام آدمی کی زندگی سے اپنا رشتہ استوار کیا۔غریب ہندوستانی عوام کی زندگی کے مشاہدے سے بیدی کے فنکارانہ تخیل نے توانائی پائی۔انہوں نے ایسی ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن کے ذریعے سماجیات اور اخلاقیات کو زندگی کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں کا مطالعہ کر کے انسانیت کا درس ملتا ہے۔اس سلسلے میں اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

''بیدی کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد انسان اور انسانیت کے بارے میں ہمارے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔انسانوں سے ہماری محبت بڑھتی ہے۔چھوٹی چھوٹی لغزشیں زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔اور ان کے ساتھ زندگی ،زندگی نظر آتی ہے۔بیدی کبھی کبھی محض ایک جملے سے ہی ہمارے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔'' [2]

بیدی کی کردار نگاری کے متعلق اطہر پرویز رقم طراز ہیں کہ:

''بیدی منٹو کی طرح کردار تخلیق نہیں کرتے انہیں تو ایسا لگتا ہے کہ بنے بنائے ڈھلے ڈھلائے ،دیکھے دکھائے کردار مل جاتے ہیں اور وہ ان کو لفظوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔اور جو تبدیلی کرتے ہیں وہ فن کارانہ ہوتی ہے۔اس میں ہم ان کی آرزومندی کی جھلک بھی دیکھ سکتے ہیں۔'' [1]

چوں کہ یہ انتخاب ایک مخصوص مقصد کے تحت پیش کیا گیا تھا۔اس لیے اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم

---

[1] راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے ،مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز،ایجوکشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،سن اشاعت ۱۹۹۸ء،ص:۱۳

[2] راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے ،مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز،ایجوکشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،سن اشاعت ۱۹۹۸ء،ص:۱۲

کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں افسانہ نگار کے فن وشخصیت کے حوالے سے اردو کے اہم ناقدین نے جو مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ان کو شامل کیا گیا ہے۔ اس حصے میں پانچ ناقدین اور خود بیدی کا بھی ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ جن کی ترتیب حسب ذیل ہے:

۱۔ افسانوی تجزیہ اور اظہار کے مسائل — از راجندر سنگھ بیدی
۲۔ بیدی کے افسانے ایک تاثر — از آل احمد سرور
۳۔ راجندر سنگھ بیدی۔ بیدرد کردار نگار — از ظ۔ انصاری
۴۔ راجندر سنگھ بیدی۔ بھولا سے ببل تک — از باقر مہدی
۵۔ راجندر سنگھ بیدی۔ ایک افسانہ نگار ایک انسان — از اپندر ناتھ اشک
۶۔ بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں — از گوپی چند نارنگ

دوسرا حصہ بیدی کے منتخب افسانوں پر مشتمل ہے۔ جن کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ گرم کوٹ ۲۔ اپنے دوکھ مجھے دے دو
۲۔ لاجونتی ۳۔ دیوالہ
۴۔ صرف ایک سگریٹ ۵۔ متھن
۶۔ بھولا ۷۔ پان شاپ
۸۔ گرہن ۹۔ بولو
۱۰ بولو ۱۱۔ ایک باپ بکاؤ ہے

خلاصہ کلام یہ کہ اطہر پرویز نے بیدی کے فن پر پیش لفظ میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ علاوہ ازیں اردو کے اہم دانشور بیدی کے فن کے متعلق کیا آراء رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین بھی شامل کیے ہیں تا کہ قارئین اچھی طرح بیدی اور ان کے افسانوں کو سمجھ سکیں۔ اس لحاظ سے راجندر سنگھ بیدی کا یہ انتخاب بلاشبہ قابل قدر ہے۔

☆☆☆

---

[۱] راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتب ڈاکٹر اطہر پرویز، ایجوکشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سن اشاعت ۱۹۹۸ء ص:۹

کرشن چندر اور اُن کے افسانے:

یہ کتاب ۳۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور ۱۹۸۶ء میں ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں کرشن چندر کے منتخب افسانوں اور ان کے متعلق تنقیدی مضامین اطہر پرویز نے ہی جمع کیے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے سابقہ مرتب کی گئی کتاب ''راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے'' کو ترتیب دیا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انہیں اس کا پیش لفظ لکھنے اور شائع کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ اطہر پرویز صاحب اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گے۔ اسی لیے اس انتخاب کا پیش لفظ گوپی چند نارنگ نے تحریر کیا۔ جو چار صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد کرشن چندر کے منتخب دس افسانوں اور ان کے متعلق سات تنقیدی مضامین کو بھی اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے حصہ اول مندرجہ ذیل سات تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔

۱۔	آئینہ خانے میں	از کرشن چندر
۲۔	کہانی کی کہانی	از کرشن چندر
۳۔	کرشن چندر کچھ تاثرات	از سید احتشام حسین
۴۔	اردو ادب میں ایک نئی آواز	از محمد حسن عسکری
۵۔	کرشن چندر کا مطالعہ ذرا قریب سے	از ظ۔ انصاری
۶۔	کرشن چندر اردو افسانہ کا ایک اہم باب	از محمد علی صدیقی
۷۔	کرشن چندر کے افسانے	از وزیر آغا

اور حصہ دوم ان کی دس منتخب افسانوں پر منحصر ہے، جن کی ترتیب حسب ذیل ہے:

۱۔ دو فرلانگ لمبی سڑک

۲۔ کالو بھنگی

۳۔ مہالکشمی کا پل

۴۔ غالیچہ

۵۔ تائی ایسری

۶۔ پورے چاند کی رات

۷۔ بالکونی

۸۔ گرجن کی ایک شام

۹۔ آنگی

۱۰۔ شہزادہ

۱۱۔ دانی

اردو ادب کی خوش قسمتی رہی ہے کہ اس کو اہم افسانہ نگار ملے ہیں۔ان میں پریم چند، منٹو، بیدی اور کرشن چندر کا شمار انہوں نے اردو ادب کو جو کچھ دیا اس کو کوئی سنجیدی قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کرشن چندر ایک سمندر ہیں۔انہوں نے بہت لکھا اور جم کر لکھا اور مختلف اسالیب میں لکھا۔ان کی زبان میں ایسا رس اور جادو ہے جو کسی اور افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔

مجموعی طور پر ہمیں ان کے افسانوں میں رومان اور حقیقت کا ایک دلکش امتزاج باریکی وفراوانی موجودہ سماج اور معاشی نظام قدرت کے دلکش نظاروں کی دلکش منظر کشی غریب عوام سے ہمدردی، انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان کی تخلیقات میں حسن کی لگن اور تڑپ ملتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی حقیقت نگاری ہے۔زندگی کی حقیقت کو جس طرح انہوں نے سمجھا ویسا ہی انہوں نے پیش کیا۔ ان کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ اور موثر انداز بیاں با آسانی مل جاتا ہے۔ جو قدرت کے ذوق جمال کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔اور خود ان کی تحریروں میں تازگی، شگفتگی، دلکشی اور ندرت پیدا کرتی ہے۔ ان کا اسلوب غنائی ہے۔ مذکورہ بالا عناصر مکمل طور پر کرشن چندر کے لازوال افسانوں میں نظر آتے ہیں۔جن کو اس انتخاب میں جمع کیا گیا ہے۔الغرض یہ انتخاب بھی بہت اہمیت کے حامل ہے۔اس سے ہمیں کرشن چندر کو بحیثیت فنکار جاننے اور ان کے فسانوں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

☆☆☆

اطہر پرویز بحیثیت مدیر:

بچوں کے ادب کی ترویج وشاعت اور ترقی میں اخبار ورسائل بھی اہم رول ادا کرتے رہے ہیں۔جو بچوں تک تازہ کار ادب پہنچانے میں معاون ہوتے ہیں۔اردو زبان میں دوسری زبانوں کی بہ نسبت رسائل کی تعداد بہت کم رہی ہے۔کتابت وطباعت کا معیار بھی اطمینان بخش نہیں رہا ہے اور تعداد اشاعت بھی کم رہی ہے۔لیکن پھر بھی گذشت ایک صدی سے ملک کے مختلف مقامات سے بچوں کے رسائل وجرائد شائع ہورہے ہیں۔یہ رسائل وجرائد بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرتے ہیں۔دوسری جانب نصاب کی بھاری بھرکم کتابوں سے جو ذہنی تناؤ ہوتا ہے ایسے رسائل کچھ وقت کے لیے اس سے دور بھی لے جاتے ہیں اور،جس سے بچے ذہنی تازگی محسوس کرتے ہیں۔ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان رسائل کے مطالعے سے ان کے خالی اوقات کا صحیح استعمال ہوجاتا ہے اور وہ بری عادتوں میں نہیں پڑتے۔

رسالہ پیام تعلیم:

جامعیہ ملیہ اسلامیہ ایک ایسی تحریک کا نام ہے۔جس نے تعلیم وتربیت کو زندگی کے لیے ممکنہ حد تک اقدام کیے گئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی زمانے کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو حیران کن مشاہدات سے فہم وادراک کی حدیں روشن ہوتی ہیں۔اس ادارے کے قیام کا مقصد انگریزوں کے ادارے سے نجات حاصل کرنا ہی نہ تھا بلکہ اس کا مقصد طلباء کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ قومی تہذیب اور عام انسانی زندگی کی ہر جہت کی قدر وقیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت واستعداد کے مطابق کسی ایک جہت سے وابستہ ہوکر نہ صرف جائزہ طریقے سے روزی کمائیں بلکہ مجموعی زندگی کے مفاد میں اپنا تن من دھن لگادیں۔اسی سوچ نے تہذیبی وثقافتی اور ادبی وتنقیدی نیز دیگر پروگراموں کو پروجیکٹ کی شکل بخشی۔جامعہ میں چھاپا خانے کا انتظام ہوگیا تو اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر شعبۂ تصنیف وتالیف کی نگرانی میں پیام تعلیم کا اجراء ہوا،جس پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدالغفار مدھولی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اپریل ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی نگرانی میں پندرہ روزہ پرچہ جاری ہوا، اس میں پڑھنے پڑھانے کی تفصیل، چندوں کی تفصیل، جامعہ کے حالات شائع ہونے لگے۔ اگرچہ شروع میں اس کے صفحات کم تھے، لیکن بعد میں اضافہ ہوا اور بچوں کے لیے ہر قسم کے مفید و دلچسپ، مضامین شائع ہونے لگے'' [۱]

اس اقتباس میں پیام تعلیم کی اشاعت کے حوالے سے کئی اہم باتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ''پیام تعلیم'' کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ سید عابد حسین ''شعبہ تصنیف و تالیف'' کے ناظم تھے، بعد میں ''شعبہ تصنیف و تالیف'' اردو اکادمی سے بھی موسوم ہوا۔ شروع میں یہ پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ کی شکل میں جاری ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ ماہ نامہ بن گیا۔ شروع میں پیام تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے چندہ جمع کیا جاتا تھا چوں کہ جامعہ خود محدود ذرائع آمدنی پر چل رہی تھی۔ اس کے علاوہ عابد حسین نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ایسی تجویز نکالی جس پر عمل کرنے سے لوگوں کو بھی فائدہ ہوا اور رسالہ پیام تعلیم کو بھی۔ اعلان یہ ہوا کہ جو شخص سال بھر میں چوبیس روپے دے، اسے ہر تیسرے مہینے اس کی پسند کی نئی نئی کتابیں دی جائیں گی، رسالہ جامعہ مفت ملے گا اور پیام تعلیم میں رعایت ہوگی ان کاوشوں کی بدولت ہی پیام تعلیم کی طباعت و اشاعت کا کام احسن طریقے سے ہونے لگا۔ یہ رسالہ کئی بار بند ہوا لیکن ہر بار کچھ وقفہ کے بعد اسے پھر سے جاری کیا گیا۔ پہلی بار ۱۹۴۷ء کے فسادات کی وجہ سے بند ہوا۔ جب دھیرے دھیرے حالات بہتر ہوئے تو ۱۹۴۹ء میں اس کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی۔ اور ۱۹۵۶ء میں اس کی اشاعت پھر سے بند ہوگی جولائی ۱۹۶۴ء میں اس کی اشاعت پھر سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد آج تک تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

''پیام تعلیم''، میں گرچہ شروع سے ہی بچوں کے لیے کہانیاں اور مضامین ضرور چھپتے تھے لیکن اسے مکمل

---

[۱] جامعہ کی کہانی، مدہولی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص: ۸۱/۸۰

طور پر بچوں کا رسالہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں یعنی اپنے اجراء کے ۶ سال بعد تک ''پیام تعلیم''، مکمل طور پر بچوں کا رسالہ بن گیا۔ اور ایسے مضامین چھپنے لگے جن سے بچے اسلامی تعلیمات سے آشنائی کے ساتھ سائنسی، علمی وادبی مضامین اس کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔ جس کے مطالعے سے بچوں کو ہندوستان کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کی تہذیب وثقافت کے متعلق بھی جانکاری حاصل ہوسکیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں اور خوبصورت نظمیں بدستور شائع ہوتی رہیں ہیں۔ مزید یہ کہ بچوں میں تعمیری ذہن اور تخلیقی رو رجحان پیدا کرنے کے لیے اور بچوں کی شخصیت کی تعمیر کے غرض سے رسالہ ''پیام تعلیم'' میں ''بچوں کی کوششیں'' کے تحت ان کے قلم سے نکلی ہوئی نگارشات شائع کی جاتیں تھیں۔ اور بالآخر رسالہ پیام تعلیم نے بچوں کی تعلیم وتربیت اور ان کی ذہنی وفکری آبیاری کو اپنا نصب العین بنا کر ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اور رسالہ لکھونا کی طرح ''پیام تعلیم'' نے بھی ادب اطفال کی ترویج کے میدان میں اپنی انفرادی شناخت قائم کی۔

''پیام تعلیم''، کو مشاہیر قلم کاروں کا تعاون حاصل تھا۔ اس کے سرورق پر ایک بہت ہی معنی خیز عبارت ہوا کرتی تھی۔ کہ'' جاگو اور جگاؤ'' اس رسالے نے بہت سے اہم تجربے کیے۔ اس کا اندازہ اس کی فہرست سے ہوتا ہے کہ اس نے ہر عمر کے بچوں کے ذوق اور ذہن کا خیال رکھتے ہوئے۔ اس کے ایک گوشے میں بچوں کے لیے مضامین ہوتے تھے اور دوسرے گوشے میں بڑے لڑکوں کے لیے اور تیسرے گوشے میں لڑکیوں کے لیے۔ دھیرے دھیرے اس میں تبدیلی لائی گئی بڑوں کے لیے مضامین کم اور بچوں کے لیے زیادہ تعداد میں تحریریں شائع ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ پورے رسالہ پر بچوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس رسالے میں موضوعات کی سطح پر بھی تنوع کا خیال رکھا جاتا تھا۔ معلوماتی اور مفید فیچرس کی وجہ سے اس کی بہت زیادہ مقبولیت تھی۔ کشیدہ کاری، باغبانی، فوٹوگرافی اور دیگر دلچسپ موضوعات پر مضامین کی اشاعت ہوتی تھی اور اداریے میں بطور خاص بچوں سے تخاطب ہوتا تھا۔ ان کے مسائل اور مشکلات پر گفتگو ہوتی تھی۔ اس لیے یہ رسالہ

بچوں میں بہت مقبول تھا۔ ''پیام تعلیم'' میں شائع شدہ بہت سی کہانیاں کو یکجا کر کے بچوں کے لیے کتابی شکل میں چھاپی گئیں، جیسے رقیہ ریحانہ کی کہانی، دھوئیں کی پھانسی، شیخ نیازی، آؤ ڈرامہ کریں، دنیا کے بچے یہ سبھی کتابیں پیام تعلیم ہی کی دین ہیں۔

ذاکر حسین کے رفقاء اور جامعہ کے اساتذہ نے اپنے عملی اقدامات سے رسالے کو بہت کم عرصے میں چار چاند لگا دیے۔ ذاکر حسین تو بعض سالناموں کے لیے تین تین چار چار مضامین تیار کرتے تھے۔ جامعہ اور مکتبہ جامعہ کا تعلق بہت گہرا ہے، جس کی وجہ سے پیام تعلیم کی رسائی نامور ادیبوں تک ہوگئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد علی جوہر اور مختار انصاری، مولانا اسلم جیراجپوری، سعید انصاری، شفیق الرحمان قدوائی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، برج نرائن چکبست، سید محمد ٹونکوی، سالک لکھنوی، عبدالماجد دریابادی، پروفیسر مسعود حسین خان، کنہیال لال کپور، غلام ربانی تاباں، منشی پریم چند، ڈاکٹر امیر حسن، پروفیسر رشید احمد صدیقی، صاحبزادہ سعید الظفر، پروفیسر سید عطاء اللہ، پروفیسر آل احمد سرور، حفیظ جالندھری، شفیع الدین نیّر، محمدی صدیقی، عبد الواحد سندھی، عبدالغفار مدھولی، اظہر افسر، آصفہ مجیب، محمود علی خاں، سید ابوشیم ہاشمی، فریدی آبادی، چمن لال جرنلسٹ، خواجہ شفیع دہلوی، آفتاب حسن بی اے، کیف احمد صدیقی، سعادت نظیر، غلام حیدر، نظر برنی، احسان الحق، مجاہد حسین زیدی، خلیق انجم اشرفی، علقمہ شبلی، یوسف ناظم اطہر پرویز اور بہت سے نامور ادیبوں کی تخلیقات ''پیام تعلیم'' میں شائع ہوتی رہیں ہیں۔

رسالہ ''پیام تعلیم'' کو بہت سے کامیاب و معروف ادیبوں کی ادارت نصیب ہوئی۔ اس رسالے کے مدیران گرامی میں ڈاکٹر عابد حسین خاں، غلام ربانی تاباں، اطہر پرویز اور حامد علی خاں، محمد حسین حسان ندوی، ولی شاہجہاں پوری، شاہد علی خاں، ہمایوں ظفر زیدی اور محمد محفوظ عالم، اس کے بعد پروفیسر محمد میاں، خالد محمود اور موجودہ دور میں عمران عندلیب کی سرپرستی میں پیام تعلیم اسی شان و شوکت سے نکل رہا ہے۔ یہاں ''پیام تعلیم'' کے مدیران کے عہد میں سے اطہر پرویز اور حامد علی خاں کے عہد کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

اطہر پرویز نے بھی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک اس رسالے کی ادارت سنبھالی ہے۔انہوں نے اردو ادب کی اکثر و بیشتر اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔اور وہ ہر میدان میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جہاں وہ محقق و مدون ،ناقد ،ادیب ،کہانی نویس ،ترجمہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں وہیں انہوں نے بحیثیت مدیر بھی اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔انہوں نے جامعہ میں بچوں کے مشہور رسالے ''پیام تعلیم'' اور علی گڑھ میں معروف رسالے ''الفاظ'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں جب اطہر پرویز جامعہ میں بحیثیت مدرس گئے تو اس وقت حامد علی خان جامعہ کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔انہوں نے اطہر پرویز کی ادارت میں پیام تعلیم کا دوبارہ اجرا کیا اور وہ ایڈیٹر اور منیجر دونوں کے عہد پر فائز رہے گویا طویل عرصے تک انہوں نے اس رسالے کی ادارت کی اور بڑی ہی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور باقاعدگی سے اپنے رسالے کے لیے کہانیاں ،علمی،ادبی،اخلاقی اور معلوماتی مضامین لکھتے رہے جنہیں لوگ شوق سے پڑھا کرتے تھے انہوں نے ''پیام تعلیم'' کو معیاری بنانے اور سنوارنے کے ساتھ بچوں کے ادب کی ترقی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔انہوں نے خود بھی بچوں کے لیے لکھا اور دوسرے ادیبوں کو بھی ''پیام تعلیم'' کے لیے لکھنے پر آمادہ کیا۔ان کا مطمع نظر یہ تھا کہ ''پیام تعلیم'' میں بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلیس سادہ اور عام فہم طرز بیان میں دلچسپ ،فرحت بخش اور شگفتگی سے لبریز کہانیاں و مضامین اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کی جائیں بچے بے اختیار انہیں پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور ان میں کم سنی ہی سے مطالعے کی عادت پختہ ہو جائے تاکہ مستقبل میں درس و تدریس اور معلوماتی کتب پڑھنے کے لیے اپنے ذہن کو بہ آسانی ہموار کر سکیں۔

اس میں ۴۶ صفحات ہوتے تھے ۔اس وقت ''پیام تعلیم'' کے مشمولات میں کہانی ،نظم ،معلوماتی کہانیاں اس کے بعد بچوں کی کوششیں ،ذرا بتائے تو ،آدھی ملاقات ،لطیفے ،معمے اور اس کے علاوہ گلیڈن میسی کے کارٹون بھی شائع ہوتے تھے۔''پیام تعلیم'' میں اس وقت لکھنے والے ادیبوں میں شفیع الدین نیّر ،محمد حسن

مسلم ضیائی، ذاکر حسین، الیاس مجیبی ہاجرہ بیگم، سیدہ فرحت، محمد امین، دیوندر ستیارتھی، حفیظ جالندھری، صالح عابد حسین سید منیر الحسن اور خود اطہر پرویز اور حامد علی خان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں کی تخلیقات پابندی سے پیام تعلم میں شائع ہوتی رہیں ہیں۔

اطہر پرویز بچوں کے فطری ونفسیاتی تقاضوں سے واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے جو بھی کہانیاں اور مضامین لکھے وہ بچوں کی ذہنی وفکری سطح اوران کے معیار پر پورے اترتے ہیں انہوں نے شروع سے ہی نوع بہ نوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی تحریروں اور کہانیوں میں دنیا کو بچوں کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور چیزوں کو بھی ان کے ہی زاویے سے سمجھنا چاہتے تھے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ جدید دور کے تقاضے کے مطابق بچوں میں سائنسی ومعلوماتی افکار واذہان کی نشو ونما پیدا کرنا چاہتے تھے چوں کہ بچے جب اپنے گردونواح کے منظر نامے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو اکثر یہ سوال کرتے ہیں یہ کیا؟ کیسے؟ اور کیوں ہوسکتا ہے بچوں کے ان انجان اذہان اور بالخصوص ان کے سوالوں کا صحیح جوابات اخذ کرنے کے حوالے سے اپنی تخلیقات کے زریعے معلومات کا بہترین مواد پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جہاں ''پیام تعلیم'' کے لیے اہم کہانیاں لکھی وہیں انہوں نے اخلاقی، ادبی، سائنسی اور معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں جو پیام تعلیم کے مختلف شماروں میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہے ہیں مثلاً ''انڈونیشیا کی کچھ رسمیں'' جولائی ۱۹۵۱ء ''ہنگری کے بچے'' اگست ۱۹۵۲ء ''ہندوستانی ریلوں کی کہانی'' جون ۱۹۵۳ء ''کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو'' جولائی ۱۹۵۳ء ''تبّت کے رسم ورواج'' مارچ ۱۹۵۱ء ''اقوام متحدہ'' نومبر ۱۹۵۴ء ''ننّھے منے پودے'' جون ۱۹۵۵ء ''کابل' نومبر ۱۹۵۳ء ''فاہیان کا سفر' اپریل ۱۹۵۴ء ''چائے'' مئی ۱۹۵۴ء مندرجہ بالا مضامین مفید معلومات کا بہترین خزانہ ہیں۔ ان عنوانات سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بچوں کے ذہنوں کی اپنی تحریر سے کس طرح افزائش کررہے تھے۔

مضامین کے علاوہ ان کی بعض مشہور کہانیاں بھی ''پیام تعلیم'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوتی رہی

ہیں۔اسی لیے ان کی کہانیاں اور باقی تخلیقات چاہے طبع زاد ہوں یا ماخوذ وہ بچوں کی نفسیات دماغی قوّہ اور ذہنی استعداد کے عین مطابق رقم کی گئی ہیں۔مندرجہ ذیل کہانیاں ''پیام تعلیم'' میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔ ''ہمدردی'' فروری ۱۹۱۵ء ''خوبوں کی حقیقت'' ستمبر ۱۹۵۲ء ''مرغی چور'' جنوری ۱۹۵۲ء ''ایک تھے نجومی'' جنوری ۱۹۵۲ء ''جیسے کو تیسا'' جنوری ۱۹۵۲ء ''ایماندار لکڑہارا'' اپریل ۱۹۵۲ء ''خالہ بلی'' ستمبر ۱۹۵۲ء ''دو دوست'' اکتوبر ۱۹۵۲ء ''بھید کی بات' جنوری ۱۹۵۲ء ''نیکی اور سچائی'' اپریل ۱۹۵۳ء ''کیا خوب آدمی تھے شیخ چلی'' جون ۱۹۵۳ء ''چالاک شہزادہ'' ستمبر ۱۹۵۳ء ''چینی تھیٹر'' سالنامہ ۱۹۵۶ء مذکورہ کہانیاں مختلف موضوعات پر اطہر پرویز کی قابل ذکر طبع زاد شاہکار ہیں۔

اطہر پرویز کی ادرات میں اکتوبر ونومبر میں ''کشمیر نمبر'' شائع ہوا۔جس کی حد درجہ پذیرائی ہوئی۔اس کے مشمولات میں کشمیر پر ایک جغرافیائی نظر از محمد امین، کشمیر کی صنعت وحرفت از حامد علی خاں، کشمیری بچے از صالحہ عابد حسین، چلتا پھرتا شہر از قیصر نقوی، کشمیر کی قدرتی دولت از پرتھوی ناتھ، کشمیر کے کھانے، کشمیری کھیت، کشمیر کی ایک جھلک وغیرہ کافی دلچسپ اور معلوماتی مضامین ہیں۔اس پرچے کی قیمت ۶ آنے تھی۔

اس کے بعد محمد حسین خاں ندوی کی ادارت میں پیام تعلیم شائع ہوا۔ان کے دور میں بھی پیام تعلیم کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔اس وقت رسالے کے مشمولات میں نظمیں، کہانیاں، معلوماتی، مضامین، لطیفے، بڑوں کی کوششیں، ادھر ادھر اور گلیڈن میسی کے کارٹون اور رنگ بھریے وغیرہ ہوتے تھے۔ان کے بعد شاہجہاں پوری، شاہد علی خاں، پروفیسر محمد میاں، خالد محمود، عمران عندلیب اور موجودہ مینجنگ ڈائریکٹر شہزاد انجم کی سرپرستی میں اسی شان وشوکت سے نکل رہا ہے۔ابھی چند مہینوں سے بند ہے چوں کہ کووڈ نائینٹن کی امراضی وباء کی وجہ سے ابھی چند مہینوں سے بند ہے۔امید ہے کہ حالات بحال ہونے کے ساتھ ''پیام تعلیم'' دوبارہ اپنا سفر اسی شان سے شروع کرے گا۔

الغرض ''پیام تعلیم'' کی اشاعت کا سفر باوجود کوٹون کے بہت اچھا رہا۔اور اس کے فنکاروں میں اردو

ادب کے مشہور ومقبول شعراء وادباء شامل رہے ہیں۔ بچوں کے لیے تعلیمی اور تفریحی ہر اعتبار سے یہ رسالہ کامیاب رہا ہے۔آج بھی یہ رسالہ دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اور اپنے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے پابندی سے شائع ہورہا ہے۔اورنئی نسل کی بہترین تربیت کررہا ہے۔

رسالہ الفاظ:

اطہر پرویز نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پانچ سال پیام تعلیم کی ادارت کرنے کے بعد اور جامعہ میں درس وتدریس کے فرائض سے استعفٰی دے کر ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ آ گئے تھے۔اور یہاں آ کر شروع میں انجمن ترقی اردو میں کچھ عرصے تک ملازمت کی۔ پھر کچھ سالوں کے بعد شعبہ اردو علی گڑھ میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ اور ساتھ ہی اردو کے مشہور دو ماہی رسالہ ''الفاظ'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ رسالہ ۱۹۷۶ء میں ابوکلام قاسمی نے شروع کیا تھا۔اوراطہر پرویز سے پہلے قاسمی صاحب ہی اس رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ بعد میں سن ۱۹۸۲ء میں پرویز صاحب نے اس رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔اور تاحیات اس کی ادارت کے فرائض نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔اس حوالے سے صدیقہ سیوہاری پرویز صاحب کی اہلیہ جو کہ مشہور افسانہ نگار خاتون تھی۔ لکھتی ہیں کہ:

> ''پھر تم علی گڑھ واپس آ گئے اور ذاکر حسین ماڈل اسکول کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو گئے۔اور''الفاظ'' کے ایڈیٹر بھی ہو گئے۔تم نے ''الفاظ'' کے لیے بہت محنت کی اور یہ ایک بہت اچھا رسالہ بن گیا جس میں ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے ادیبوں کے مضامین چھپنے لگے۔'' [۱]

الغرض اطہر پرویز نے بحیثیت ادیب، مدوّن، مرتب اور مدیر کے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

---

[۱] علی گڑھ میگزین، مشمولہ مضمون، آخری خط، از صدیقہ سیوہاری، ص: ۱۳۹

باب ششم

اطہر پرویز کی تخلیقی وتاثراتی تحریریں

☆ صنف ''یادیں'' کی تعریف

☆ اردو ادب میں اب تک لکھی گئی صنف ''یادیں'' پر مبنی کتابوں کا اجمالی جائزہ

☆ اطہر پرویز کی تحریریں ''یادیں'' کا فنی وتحقیقی جائزہ

اردو کی نثری اصناف میں کافی وسعت پائی جاتی ہے۔ غیر افسانوی نثر میں متعدد اصناف ہیں ان میں سے سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح بھی ہیں۔ جنہوں نے مختلف زبانوں میں وقت کے ساتھ تاریخ سے الگ اپنی شناخت قائم کی۔ ابتدائی عہد میں یہ سب تاریخ کا جز تھیں۔ لوگوں میں ہمیشہ سے مشہور و معروف شخصیات مثلاً سیاست داں، ادباء وشعراء، مصلح قوم وغیرہ کی زندگی کو جاننے کی خواہش رہی ہے۔ اسی کے تحت ان اصناف کا ظہور ہوا۔ کسی بھی شخص کی سوانح عمری لکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے حالات یا آپ بیتی خود لکھے اسے خونوشت کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی خاص شخص کی حالاتِ زندگی کو کوئی دوسرا شخص لکھے تو اسے سوانح نگاری کہتے ہیں۔ اسی لیے انگریزی ادب میں خودنوشت کو First Hand Experience. کہا جاتا ہے۔ اور سوانح نگاری کو second hand Experience کہا جاتا ہے۔

اردو میں بھی بہت ہی عمدہ سوانح عمریاں اور خودنوشتیں لکھی گئیں ہیں۔ جیسا کہ حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب از حالی اس کے علاوہ المامون، سیرۃ النبی، یادگار حالی وغیرہ قابل ذکر سوانح عمریاں ہیں۔ اور ذکر میر، اس آباد خرابے میں، خواب باقی ہیں، ورودِ مسعود، شاد کی کہانی شاد کی زبانی، تلاش حق اور پرواز اہم خودنوشتیں ہیں۔

سوانح عمری ہو یا خودنوشت دونوں کا تعلق شخص سے ہے۔ اسی طرح ''یادیں'' کا تعلق بھی شخص ہی سے ہے۔ یادوں میں مصنف اپنی زندگی کے تجربات لکھتا ہے جس میں وہ کسی خاص مقام، جگہ، یا دوسرے اشخاص کا ذکر کرتا ہے۔ ''یادیں'' ایک جدید ترین صنف ہے جسے انگریزی ادب میں وسط بیسویں صدی سے صنفی مقام حاصل ہے۔ لیکن اردو ادب میں اب تک یادوں کو بحیثیت صنف کوئی مقام حاصل نہیں ہوا جب کہ اردو ادب میں اب تک بہت سی تحریریں ایسی لکھی گئیں ہیں جن کو ''یادیں'' میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

''یادیں'' (memoir) کے تعلق سے بہت سی تحریریں وجود میں آ چکی ہیں۔ یہ تحریریں جو کسی شخص کسی مقام کسی ادارے یا کسی ورثے سے متعلق یادوں پر مبنی ہیں۔ اس کے نقوش مختلف افراد کے مطبوعہ خطوط میں بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں اور مضامین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہیں جن کو ''یادیں'' کے بطور پڑھا جا سکتا ہے۔ ان

کے علاوہ یادوں پر مبنی کتابوں کا سلسلہ ساتویں آٹھویں دہائی میں نظر آتا ہے اس ضمن میں کئی کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ''یادوں کی برات'' جوش ملیح آبادی کی'' آواز دوست اور حرف شوق'' مختار مسعود کی ''جواب دوست''،نسیم انصاری کی ''یادوں کے چراغ'' ڈاکٹر سلامت اللہ کی ''یادوں کے سائے'' قیصر جہاں کی اور ان مصنفین میں سے ایک اطہر پرویز بھی تھے۔جنہوں نے ۱۹۷۷ء میں ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' کی اشاعت کی اور ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' کے نام سے ان کی یہ کتاب ان کی صاحبزادی نے ان کی وفات کے برسوں بعد ۲۰۱۷ء میں شائع کی ہے۔قبل اس کے کہ ان دونوں کتابوں کا فنی جائزہ لیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے اس قسم کی دیگر کتابیں اور تحریریں جن میں یادوں کا عنصر شامل ہے۔ان کتابوں اور تحریروں کے جائزے سے یہ متعین کرنے کی کوشش کی جائے کہ اردو میں ''یادیں'' یا یادنگاری کی صورتحال کیا ہے اور کون کون سے نقوش ہیں جو ان تحریروں کو سوانحی مضمون، وفیات یا آپ بیتی سے الگ کرتے ہیں۔

یادیں کی تعریف:

''یادیں'' کسی شخص کی زندگی کا وہ حصہ جو حقائق پر مبنی ہو۔جس کو انگریزی ادب میں Memoir کہتے ہیں۔ جو فرانسیسی لفظ Memoire سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے یاد دلانا یا یاد آنا۔اس صنف میں مصنف اپنی یادوں کے متعلق لکھتا ہے۔ یہ ادبی تکنیک کسی کی زندگی کے تجربات پر منحصر ہوتی ہے۔اس میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات و تجربے کا اس طرح بیان کرتا ہے۔ کہ دوسرے اشخاص ،مخصوص مقام اور مخصوص واقعات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ان مشہور شخصیات کی زندگی کے بارے میں قارئین کو جاننے کا شوق ہوتا ہے۔اور یادوں کے ذریعے ہم انسان کی زندگی سے بخوبی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ یادیں عام طور پر مصنف کی زندگی کے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔لیکن بعض صورتوں میں وہ پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔

یہاں چند انگریزی و اردو ادب کے ادیبوں کی صنف ''یادیں'' کے متعلق رائے کو پیش کر کے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اس کے ذریعہ بطور صنف ''یادیں'' کے نقوش واضح ہوسکیں اور اس کی شعریات مرتب ہوجائے۔

انگریزی ادب میں نتالیہ ریچل سنگر نے ''یادیں'' کی تعریف کرتے ہوئے اس صنف سے اس طرح متعارف کروایا ہے:

Natalia Rachel Singer has introduced

thenotionof the hybrid memoir "in wich a writer persents a life through a lens that reflects both inward and outward.....The best memoirists allow their life experiences to shed light on a culture,a historical moment,a time,a place,a social problem,apoltical issue that remains timely.Four such memoirists / essayists are George Orwell, James Baldwin, Susan Griffin, and Ali x Kates Shulman" from singer's contribution to "The Short List the most influential Books" chronicle of higher Education, 10/ 22/ 04/. ؎۱

اور اردو میں گیان چند جین بھی اس صنف کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ:

''(یاداشتیں) یہ آپ بیتی کی ایک قسم کہی جاسکتی ہے اس میں اپنی زندگی کے واقعات اور تجربے اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ دوسرے کئی اشخاص کے بارے میں دلچسپ شخصی معلومات سامنے آجاتی ہیں۔ان کی شخصیت کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ یہ آپ بیتی سے پرے ہے کیوں کہ اوّل تو اس میں تاریخی تسلسل نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ دوسروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ یاداشت کا مصنف ایک انشائیہ نگار ہوتا ہے۔اس کا قلم آزاد ہوتا ہے جہاں سے چاہے، جو چاہے بیان کردے۔ ان بیانات میں تخلیقی ادب کی شان ہوتی ہے کیوں کہ یہ افسانوی انداز سے شرح کیے جاتے ہیں۔ ادھر یادوں کی بارات ،یادوں کے چراغ ،یادوں کے سائے قسم کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ یاداشتیں ہی ہیں۔'' ؎۲

گیان چند جین نے یاداشت کا لفظ استعمال کیا ہے۔لیکن موجودہ دور میں (memoir) کے لیے ''یادیں'' کا لفظ ہی مستعمل ہے۔اسی مناسبت سے اسی لفظ ''یادیں'' کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔

؎۱ https://www.ocf.berkeley.edu/~jfkihlstrom/memoir.htm

؎۲ ادبی اصناف، گیان چند جین، گجرات اُردو اکاڈمی (حکومت گجرات) گاندھی نگر،ص:۱۳۹

ڈاکٹر خالد حیدر نے ''چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ''یادیں'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ:

''یادیں'' ایک صنف کے طور پر دراصل مصنف کی ان تحریروں کا مجموعہ ہوتی ہیں جو کسی فرد، کسی واقعہ یا تقریب جو عمومی یا ذاتی ہوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ جو اس کی زندگی میں ایک مقام رکھتے ہیں جس سے ان کی حقیقت اور خود صاحب تحریر کی حقیقت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔'' [۱]

انگریزی ادب میں ''یادیں'' پہلے کسی دوسرے شخص کے بارے میں لکھی جاتی تھیں۔ اور بیسویں صدی کے آواخر میں لوگوں نے اپنے بارے میں یادیں لکھنا شروع کیا۔ اس حوالے سے سب سے پہلے (Tobias Wolff 1989) نے ایک فلم سے شروعات کی۔ جینیفر کے مطابق

the memoir boom represented the triumph of the first person narrator, and of one who could claim if not always plausibly a less slippery relationshipwith the truth than the unreiable narrators of modernist fiction.........while some critics have raised their eyebrows at Mr. McCourt's tiotal recall of dialogue over heard from the crib, no serious doubts were ever raised about his essential truthfulness" [۲]

سوانح نگار ڈورتھی گیلا فرماتی ہیں کہ:

Writing is problem solving ; Whether fiction,biography,or memoir certain basic questions have to be resolved." [۳]

---

۱ امروز، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۷ شمارہ ۴، علی گڑھ، مشمولہ مضمون چہرہ بہ چہرہ روبہ رواز ڈاکٹر خالد حیدر، ص:

۲ https://www.ocf.berkeley.edu/~jfkihlstrom/memoir.htm

۳ https://www.ocf.berkeley.edu/~jfkihlstrom/memoir.htm

یادیں منتخب ہوتی ہے جب کہ سوانح عمری حالات زندگی پر منحصر ہوتی ہے۔جیسا کہ انگریزی ادب کے ایک ادیب واشن ٹن لکھتے ہیں کہ ایک حقیقی سوانح عمری حقائق پر منحصر ہوتی ہے۔جب کہ یادیں ایک مختصر یاد پر مبنی ہوتی ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> Washington post, reprinte in the West County Time, 08/24/03 notes that ''A real autobiography traffics in facts a memoir relise on memory " ۱

انگریزی ادب میں یادوں کے ابتدائی نقوش جولیس سیزر کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔لیکن اس کے بعد اس صنف پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی گئی۔بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی ادب میں ''یادیں'' پر بہت کچھ لکھا گیا یہاں تک کہ اسے بحیثیت صنف تسلیم کرلیا گیا۔لیکن ''یادیں'' کے سب سے پہلے مصنف جولیس سیزر ہی ہیں۔جنہوں نے ایک لڑائی کے بارے میں ایک کتاب بعنوان Commentaries on the wars سے لکھی تھی۔اس کتاب میں انہوں نے ان لڑائیوں کا ذکر کیا ہے جو نو سال کے دوران ہوئیں تھی۔جو انہوں نے گیلک جنگوں میں مقامی فوجیوں سے لڑتے ہوئے گزارے تھے۔ان کی دوسری کتاب Commemtaries de Bello Civili یہ خانہ جنگی پر مبنی ہے۔اس طرح جولیس سیزر انگریزی ادب میں پہلا یادگار مصنف کہلایا۔اس کتاب کی اشاعت کے برسوں بعد صنف ''یادیں'' پر دوسرے مصنفین نے توجہ مرکوز کی اور اس صنف کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔انگریزی ادب میں صنف ''یادیں'' کو مندرجہ ذیل مصنفین نے خوب سراہا اور اس صنف پر بہت سی تحریریں ملتی ہیں۔

جارج آرویل(George Orwell)جیمز بالڈون(James Baldwin)سوسن گرفن (Susan Griffin) اور ایلکس کیٹس شلمین (Alix Kates Shulman) یہ سب سے زیادہ متاثر کن کتابیں رہیں ہیں۔مغربی ادب میں Chronicle of Higher Education اس کے علاوہ سب سے زیادہ فروخت ہونے والی یادوں کی کتاب The Liras'Club and Lit ہے۔ جس کی مصنفہ Mary Karr تھی۔انہوں نے نیویارک ٹائم میں ایک مضمون یادوں پر لکھا۔

---

۱ https://www.ocf.berkeley.edu/~jfkihlstrom/memoir.htm

> And now, writing my own memoirs,I know God is the truth. Only by studying actual events and questioning your own motives will the complex inner truths ever emerge from the darkness. I tell aspiring memoirists, if you're the kind of person who can't apologize, who digs in,trusts only the frist impulse, then this won't be your form. The convenient sound bites into wich I store my sense of self are rarely accurate whose are? They have to be unpacked and pecked at warily,with unalloyed suspicion. you must testify and recant, type and delete. [۱]

خودنوشت اور یادیں میں فرق:

کہا جاتا ہے کہ Memoir is a sub catogry of biography and Auto biography. اسی لیے سوانح عمری، خودنوشت اور ''یادیں'' میں فرق بیان کرنا لازمی ہے تا کہ ان اصناف کے درمیان فرق واضح ہوجائے ۔''یادیں'' مصنف خود لکھتا ہے۔ جس میں وہ اپنے بارے میں اور اپنے دوستوں کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے یہ واقعات سچ پر مبنی ہوتے ہیں ۔ جون ڈرائڈن کہتا ہے کہ The biographyis particular men lives ہے اور سوانح عمری میں کسی خاص شخص کے حالاتِ زندگی کو کوئی دوسرا شخص رقم کرتا ہے۔ جس شخص کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے ۔ وہ یہ خود نہیں لکھتا بلکہ کوئی دوسرا مصنف اسے لکھتا ہے۔ اسی لیے اسے سیکنڈ ہاینڈ اکسپیر نس (second hand Experince) کہا جا تا ہے۔ سوانحی عمری دوطرح کی ہوسکتی ہے ۔ ایک خالص سوانح 1 pure biography اور دوسری قسم 2 impure biography کی ہوتی ہے۔ شروع میں یادیں دراصل آپ بیتی کے ہی زمرے میں شمار کی جاتی

---

۱ https://www.ocf.berkeley.edu/~jfkihlstrom/memoir.htm

تھی۔اور کچھ عرصے تک یادوں کو آپ بیتی کی ذیلی صنف کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے اسی لیے یادوں اور خود نوشت کے درمیان بنیادی فرق کو واضح کرنا ضروری ہے یادوں میں ایک اہم واقعہ پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ جس کا تعلق ایک مخصوص وقت اور مقام سے ہوتا ہے۔ یادیں عام اور خاص دونوں ہو سکتیں ہیں ۔کبھی کبھی یادیں دو یا تین یادوں کا مرکب ہوتی ہیں۔ جب کہ خودنوشت ایک شخص کی پوری زندگی پر محیط ہوتی ہے۔جس کے تحت بچپن، خاندانی تاریخ، تعلیم وتربیت، ادبی کارناموں اور ناکامیوں کی تمام تر تفصیلات جمع کی جاتیں ہیں ۔اسی لیے انگریزی ادب میں خودنوشت کو First Hand Experince. کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ مصنف خود اپنی زندگی کے بارے میں لکھتا ہے۔خودنوشت کا اصل مقصد Personality persentation ہے۔اپنی ذاتی زندگی کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔تا کہ وہ اپنی جدوجہد کو لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔انگریزی ادب میں خودنوشت کو چھ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔Types of autiobiography

1- Pure Autobiography

2- Spiritual Autobiography

3- Auto fiction

4- Autobiographical Novel

5- Autobiographical Song

6- Literary Autobiography

اردو ادب میں ناول کی شکل میں لکھی جانے والی خودنوشتیں بھی موجود ہیں۔اس ضمن میں قرۃ العین حیدر کا ''کارِ جہاں دراز ہے'' اولین ناول کی ہیئت میں لکھی جانے والی خودنوشت ہے۔اس کے بعد عصمت چغتائی نے ''کاغذی ہے پیرہن'' سوانح ناول لکھا۔ ''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری'' ممتاز مفتی کے یہ دونوں بھی سوانح ناول کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔ ''گیان سنگھ شاطر'' از گیان سنگھ شاطر کو بھی اس میں شمار کیا جاسکتا ہے جسے ساہتیہ اکادمی انعام سے بھی نوازہ گیا ہے۔اسی طرح سے یادوں کو بھی خودنوشت یا آپ بیتی کا ہی ایک جزو کہا جاتا ہے۔جس میں مصنف اپنی زندگی کے کسی واقعہ یا جگہ کے حوالے سے لکھتا ہے۔اس میں اپنے ساتھ ساتھ مصنف دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھتا ہے۔ جب کہ خودنوشت میں اصل مقصد مصنف کی

اپنی حیات ہے۔لیکن بعض خودنوشتیں ایسی بھی ہیں جن کا کچھ حصہ صنف ''یادیں'' پرمبنی ہوتا ہے۔

خودنوشت لکھنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشہور ومعروف ہو۔ جب کہ یادنگار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مشہور ہو۔ یادنگار اکثر اپنی زندگی کے کسی خاص یا دلچسپ حصے کے متعلق چند قصوں کا انتخاب کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ ایک تھیم یا موضوع کا انتخاب کر کے اپنی زندگی کے مختلف حصوں سے کہانیاں سناتا ہے عموماً وہ واقعات اہم ہوتے ہیں۔ جب کہ خودنوشت میں مصنفین عام طور پر اپنی پوری زندگی کی کہانی بیان کرتا ہے اسی لیے اس کا مشہور زمانہ ہونا ضروری ہے۔لیکن ایک یادنگار کوئی بھی ہوسکتا ہے مشہور یا غیر معروف جیسا کہ انگریزی میں Nelson Mandela نیلسن منڈیلا کی Long Walk to Freedom خودنوشت سوانح عمری ہے اور The Liar's Club میری کر کا Mary Karr کی یادوں پرمبنی اہم کہانی ہے۔خود نوشت تواتر کے ساتھ لکھی جاتی ہے جب کہ یادیں اکثر و بیشتر وقت کے ساتھ آگے پیچھے لکھی جاتی ہیں۔خود نوشت میں حقائق پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس میں مصنف تاریخی ریکاڈ کے مطابق آگے بڑھتا ہے۔ جب کہ یادیں ذاتی تجربے اور داخلیت پر زور دیتی ہیں۔خودنوشت سے ہم تاریخی اعتبار سے بھی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ یادیں بھی حقائق پرمبنی ہوتی ہیں لیکن یادنگار اپنی زندگی کے حقائق کو اپنے منتخب کردہ موضوع کے ذریعے ہی تشکیل دیتا ہے۔ یادیں ذاتی تجربے، قربت اور جذباتی سچائی پر توجہ مرکوز کرتی ہیں۔

''یادیں'' کی شناخت سے متعلق اس گفتگو کے بعد اردو میں ان کتابوں پر نظر ڈال لینا مناسب ہے جن میں ''یادیں'' کے عناصر موجود ہیں یا پھر ان کی شناخت بطور ''یادیں'' ہونی چاہیے۔

اردو ادب میں شروع میں جوش ملیح آبادی، مختار مسعود، نسیم انصاری اور اطہر پرویز کے یہاں یادوں پر مبنی کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں سے جوش کی کتاب ''یادوں کی برات'' کو خودنوشت کہا جاتا تھا لیکن وہ دراصل یادوں پرمبنی ایک اہم اور اعلیٰ پائے کی کتاب ہے کیوں کہ اس کتاب میں مصنف نے اپنی ذات کے سوا کئی دیو قامت ہستیوں کی نجی باب کھول دیئے جو عوام الناس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے ۔ مثلاً گاندھی جی اور رابندر ناتھ ٹیگور کے علاوہ کئی اور شخصیتوں کے متعلق اور مصنف نے خود اپنے بارے میں بھی کھل کر لکھا ہے۔ مصنف نے اپنے ایام بچپن و جوانی کے خوش حال طبقوں کی سماجی قدروں پر ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، ان کے عقیدے اور توہمات پر، ان کے شوق و مشغلوں پر، ان کے تہواروں اور تقریبوں پر،

ان کے رہن سہن ورسومات پر بڑے دلچسپ تبصرے کیے ہیں۔ الغرض ''یادوں کی برات'' جوش کے ستر برسوں کے تجربے اور مشاہدے کی برات ہے۔ یہ کتاب ہر طریقے سے اپنی تہذیبی وتمدنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے قاری کے دل کو فرحت ومسرت بخشتی ہے اور قاری اس عہد کی سیر کرتا ہوا نظر آتا ہے جس میں یہ کتاب تحریر کی گئی ہے۔

یہاں سرسید اولڈ بوائز ریویو کا مختصر جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے چوں کہ اس میں شامل سارے ہی مضامین صنف ''یادیں'' کے زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ سرسید ہال ریو طلباء کا مجلّہ تھا۔ اس ادارے کے صدسالہ تقریب کے موقعے پر سرسید ہال کے طلباء نے اس کا اولڈ بوائز نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں ایک چھوٹا سا تعلیمی ادارہ مدرستہ العلوم کے نام سے قائم ہوا تھا۔ جس کی ابتداء پچاس سے کچھ زیادہ طلباء سے ہوئی تھی۔ اس وقت اس ادارے کی سب سے اعلیٰ جماعت نویں تھی۔ اسی برس نومبر ۱۸۷۵ء کو اس ادارے میں ایک بورڈنگ ہاؤس قائم کیا گیا۔ یہ بورڈنگ ہاؤس ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد ہاؤس تھا۔ اس ہاؤس کے اولین نگراں مولوی ابوالحسن اور مولوی محمد اکبر تھے۔ یہی ہاؤس ترقی کرتے کرتے ۱۹۰۱ء کو سرسید ہال کہلایا۔ اور انگریزی کے سینئر پروفیسر ایل۔ پٹنگ اس کے پہلے پروسٹ مقرر ہوئے۔ اسی لیے یہ ہال تاریخی حیثیت سے یونیورسٹی کا سب سے قدیم ہال ہے اسے دانش گاہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے لہذا اس دانش گاہ عظیم کے صدسالہ تقریب پر یہاں کے طلباء نے سید ہال ریویو کا اولڈ بوئز نمبر ۱۹۷۵ء میں شائع کرنے کا ادارہ کیا۔ چوں کہ یہاں کے طلباء نے اپنے علمی ذوق، رواداری، باہمی اخوت، رہن سہن، کھیل کود اور دوسرے تفریحی مشاغل کا ایک اعلیٰ میعار قائم کیا۔ جس سے ایک ایسا اجتماعی ذہن وجود میں آیا جس نے ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کے گونا گوں مسائل کو نئے تقاضوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک نئے ہندوستان کے طلوع ہونے کی بشارت دی۔ اور اس رسالے کے ایڈیٹر ملک خالد حسین نے ڈاکٹر اصغر عباس کی نگرانی میں اولڈ بوائز نمبر شائع کیا۔ ملک خالد حسین صاحب رسالے کے ارادیے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''یہ خصوصی شمارہ مدرستہ العلوم کے یوم تاسیس کے موقعے پر ہمارے ہال
> کے طلباء کا نذرانہ ہے۔ اس خصوصی نمبر میں سرسید ہال کی اقامتی زندگی

کی ایک صدی کی تہذیبی تاریخ کی مرقع کشی کی ہے ۔ اس کے قلمی معاونین میں ایسے ناموراور مقتدر نئی اور پرانی نسل کے اربابِ فکر شامل ہیں ۔جن پر کوئی بھی رسالہ بجاطور پر فخر کرسکتا ہے ۔ زیرنظر شمارہ میں جن لوگوں کے مضامین شامل ہیں ان میں سے مولوی میاں محمد امین صاحب، سید طفیل احمد صاحب ، اور خواجہ احمد عبدالعلیٰ صاحب کے مضامین ہم نے اخبار'' سرگزشت'' سے اخذ کئے ہیں ، یہ اخبار علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا آرگن تھا اور علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا۔ میر ولایت حسین صاحب کا مضمون ان کی کتاب'' آپ بیتی یا ایم اے او کالج کی کہانی میر ولایت حسین کی زبانی'' سے انتخاب کیا گیا ہے ۔ بانی ویمنس کالج ڈاکٹر شیخ عبداللہ کا مضمون ان کی کتاب ''مشاہدات وتاثرات'' سے لیا گیا ہے ۔ سر رضا علی کا مضمون ان کی خودنوشت سوانح حیات ''اعمال نامہ'' سے موخوذ ہے ۔ عبدالمجید قریشی صاحب کا مضمون کراچی سے سے شائع ہونے والے رسالہ '' العلم'' سے لیا گیا ہے ۔حکیم احمد شجاع صاحب کا مضمون ان کی کتاب '' خون بہا'' اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون ان کی کتاب ''تعلیمی خطبات'' سے اخذ کیا گیا ہے ۔ پچی باریک پر جو مضمون شامل ہے وہ علی گڑھ منتھلی سے منتخب کیا گیا ہے ۔'' [۱]

مذکورہ رسالے میں مندرجہ ذیل بیس نامور اہل کاروں کی اقامتی زندگی سے متعلق تجربات اور تاثرات پر مشتمل مضامین موجود ہیں تاکہ اس دانش گاہ کے طلباء اپنے پیشرو اور بزرگوں کے تجربے سے اپنے ماضی کا صحیح عرفان حاصل کریں بلکہ یہ تجربہ ان کے مستقبل کے لیے نشان راہ ثابت ہوں ۔ زیرنظر شمارہ ۱۹۷۵ء کو لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ سے شائع کیا گیا ۔ یہ رسالہ ۳۰۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔اور ڈاکٹر حسام الدین فاروقی صاحب اس وقت سرسید ہال کے پرووسٹ تھے ۔ شمارے میں مشامل حضرات کے مضامین کی ترتیب حسب ذیل ہیں :

---

[۱] سرسید ہال ریویو، اولڈ بوائز نمبر، ایڈیٹر، ملک خالد حسین، نگراں، ڈاکٹر اصغر عباس، ص:۹

۱۔ یہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک — ڈاکٹر اصغر عباس

۲۔ ۱۸۷۸ء کا علی گڑھ کالج — میاں محمد امین

۳۔ علی گڑھ کالج کا ابتدائی زمانہ — سید طفیل احمد

۴۔ ایم اے او کالج کی یاد — خواجہ عبدالعلی

۵۔ علی گڑھ کالج میں داخلہ — میر ولایت حسین

۶۔ ایم اے کالج میں میرا داخلہ — ڈاکٹر شیخ عبداللہ

۷۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں میرا داخلہ — سر رضا علی

۸۔ علی گڑھ کے شب و روز — عبدالمجید قریشی

۹۔ میرا علی گڑھ کالج — حکیم احمد شجاع

۱۰۔ کچی بارک — ریڈیکل

۱۱۔ چشمۂ حیات کی یاد میں — ڈاکٹر ذاکر حسین

۱۲۔ ایک خطبہ جو دیا نہ جا سکا — پروفیسر رشید احمد صدیقی

۱۴۔ ۱۹۲۵ء کا علی گڑھ — محمد عدیل عباسی

۱۵۔ چند یادیں چند چہرے چند چراغ — مسعود علی ذوقی

۱۶۔ کچھ سہانی یادیں کچھ پرانی باتیں — پروفیسر آل احمد سرور

۱۷۔ یادوں کے چراغ — پروفیسر مختار الدین احمد

۱۸۔ یادوں کی دھوپ چھاؤں — قاضی ارشد مسعود گنگوہی

۱۹۔ خوابوں کا شہر — محمد شفیع قریشی

۲۰۔ داستان عہد گل — حبیب احمد صدیقی

۲۱۔ ایس ایس ہال کی باتیں — سید وقار حسین

۲۲۔ اس بزم میں — // // //

مندرجہ بالا حضرات کے مضامین کی فہرست کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یادوں کو تحریر کیا ہے۔ان حضرات نے ایک صدی کے تجربات ومشاہدات کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔تا کہ وہ لوگ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر کامیاب و کامران ہو سکیں۔ گرچہ ان تمام مضامین میں یادوں کے پہلوں دیکھنے کو ملتے ہیں۔لیکن ہم یہاں صرف ایک دو مضامین کے اقتباسات کو پیش کریں گے۔چوں کہ تمام مضامین کا تجزیہ نہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔طوالت کی وجہ سے لہذا یہاں صرف چند مضامین کے اقتباس کو پیش کیا جائے گا جن میں صنف ''یادیں'' کے عنصر موجود ہیں۔مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون ''چشمۂ حیات کی یادمیں'' کا یہ اقتباس اہمیت کے حامل ہے ملاحظہ ہو۔

''۴۴ برس بہت سے رنگ دیکھے مگر جس میں اسی دانشگاہ سے برابر دل کو تعلق رہا؟ گہرا تعلق ٹوٹ نہ سکنے والا تعلق یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھا۔ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا۔یہاں دوست پائے دوستی کی قدر پہچانی مل جل کر کام کرنا سیکھا۔اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے بھانت بھانت کی زندگی کے عنوان کو برتنا اور پرکھنا سیکھا۔اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے۔پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں اُبھرتا ہوا محسوس کیا اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمیانوں پر نادم ہونا سیکھا سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری کے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا۔صلاحیتوں کی جھجھکتی کونپلوں کو نشو ونما دے سکنے کے لئے ان میں زندگی کی ریل پیل میں مردانہ اور شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی خلوت وجلوت کی جُداجُدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا یہاں فرمانبراری سیکھی اطاعت شعاری سیکھی ادب سیکھا،

بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی باغی بنے نکالے گئے دوسری بستی بسانے میں ایک صدی کاٹ دی مگر اس مادرِ علمی کی طرف دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی بن باس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا۔ حالات بدلے ملک آزاد ہوا یہاں کا نظام بھی بدلا ذمہ دارانہ حیثیت سی اس کی خدمت کا موقع میسر آیا بری بھلی جو بن پڑی خدمت کی اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سرشوریدہ کو یہیں بالین آسائش نصیب ہو جائے گی مگر یہ مقدر نہ تھا۔'' [۱]

دوسرا مضمون عبدالمجید قریشی کا ''علی گڑھ میں میرے شب وروز'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ جس میں انہوں نے علی گڑھ کے اساتذہ اور طلباء کے ایک انوکھے رشتے کی نوعیت کا ذکر کیا ہے۔

''اب میں جستہ جستہ اس مادرِ علمی کی ان خصوصیات کو پیش کرتا ہوں جو میرے دامن کش ش کا موجب بن کر میرے پاؤں کی زنجیر ہوگئیں۔ ان میں سب سے مقدم تو اس درس گاہ کی اقامتی خصوصیت تھی۔ اساتذہ اور طلباء یہاں ایک بڑے خاندان کی صورت میں ایک ہی ماحول اور ایک ہی سرزمین پر قیام پزیر تھے جہاں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، سوتے جاگتے اساتذہ کی نگاہ طالب علم پر رہتی تھی اور طالب علم کی نگاہ اساتذہ پر، اب تو علی گڑھ شہر اور یونیورسٹی کے درمیان کا علاقہ سب کا سب عمارتوں سے معمور ہے لیکن اِس زمانے میں شہر اور کالج میں کافی فصل اور لکھے میدان تھے۔ شہر سے الگ تھلگ ہمارا یہ خاندان آباد تھا۔ .... دوسری

---

[۱] سرسید ہال ریویو، اولڈ بوائز نمبر، ایڈیٹر، ملک خالد حسین، نگراں، ڈاکٹر اصغر عباس، ص: ۱۳۶/۱۳۷

خصوصیت اساتذہ کی شفقت اور ہمہ قوتی توجہ تھی جو طلباء کے دل میں
ایک طرف ان کا رعب اور دوسری طرف اُن کی اہمیت اور عزّت کا جزبہ
پیدا کرتی تھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ۔ میری طالب علمی کے ابتدائی
دور میں کالج کے پرنسپل ماریسن صاحب تھے یہ شفقت اور اخلاق کے
مجسم پیکر تھے۔........ پرنسپل صاحب اور ان کی میم صاحبہ نے ایک ہفتہ
وار انجمن قائم کر رکھی تھی جس میں چند اساتذہ اور کچھ سربرآوردہ طلبا
شامل کئے جاتے تھے۔ ہر ہفتے کسی علمی اخلاقی یا معاشی مضمون پر کوئی
رکن اپنا مقالہ پڑھتا تھا اور اس پر بحث ہوتی تھی اس میں بعض تنظیمی
معاملات بھی سامنے آجاتے تھے پھر کافی یا چائے کا دور چلتا تھا یہ کالج کی
ایک معرکتہ الآراء انجمن تھی اور اسکی رکنیت قابلِ فخر سمجھی جاتی تھی ۔ میں
بی۔اے میں آنے کے بعد اس انجمن کا رکن بنا۔ ماریسن صاحب کے بعد
جو پرنسپل آئے انہوں نے بھی اس انجمن کو قئم رکھا۔ آرچ بولڈ صاحب
کے جانے کے بعد یہ انجمن ختم ہوگئی۔'' [۱]

سید مسعود الحسن زیدی کی تصنیف کردہ کتاب ''علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں'' بھی صنف ''یادیں'' پر مبنی ایک دلکش اور اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب مطبوعہ آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور سے ۱۹۷۷ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منظر عام پر آئی ۔ یہ کتاب ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اور کتاب کے شروع میں مصنف نے بعنوان ''خواہ مخواہ'' سے کتاب کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

''حبیب اللہ اوج علیگ جنکی قابلیت اور شرافت کی دھوم ہے انہوں نے
نہ معلوم کیوں اور کس وجہ سے یہ بشارت دی کہ اگر میں علیگڑھ کی باتیں
لکھوں بڑی دلچسپ ہوگی انہوں نے مجھے اکسایا کیا چڑھایا کہ آپ کا
لکھا ''چل'' جائے گا میں نے ہاں ہوں کر کے بات لپیٹ دی ۔اس

---

[۱] سر سید ہال ریویو، اولڈ بوائز نمبر، ایڈیٹر، ملک خالد حسین، نگراں، ڈاکٹر اصغر عباس، ص:۱۰۳/۱۰۴

کے بعد انہوں نے ایک اور نسخہ تجویز فرمایا کہ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو ان واقعات کو اپنے الفاظ میں ٹیپ ریکارڈ کرادیجئے دوسرا ان کو سُن کر لکھ دے گا۔ خیر دل کو ٹھکٹی نہیں۔'' [۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب صنف یادوں پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے ان مضامین کو مختلف اوقات میں تحریر کیا تھا۔ بعد میں دوستوں کے اسرار پر ان مضامین کو کتابی شکل میں منظر عام پر لایا گیا۔ کتاب میں شامل مضامین کی ترتیب حسب ذیل ہے:

۱۔ خواہ مخواہ
۲۔ بریگیڈیئر گلزار کی کہانی، مسعود زیدی کی زبانی
۳۔ بریلی جاتے ہوئے ایک پیر صاحب سے ملاقات
۴۔ ڈاکٹر مصر کی شرافت
۵۔ لنگوٹیا یار کے نام خط
۶۔ شہد کی مکھیوں کا چھتا
۷۔ راجہ غلام محمد ایک ہندو لڑکا لائے
۸۔ ہاکی کلب کا چندہ لینے پٹیالہ گئے
۹۔ سیّد قاسم رضوی شیر دکن
۱۰۔ سب سے زیادہ خوشی ہوئی
۱۱۔ مچھر دانی لائے
۱۲۔ ڈائننگ ہال کے منشی ظہور احمد اور سلطانہ ڈاکو
۱۳۔ انشورنس والی لڑکی اور میں
۱۴۔ وہاج احمد خاں
۱۵۔ بھائی وہاج المپک کھیلنے گئے

---

[۱] مسعود الحسن زید، علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں، مطبوعہ آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور، ص:۱۱

مندرجہ بالا فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف نے قاری کو علی گڑھ اور علی گڑھ سے ملحق علاقوں، یونیورسٹی کے ہال، علی گڑھ کی علمی شخصیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر نوجوان نسل مستفید ہوں گے اور اپنے حوصلوں کو بلند و بالا رکھے۔ کیوں کہ اسلاف کے قصے کہانیوں پڑھنے سے نوجوانوں کو جوش و ہمت عطا ہوتی ہے۔

میر ولایت حسین کی کتاب ''آپ بیتی یا ام۔اے۔او کالج علی گڑھ کی کہانی میر ولایت حسین صاحب کی زبانی'' بھی صنف ''یادیں'' پر لکھی گئی ایک اہم کتاب ہے۔ مصنف نے چوں کہ خود علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے اور پراکٹر اور طلباء کے نگراں بھی رہے ہیں۔ اسی لیے ان کا واسطہ اسکول اور کالج دونوں قسم کے طلباء سے پڑتا تھا ان میں بعض تنگدست اور غریب بچے بھی ہوتے تھے۔ اور جب وہ اپنی پریشانیوں سے شکستہ دل ہوتے تو ان کو مصنف اپنے گزشتہ واقعات سناتے تھے۔ جس سے ان کا ہمت و حوصلہ برقرار رہتا۔ جیسا کہ مصنف نے خود کتاب کے شروع میں ''سبب تالیف'' میں کتاب کو تحریر کرنے کی وجہ بتائی ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میں چونکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بوڈنگ ہاؤس کا پراکٹر اور طلباء کا نگراں تھا۔ مجھ کو اسکول اور کالج دونوں قسم کے طلباء سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان میں سے بعض بہت عسرت اور تنگدستی کی حالت میں تھے۔ جب وہ شکستہ دل ہوتے تو میں ایسے طلباء کو اپنے گذشتہ حالات سنا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اب اُن حالات کو کتاب کی شکل میں پیش کرنے سے غرض یہ ہے کہ میرے طالب علمی کے حالات پڑھ کر نادار تنگدست اور مالی مشکلات میں مبتلا طلباء کی ہمت افزائی ہو۔ اور وہ سمجھیں کہ جب میں نے باوجود ہر قسم کی مشکلات کے صرف استقلال کی وجہ سے تعلیم حاصل کر لی تا اُن کے واسطے بھی ایسا کرنا ممکن ہے۔ اُمید ہے کہ اس کتاب سے طلباء کی آئندہ نسلوں کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ اور مجھ کو دعائے خیر سے یاد کریں گے۔''[۱]

---

[۱] میر ولایت حسین، آپ بیتی ام۔اے۔او کالج علی گڑھ کی کہانی، سیّد ہادی حسین زیدی۔ حبیب اللہ منزل ڈگی روڈ علی گڑھ، ص:۶

کتاب کی فہرست بھی اہمیت کے حامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے کتنے دلکش انداز میں طلباء کو اپنے گذشتہ واقعات سے آشنا کروایا ہے کتاب کی فہرست حسب ذیل ہے:

۲۱۔ طلباء کی تعمیری کوششیں

۲۲۔ سالہائے ۱۸۹۱ء-۱۸۹۲ء

۲۳۔ کرکٹ اور فوٹ بال کلب

۲۴۔ ادبی سرگرمیاں

۲۵۔ مستقل سیکنڈ ماسٹر

۲۶۔ آنربیل جسٹس محمود

۲۷۔ سید صاحب کا انتقال

۲۸۔ ایران کا سفر

۲۹۔ کالج کے پرنسپل

۳۰۔ ۱۹۰۷ء کا اسٹرائیک

۳۱۔ نواب وقار الملک اور راچبولڈ کا اختلاف

۳۲۔ مسلم یونیورسٹی

۳۳۔ کالج سے سبکدوشی

۳۴۔ میری شادی

۳۵۔ وطن میں قیام

۳۶۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کی ملازمت

۳۷۔ میرے چند عزیز دوست

۳۸۔ میر صاحب کی علالت ووفات

''آواز دوست'' یہ مختار مسعود کی صنف ''یادیں'' پرمبنی پہلی کتاب ہے۔اس کے بعد مصنف نے کئی اور کتابیں بھی اسی صنف پر تحریر کیں ۔اور یہ کتابیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یادوں پر تحریر کی گئیں ہیں۔مختار مسعود سیالکوٹ میں ۱۵دسمبر ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد معروف اقبال شناس اور معاشیات کے استاد پروفیسر شیخ عطاء اللہ ہیں۔مختار مسعود نے علی گڑھ مسلم نیورسٹی میں بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد

یہیں سے ایم۔اے کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے والد نے ہجرت کا ادارہ کیا۔اور وہاں مسعود صاحب نے سول سروس کا امتحان ۱۹۴۹ء میں دیا اور کامیاب ہوئے۔وہ سول سروس کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے مثلاً وہ کئی اداروں کے سربراہ اور وفاقی سیکریٹری بھی رہے تھے۔مختار مسعود نے چار کتابیں لکھیں ہیں۔ ''آواز دوست'' جنوری ۱۹۷۳ء ''سفر نصیب'' جنوری ۱۹۸۱ء ''لوح ایام'' جنوری ۱۹۹۶ء اور ''حرف شوق'' جولائی ۲۰۱۷ء میں لکھیں۔

مختار مسعود کی پہلی کتاب ''آواز دوست'' ہے۔جس نے علمی وادبی حلقوں اور نوجوان نسل میں تہلکہ مچادیا تھا۔جب کہ اس وقت تک مصنف کی وجہ شہرت تصنیف وتالیف یاتحریر وتقریر نہیں تھی۔لیکن ''آواز دوست'' کے شائع ہوتے ہی مصنف کو بطور ایک مستند اور مقبول فنکار کی شناخت بن چکی تھی۔اور خوش قسمتی سے مصنف کی ''آواز دوست'' کے بعد منظر عام پر آنے والی تصانیف کی مقبولیت وشہرت کا معیار کم وبیش وہی رہا جو ''آوز دوست'' کو ملا تھا۔''آواز دوست'' اور ''حرف شوق'' ان دونوں کتابیں میں مختار مسعود صاحب نے اپنے تعلمی ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یادوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ان کتابوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں مقدمہ نہیں لکھا گیا ہے انہوں نے کسی محقق یا نقاد کی رائے نہیں لی۔ بلکہ انہوں نے اپنی تمام کتابوں کے مختصر دیباچے تین تین سطروں پر مبنی خود تحریر کیے ہیں۔پہلی کتاب آواز دوست کا دیباچہ ملاحظہ کیجیئے۔

> ''اس کتاب میں صرف دو مضمون ہیں،ایک طویل اور دوسرا طویل تر ان دونوں مضامین میں فکر اور خون کا رشتہ ہے۔فکر سے مراد فکر فردا ہے اور خون سے خونِ تمنا۔'' [۱]

آواز دوست میں انہوں نے واقعی خونِ تمنا اور خونِ جگر دونوں صرف کیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آواز دوست کے بلیغ اور عالمانہ جملے اقول زریں اور ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں:

> ''اس برعظیم میں عالمگیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا وہ مینار قرار دادِ پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں لیکن ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جس میں سکھوں کا گرداورہ اور

---

[۱] آواز دوست، مختار مسعود، شاہ بیگم اور شیخ عطاء اللہ ٹرسٹ، ص:۳۰

فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں
پر بیٹھا ان تین گمشدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر
میرے کان میں راز کی بات کہہ دی، جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے
بے چراغ ہو جائیں، جہاد کہ جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے،
ملک کی بجائے مفاد اور ملّت کی بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب
مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے، تو
صدیاں یونہی گم ہو جاتی ہیں'' [۱]

''آواز دوست'' کے جواب میں نسیم انصاری نے ''جواب دوست'' کے نام سے کتاب لکھی ہے اس کتاب کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ پہلے پہل یہ کتاب قسط وار رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوتی رہی۔ اس کی شہرت و مقبولیت کے سبب ۱۹۸۸ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گرھ سے کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ۱۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مصنف نسیم انصاری علی گڑھ کے طالب علم رہے ہیں اور ایک معروف سرجن بھی اور بحیثیت فنکار بھی کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اور ''جواب دوست'' کے علاوہ انہوں نے کئی اور کتابیں بھی تصنیف کیں ہیں۔ مثلاً ''خواب تو جزیرے ہیں'' ''درد آشنا'' اور ''دیدہ و دانستہ'' وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

زیر نظر کتاب کے شروع میں پروفیسر آل احمد سرور نے کتاب کا تعارف کروایا ہے جیسا کہ وہ رقمطراز ہیں کہ:

''نسیم انصاری اپنے اسکول اور پھر یونیورسٹی کے کلاسوں تک کے تجربات
بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ ....نسیم انصاری کے ذہنی سفر کی یہ
داستان صرف ایک حساس، بیداد، صاحب نظر، ماہر فن اور دانشور کی
داستان ہی نہیں ہے، یہ علی گڑھ کی تاریخ کا بھی ایک ورق ہے۔ تہذیب
الاخلاق میں جب اس کی قسطیں شائع ہوئیں تو اس کا خاصا چرچا رہا اور

---

[۱] آواز دوست، مختار مسعود، شاہ بیگم اور شیخ عطاء اللہ ٹرسٹ ص: ۶۰

عام طور پر اس کا خیر مقدم کیا گیا۔خوشی ہے کہ اب یہ کتابی صورت میں
ایک وسیع تر حلقہ تک پہنچے گا۔'' [۱]

''حرف شوق'' بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یادوں پر لکھی گئی ایک دلچسپ کتاب ہے۔یہ کتاب ۵٦۸صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کی شروع میں ایک فارسی شعر درج ہے اس کے بعد مصنف نے خود ایک صفحے کا دیباچہ لکھا ہے۔اور انتساب طلباء علی گڑھ کالج کے نام'' جو کہ اقبال کی ایک مشہور و معروف نظم ہے جو اقبال نے علی گڑھ کے طلباء کو ہی خطاب کر کے لکھی تھی۔انتساب کے بعد اس نظم کو شامل کیا گیا ہے۔مصنف نے اس کتاب کو مندرجہ ذیل حصوں میں منقسم کیا ہے۔جن کی ترتیب حسب ذیل ہے۔مثلاً:

۱۔ ماضی کے ساتھ ایک نشست
۲۔ سر سید احمد خان کون تھے؟
۳۔ باعث تحریر
۴۔ مرحوم کے نام ایک خط
۵۔ اختتامیہ

تار والے بنگلہ سے راولپنڈی سازش تک کا یہ سفر علی گڑھ سے ہو کر گزرتا ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ معاشیات کے استاد کا ماہر اقتصادیات بیٹا جس نے ساری زندگی افسر شاہی کی بھول بھلیاں میں گزاری ہو۔علی گڑھ کی کہانی کو جذب وشوق میں ڈوب کر تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ مادرِ علمی کا قرض بھی ادا ہو جاتا ہے۔اور قاری کو طوالت کا زرا بھی احساس نہیں ہوتا۔یہاں کتاب کے چند اقتباسات کو نقل کیا گیا ہے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود صاحب کو علی گڑھ سے کتنی محبت تھی۔اسی لیے انہوں نے دلکش انداز بیان سے اپنے ماردِ علمی کی یادوں کو تازہ کر نئی نسل کو ان مخصوص یادوں سے متعارف کروایا ہے۔چند اقتباسات ملاحظ ہو:

''علی گڑھ چھوڑ ہوئے پچاس برس ہو چکے تھے۔بچپن کے ایک ساتھی نے
میرا ہاتھ پکڑا،یادوں کے تار بنگلے کی چوکھٹ پار کی اور اندر داخل ہو گئے۔

---

[۱] نسیم انصاری،جواب دوست،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،ص:۱۰/۱۱

کہنے لگے، یہ کیسی بے مثال جگہ ہے کہ جب اس کی یاد آتی ہے تو ہر طرف علی ڑھ ہی علی گڑھ نظر آتا ہے۔ جیسے اس کے علاوہ جہان میں اور کچھ بھی نہ ہو۔ ماضی یکا یک زندہ ہو جاتا ہے۔ حال دبے پاؤں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مستقبل کی کیا مجال کہ سامنے آنے کا نام لے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ سماں جس طرح بندھا ہے، دیر تک اسی طرح بندھا رہے۔ علی گڑھ کی یاد کے بارے میں تمہارا تجربہ بھی اسی طرح ہوگا بلکہ اس میں شدت اور محبت کہیں زیادہ ہوگی کیوں کہ علی گڑھ نے جتنا تمہیں دیا ہے اتنا ہمیں نہیں دیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا: میں علی گڑھ کو کبھی یاد ہی نہیں کرتا۔ تم اپنا علی گڑھ وہاں چھوڑ آئے تھے۔ اسی لیے جب اس کی یاد آتی ہے، تمہیں بہا کر لے جاتی ہے۔ میں اپنا علی گڑھ اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ اسے یاد کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ میرا علی گڑھ میرے خون میں گردش کرتا ہے۔ وہ میری فکر کا محرک ہے اور محور بھی۔ وہ میرے ہر اندیشہ کا محرم اور ہر عمل کی نیت ہے۔ میرا علی گڑھ میرا حال ہے۔ حال کو یاد نہیں کرتے، بسر کرتے ہیں۔

خاموشی کی ایک مختصر وقفے کے بعد جو ذہن میں مناسب جواب کی مختلف صورتوں پر غور کرنے میں صرف ہوا، ہمدم دیرینہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ایک ہم ہیں جو صرف دو جوڑے ہمراہ لا سکے۔ ایک کپڑوں کا، دوسرا جسم و جاں کا اور ایک آپ ہیں کہ سارا علی گڑھ اُٹھا کر ساتھ لے آئے۔ میں نے جواب دیا۔ مجھے غلط نہ سمجھیں، میں نہ شاعری کر رہا ہوں اور نہ فلسفہ بگھار رہا ہوں۔ ساز و سامان میں بھی وہاں سے اتنا لے کر آیا تھا جتنا تم لے کر آئے تھے۔ میں تو اس علم کی دولت، فکر کی ثروت

اور دامنِ شوق کی وسعت کا ذکر کر رہا ہوں جو ہر علیگ ،علی گڑھ سے حسبِ مراد اور حسبِ مقدور لے کر آتا ہے۔وہ گٹھڑی جس میں یہ مالِ منقولہ باندھ کر لے جاتے ہیں وہ ہر شخص کی اپنی ذات ہوتی ہے۔جب میں سنگ وخشت کے علی گڑھ سے رخصت ہوا،اس وقت فکر وعمل والا علی گڑھ میرے ہمراہ تھا۔ یہ فکر وعمل اساسی طور پر سرسید کا اور سیاسی طور پر قائداعظم کا تھا۔'' [۱]

مختار مسعود سے ان کے دوست نے گزارش کی تھی کہ آپ ہماری نوجوان نسل کے لیے اسٹریچی ہال کی کہانی لکھیے جیسا کہ وہ خود رقم طراز ہیں کہ:

''میری بات دوست کے جی کو لگی ۔کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکے۔ ان کی آنکھیں البتہ مجھ سے ہم کلام تھیں ۔ان کا کہنا تھا کہ اس خلاصہ کے بعد تفصیل جاننے اور داستان سننے کا شوق تیز تر ہوگیا ہے۔کیا آپ میری اور پاکستان کی تیسری نسل کے نوجوانوں کی خاطر اسٹریچی ہال پر ایک مضمون نہیں لکھ سکتے ۔یہ مضمون آواز دوست کے مصنف پر دونسلوں کا قرض ہے۔ ایک وہ جو تحریکِ پاکستان کے معجزہ کی عینی گواہ ہے اور دوسری آج کل کے نوجوانوں کی نسل جو کئی وجوہات کی بنا پر اپنی تاریخ کے سنہرے دور سے کٹ کر رہ گئی ہے۔میں کیسے انکار کرتا میں نے ہامی بھر دی اور پھنس گیا۔'' [۲]

کتاب میں علی گڑھ،اسٹریچی ہال اور تحریک علی گڑھ کے کئی کرداروں کا تذکرہ ملتا ہے،ساتھ ہی اس شہر علم کے گلی کوچوں سے قاری کی شناسائی بھی ہو جاتی ہے۔کتاب میں سرسید اور ان کے رفقاء کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں جنھوں نے اپنی کل جائیداد فروخت کر کے مسلم یونیورسٹی کو دیدی تھی اور خود علی گڑھ میں پھونس کے ایک

---

[۱] حرف شوق،مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی،ص:۱۵/۱۶

[۲] حرف شوق،مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۲۱/۲۲

گھر میں آ بسے تھے۔خان بہادر مولوی سید زین العابدین نامی یہ دوست سرسید کے آخری دنوں میں روز ان کے پاس آتے تھے ان کے مزار کی تعمیر خود کھڑے ہوکر کراتے رہے اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اس مسجد میں جہاں سرسید کو دفن کیا گیا ان کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔ان کے حوالے سے مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

> ''تاروالا بنگلہ سے ملحق خاں بہادر مولوی سید زین العابدین کا گھر ہوا کرتا تھا۔کچی اینٹوں کی عمارت، پھوس کی چھت، رقبہ ایک ایکڑ، آہنی خاردار تاروں کی احاطہ بندی۔ زمینداری فروخت کر کے جو کچھ ملا وہ پہلے ہی کالج کو دے چکے تھے۔سرسید سے دوستی نبھانے کے لیے علی گڑھ میں گھر بنوالیا۔سرسید بیمار ہوئے۔چپ لگ گئی۔دوست آتا اور سرسید کے پاس خاموش بیٹھا رہتا۔سرسید کے مقبرے کی تعمیر شروع ہوئی۔دوست آتا اور چھتری تان کر گرمی میں وہاں کھڑا رہتا۔سات سال کے بعد زین العابدین کا انتقال ہوا۔سرسید کی ہم سائیگی میں دفن ہونے کی جگہ ملی۔یہ وہی دوست ہے جسے سرسید نے ایک خط میں بے باک جملہ لکھا تھا: 'صبح اُٹھکر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔'' [۱]

مختار مسعود نے یونیورسٹی کے اساتذہ کا ذکر بہت ہی دلکش انداز میں کیا ہے۔اور اساتذہ کو علم کے کنوئیں سے بہت ہی عمدہ طریقے سے تشبیہ دی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مسلم یونیورسٹی کے کے نامور اساتذہ سب بڑے گہرے اور پُرآشوب کنوئیں تھے۔کسی کنوئیں پر میں نے اوک لگا کر پیاس بجھائی۔کسی سے دو چار ڈول پانی لیا، کسی سے سد بیس۔چند کنوئیں ایسے بھی تھے جن سے میں نے ڈول کے بجائے چرس بھر کر پانی لیا اور کشتِ آرزو کو خوب خوب سیراب کیا۔آرزو کی بہت سی جہتیں تھیں۔ایک چرس پانی میں نے اس کنوئیں سے بھی لیا جس کی منڈیر پر بیٹھ کر ایک بار میں نے اردو نثر کی خدمت کا خواب

---

[۱] حرف شوق، مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ص:۱۴/۱۵

سرِ شام دیکھا تھا۔ وہ کنواں رشید احمد صدیقی کے گھر کی زمین میں واقع تھا۔
انہوں نے دیوار کو خم دے کر اس کنوئیں کو گھر کے باہر کی جانب رکھا تا کہ
بلا روک ٹوک ہر کوئی اپنی پیاسی آرزوؤں کو سیراب کر سکے۔ بہت سے
نوجوانوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔
یہ بات میں آج احمد سرور کو کیسے سمجھاتا۔ چپ بیٹھا رہا۔ گفتگو کی بند گلی سے
باہر نکلنے کا راستہ چپ شاہ کا روزہ رکھنے سے کھل جاتا ہے۔'' [1]

کتاب میں سرسید کے تعزیتی ریفرنس اور اگلے سال یونیورسٹی کے سالانہ جلسے کا حال بڑی دردمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف کا مشاہدہ عمیق اور مطالعہ وسیع ہے۔ ساتھ ہی خالق کائنات نے انہیں دردمندی کی دولت کثیر سے نوازا ہے۔ مصنف کی انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی ادب پر گہری نظر ہے جن کے حوالے کتاب میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اور علی گڑھ، سرسید اور اسٹریچی ہال کے طویل اور خصوصی واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اسٹریچی ہال کس طرح قیام کیا گیا ہے اس کے قیام میں کیا کیا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا سب کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

''یکا یک حالات نے کروٹ لی۔ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔
غیب سے جو شخص نمودار ہوا اس کا نام سر جان اسٹریچی تھا۔ وہ ۱۸۷۴ء
میں یو۔ پی کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا۔ نئے گورنر کے ساتھ سرسید کے
دیرینہ تعلقات اس آڑے وقت میں بہت کام آئے۔ سر جان اسٹریچی کو
جوں ہی فرصت ملی وہ علی گڑھ پہنچے۔ سرسید کے ساتھ بگھی میں بیٹھ کر موقع
ملاحظہ کیا۔ قصۂ زمین برسرِ زمین۔ فیصلہ کالج کے حق میں ہو گیا۔ زمین
کے ساتھ پیڑ اور کنوئیں مفت مل گئے۔ چند گھر تھے جنھیں ملبہ قرار دے کر
معمولی رقم کے عوض کمیٹی کے نام کر دیا۔
کالج فنڈ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ عمارتوں کے نقشے اور نام منظوری کے لیے

---

[1] حرف شوق، مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ص: ۴۱۷

پیش کیے گئے۔ کاروائی نامہ کی شق نمبر ے کے مطابق بڑا ہال جو مدرستہ العلوم میں آنر یبل سر جان اسٹریچی صاحب بہادر لیفٹیننٹ گورنر کے نام نامی سے موسوم ہوگا اور دی اسٹریچی ہال کہلاوے گا۔ یہ نومبر ۱۸۷۵ء کی بات ہے۔ ایک دن اسٹریچی ہال کی تعمیر کا فیصلہ ہوا۔ دوسرے دن لارڈ لٹن نے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ تیسرے دن سر جان اسٹریچی نے اسی مقام پر کالج کے مرکزی ہال کا سنگِ بنیاد رکھا۔ چوتھے دن تعمیر شروع ہوئی۔ پانچویں دن ہال کا افتتاح ہوا۔ دنیا چھ دن میں بنی تھی۔ اسٹریچی ہال جو اپنی نوع کی ایک دنیا ہے، پانچ دن میں بنا تھا۔ یہ پانچ دن نومبر ۱۸۷۵ء سے نومبر ۱۸۹۴ء تک پورے اُنیس تکلیف دہ اور صبر آزما سالوں پر محیط ہیں۔ تجربہ کار اور معاملہ فہم لوگوں کا فقدان، غیر ملکی مشیروں کی بہتات۔ سرمایہ ضرورت سے کم، معترضین ضرورت سے زیادہ۔ کفر کے فتوے، خیانت کے الزام۔ ٹرسٹی بل کے خلافات، سب سے زیادہ کام کرنے والے ساتھی کا ساتھ چھوڑ جانا۔ ایک لڑکے کا انتقال ، دوسرے کا ذہنی بگاڑ۔ اسٹریچی ہال نے منصوبہ بندی سے افتتاح تک کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اس کی تعمیر کا کام رُک کر چلتا رہا اور چل چل کر رُک جاتا۔ بوڑھے سرسید کے جواں حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو علمِ جدید اور علم نافع کے فروغ کے اس دن شکن منصوبے کو کبھی کا خیر باد کہہ چکا ہوتا۔'' [۱]

کتاب کے مطالعے کے دوران تاریخ کا ایک سفر بھی جاری رہتا ہے۔ مصنف اپنے قاری کو کبھی فردوسی کے ایران، کبھی مغل دور کے فتح پور سیکری، کبھی ملکہ الزبتھ کے انگلستان اور کبھی آرمینیا کے کوہ ارارات لے جاتے ہیں۔ کتاب واقعات سے بھری ہوئی ہے اور اس کا ہر پیرا سوچنے سمجھنے اور سیکھنے کا ایک دفتر ہے۔ کتاب میں

---

[۱] حرف شوق، مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ص: ۳۲/۳۳

علی گڑھ کی درس گاہ میں طویل ترین قیام کے دعوے دار مسعود زیدی مصنف ''علی گڑھ کی باتیں علی گڑھ کی یادیں'' کا ذکر بڑے شگفتہ انداز میں کیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مصنف لکھتے ہیں کہ:

ہمارا بچپن کساد بازاری کی نذر ہو گیا۔ لڑکپن سایۂ تیغ میں گزرا۔ دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہونے تک ہم لوگ نوجوانی کی سرحد پار کر چکے تھے۔ سرحد کے دوسری طرف خانہ جنگی نے ہمارا استقبال کیا۔ آزادی کی جدوجہد آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ مسلمان بہ یک وقت دو جنگوں میں اُلجھ گئے۔ ایک انگریزوں کے خلاف اور دوسری اس جمہوریت کے خلاف جو برعظیم کے مسلمانوں کو ایک کم حیثیت اور بے اعتبار اقلیت کے علاوہ کوئی اور درجہ دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ دونوں محاذِ جنگ جاں بازی اور فداکاری کا مطالبہ کرتے تھے۔ مسلمانوں نے بڑی قربانی دی۔ کچھ خوشی سے، کچھ لاچاری کے سبب، بین الاقوامی سیاست میں کمزور کو انصاف کب ملا ہے۔ جو ہمیں ملتا۔'' [۱]

ٹھیک اسی طرح مصنف کتاب کے اختتامیہ میں لکھتے ہیں کہ:

'' میری زندگی کی کہانی ایک ایسے انقلاب سے عبارت ہے جس میں میرے بچپن نے آنکھ کھولی اور میری جوانی نے ہوش سنبھالا۔ ...اس صبح انقلاب کو دیکھنے کے لیے زندہ ہونا ایک سعادت تھی۔ دراصل یہ خودشناسی اور جنوں کی داستان' تھی جو کبھی پرانی نہیں ہو سکتی تھی بلکہ زمانہ اُسے بار بار دہراتا ہے، فرق صرف نام، مقام اور وقت کا ہوتا ہے۔ نام بدل سکتا ہے، مقام پیچھے رہ جاتا ہے، اور وقت جو کبھی تیزی اور کبھی آہستگی سے ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔ اسی لیے میری یہ داستان

---

[۱] حرف شوق، مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ص: ۱۴

ایسے موڑ پر پہنچ کر ختم ہوتی ہے جب میرے وہ ساتھی اپنا راستہ بدل چکے تھے جن کے ساتھ میں نے زندگی شروع کی تھی ۔ ایک دن کم از کم دونسلوں کے حائل ہو جانے کے بعد میں نے بچپن کے ایک ساتھی سے اپنے عہد علی گڑھ کی سب سے اہم اور منفرد عمارت کا قصہ سنانے کا وعدہ کیا تھا یہ کتاب اسی وعدے کی تکمیل ہے مجھے خوشی ہے کہ بفضلہٖ یہ وعدہ وفا ہوسکا آج وہ دوست جس کی فرمائش پر میں نے یہ کہانی سنائی مجھے کہیں نظر نہیں آرہا، غالباً میں نے لکھنے میں دیر کر دی یا اسے جانے کی جلدی تھی..؟ چند احباب جو یاد آرہے ہیں وہ سب اس جہاں سے کوچ کر چکے ہیں لیکن ایک مصنف کی حیثیت سے وہ میرے لیے اب بھی زندہ ہیں، ان کی رفاقت اور محبت کی یاد خوش کن بھی ہے اور دل نواز بھی! یہی داستان کی باز آفرینی کا سبب ہے مگر یہ کسے معلوم تھا کہ آج جب کہانی اپنی تکمیل کو چھو چکی ہے تو وہ جو اس کے مرکزی کردار تھے یوں سب کے لیے ''حرفِ شوق'' بن کر رہ جائیں گے۔...انہیں جانے کی جلدی تھی یا میرے رب کی رضا اسی میں تھی اس کہانی کے منظر پر آنے سے پہلے وہ دنیا سے گزر جائیں..'' [۱]

کتاب کی آخری چند سطریں مختار مسعود کی رفیقہ حیات عذرا مسعود نے تحریر کی ہیں۔ کیوں کہ جب اس کتاب کے اشاعت کا وقت قریب آیا تو اس وقت تک مصنف بھی اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ چکے تھے۔ اورانہوں نے اس کتاب کو بطور امانت اپنے قارئین کے سپرد کرنے کا کام اپنی اہلیہ کو سونپا تھا۔ جیسا کہ عذرا مسعود رقم طراز ہیں کہ:

''یہاں تک وہ آواز بول رہی تھی جو ان لفظوں کے آراستۂ طباعت ہونے سے پہلے دنیا سے گزر گئی اور مجھے یہ امانت قارئین کے سپرد کرنے

---

[۱] حرف شوق، مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ص ۵۶۲/۵۶۳

کا فریضہ سونپ گئے۔ کون جانتا تھا کہ جس کے لیے عمر بھر دیدہ و دل فرش راہ رہے وہ یوں آنکھیں بند کر کے محفل کو ویران کر جائے گا اور مسعود کے ساتھ ساٹھ برس کی رفاقت چشم زدن میں انجام پذیر ہو جائے گی۔ اس کتاب کے لیے وہ ایک طویل عرصے سے کام کر رہے تھے مختلف اوقات میں اس کتاب کے مندرجات کے بارے میں ان کے خیالات بدلتے رہے۔ کبھی وہ اسے محض پہلے دو مضامین تک محدود رکھنا چاہتے اور کبھی بعد کے دو مضامین کا اضافہ بھی گوارہ کرتے۔ اب کہ حتمی رائے کے لیے وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں ہم نے ان کے مزاج اور مزاج دان کی رائے کے پیش نظر یہ چاروں مضامین شامل کتاب کر لیے ہیں کہ ان کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے لیے یہ مضامین نہایت اہم ہیں اور اگر انھیں مسعود صاحب کی آخری کتاب میں شامل نہ کیا گیا تو پھر قارئین ان کی شخصیت کے ان گوشوں سے آگاہ نہیں ہوسکیں گے جن پر یہ مضامین روشنی بکھیر رہے ہیں۔''[۱]

جابر حسین کی تصنیف کردہ کتاب ''ریت پر خیمہ'' یادوں پر مبنی ایک اہم اور دلکش کتاب ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کو ساہتیہ اکیڈمی انعام بھی مل چکا ہے۔ جابر حسین ہندی اور اردو کے معروف فنکار ہیں۔ وہ ۵ جون ۱۹۴۷ء کو بہار میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے انگریزی، ہندی اور اردو ادب، میں ایم۔اے کیا تھا۔ انہوں نے انگریزی زبان اور ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے مگدھ یونیورسٹی کے تحت کامرس کالج، پٹنا میں کام کیا۔ جون ۱۹۹۴ء میں گورنر نے انہیں بہار قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا۔ تب ۱۹۹۵ء اپریل میں انہیں بطور قانون ساز کونسل کا چیئرمین تعینات کیا گیا۔ وہ ۲۶ جولائی ۱۹۹۶ء میں بہار قانون ساز کونسل کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ مئی ۲۰۰۰ء میں انہیں ودھان سبھا میں بطور خاص شامل کیا گیا۔

جابر حسین نے کونسل کے چیئرمین کے طور پر پارلیمانی سیاست میں مختلف جہتیں متعارف کروائیں۔

---

[۱] حرف شوق، مختار مسعود، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ص: ۵۶۴

انہوں نے معاصر پارلیمانی ،ثقافتی اور سماجی مسائل پر جمہوری انداز سے بات چیت کی روایت ڈالی ۔انہوں نے جھاریا لینڈ سلائیڈ، جڑوگودا ریڈی ایشن افیکٹس ،چائلڈ لیبر ،عوامی خواندگی ،ضروری تعلیم ،دریاؤں کا مسئلہ، بچوں کے حقوق وغیرہ جیسے اہم موضوعات سے متعلق مسائل کا حل تلاشنے میں بہت اہم اور سرگرم کردار ادا کیا ہے۔ وہ ان چند نایاب سیاست دانوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں ان کی خدمات پر ستھیا اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔انہوں نے ''ریت پر خیمہ'' کے علاوہ کئی کتابیں اور بھی لکھیں ہیں مثلاً ''انگارے اور ہتھیلیاں'' ''بہار کی پسماندہ مسلم آبادیاں'' ''بہار قانون ساز کاؤنسل ضابطہ نامۂ طریقہ کار اور دستور العمل'' ''کربلا در کربلا'' ''ایک ندی ریت بھری'' ''دیوارِ شب'' ''سن اے کاتب'' وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔

''یادوں کے چراغ'' ڈاکٹر سلامت اللہ کی کتاب ہے جو یادوں پر لکھی ہے ۔گرچہ پہلے اسے خودنوشت میں ہی شمار کیا جاتا تھا لیکن یہ کتاب خودنوشت سے زیادہ ''یادیں'' سے قریب ہے یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں غالب اکیڈمی دہلی سے منظرعام پر آئی۔اس کتاب میں بھی مصنف اپنی ذات کے ساتھ دوسرے اشخاص کا ذکر کرتا ہے اور اس حوالے سے ڈاکٹر سلامت اللہ خود رقم طراز ہیں کہ:

> ''میں نے یادوں کے کوچے میں سفر کیا تو ان شخصیتوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے میرے دل ودماغ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ نقوش جن کی بدولت میری زندگی کو ایک سمت ملی اور بالآخر وہ بن سکا جو میں آج ہوں ۔سوچتا ہوں کہ ان اشخاص کی زندگی کے ان پہلوؤں کا ذکر کروں جن سے میں نے کچھ سیکھا، اپنے کردار کو بنایا اور بہتر انسان بننے کی کوشش کی۔کیا عجب دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھائیں'' [۱]

ڈاکٹر سلامت اللہ نے اس کتاب کو سات حصوں میں منقسم کیا ہے جن کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:

۱۔ تعلیمی جدوجہد۔اسکول کی منزل

۲۔ منزل کی تلاش۔اسکول سے آگے

۳۔ پیشہ ورانہ زندگی

---

[۱] یادوں کے چراغ، ڈاکٹر سلامت اللہ، غالب اکیڈمی دہلی، ص:۱۱

۴۔ ہم نفسانِ رفتہ

۵۔ میرے ہم دم، میرے دوست

۶۔ وطنیت سے انسانیت تک

۷۔ کس کے لئے؟

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ پہلے باب میں مصنف نے اپنی تعلیمی جدوجہد کے متعلق تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بعد ان اساتذہ کا خاص تذکرہ ملتا ہے جن کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر رہا ہے جنھوں نے ان کی تعلیمی سفر میں ہر طرح کی امداد کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر جو کہ برہمن تھے ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ:

''ہیڈ ماسٹر ایک برہمن تھے، پنڈت رام پرسن جی۔ سناتن دھرمی ہونے کے ناتے مذہبی ریت و رواج کی سختی سے پابندی کرتے تھے، یہاں تک کہ کسی غیر برہمن کا چھوا ہوا نہیں کھاتے تھے۔ اپنا بھوجن خود پکاتے تھے اور چوکے کے اندر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اس وقت دھوتی کے علاوہ ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہوتا تھا۔ ایک طرف تو ان کی روایت پرستی کا یہ عالم تھا، لیکن دوسری طرف ایسے اچھے استاد اور عمدہ انسان تھے۔ ان کے برتاؤ میں مجھے کبھی کسی قسم کا بھید بھاؤ دکھائی نہیں دیا۔ اپنی جماعت میں میں اکیلا مسلمان تھا، ایک کائستھ دو ٹھاکر (راجپوت) اور دس بارہ برہمن بچے تھے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پنڈت جی نے کبھی کوئی ایسی بات کہی یا کی ہو کہ جس سے مجھے یا میرے کسی ساتھی کو احساس ہو کہ مذہب یا جات پات کی بنا پر وہ بچوں میں فرق کرتے ہیں اور نہ ہی دولت یا غریبی کی وجہ سے امتیاز برتتے ہیں۔'' [۱]

سلامت اللہ کے دوسرے استاد جن سے وہ بہت متاثر تھے وہ سائنس کے استاد این۔ مکر جی صاحب

---

[۱] یادوں کے چراغ، ڈاکٹر سلامت اللہ، غالب اکیڈمی دہلی، ص: ۱۶/۱۷

تھے ان کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے:

''ایک اور استاد جس نے مجھ پر اثر ڈالا، وہ تھے سائنس کے ٹیچر جے۔ این۔مکر جی صاحب۔فراخ دلی اور انسانی ہمدردی کا نمونہ، تعلیم میں میری نمایاں ترقی دیکھ کر ساتویں جماعت میں مجھے سائنس لینے کی ترغیب دی۔ اس وقت ہائی اسکول کے نصاب میں سائنس کی حیثیت ایک اختیاری مضامین کی تعلیم کا انتظام تھا۔سنسکرت، فارسی، سائنس اور ڈرائنگ۔ان میں کسی ایک مضمون کا انتخاب کرنا پڑتا تھا۔مکر جی چھٹی جماعت کے سالانہ امتحان میں ہمارے ریاضی کے ایک پرچے کے ممتحن تھے اس پرچے پر میں نے سوفی صد نمبر حاصل کئے تھے۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے سائنس لینے کا مشورہ دیا۔ ....مجھے یاد پڑتا ہے کہ مکر جی نے کئی بار میری تعلیمی فیس خود ادا کی۔رات کو پڑھنے کے لیے لالٹین میں تیل نہ ہوا تو اپنے گھر سے بوتل سے تیل دے دیا۔جب میں اپنا کھانا خود پکانے لگا تھا تو کبھی کبھی میرے پاس ایندھن نہیں ہوتا تھا، اس وقت ان کے یہاں سے ایندھن مل جاتا تھا۔ایک دو بار اپنے گھر کھانے کے لئے بلایا،........میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے بڑے آدمیوں کے قصے سنایا کرتے تھے کہ انہوں نے مشکلات کا مقابلہ کس طرح کیا، اور اپنی انتھک محنت کی بدولت دنیا میں ناموری حاصل کی۔'' [۱]

دوسرے باب میں مصنف نے علی گڑھ کی تعلیمی زندگی اور وہاں کے اساتذہ مثلاً ضیاء الدین، پروفیسر حبیب، حبیب الرحمٰن اور رشید احمد صدیقی اور جامعہ ملیہ کی ملازمت پر مبنی واقعات قلم بند کیے ہیں۔جیسا کہ ایک جگہ رشید احمد صدیقی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ:

''رشید صاحب نے اپنے کسی دولت مند دوست سے کتابیں خریدنے کے

---

[۱] یادوں کے چراغ، ڈاکٹر سلامت اللہ، غالب اکیڈمی دہلی، ص: ۲۵/۲۴

لئے ایک اچھی خاصی رقم حاصل کر کے میرے کھاتے میں جمع کروادی اور مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا، شاید اس لئے کہ میری خوداری کو ٹھیس نہ لگے۔ اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں اپنے تعلیمی مطالبات چکانے کے لئے پرووسٹ آفس گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہیں تھی کہ آخر یہ رقم کس نے میرے کھاتے میں جمع کروادی۔ کلرک نے صرف اتنا بتایا کہ ایک چیک میرے حساب میں جمع کرنے کے لئے کہیں سے آیا تھا۔ معلوم نہیں کس نے بھیجا تھا۔ بہت عرصے بعد میں پتہ لگا سکا کہ یہ چیک رشید صاحب کی معرفت موصول ہوا تھا۔ اسے کہتے ہیں ''نیکی کر اور دریا میں ڈال۔'' [۱]

تیسرے باب میں مصنف نے جامعہ کی ملازمت، وہاں کی علمی شخصیات خاص کر ذاکر حسین کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

چوتھا باب میں مصنف نے اپنے دوستوں عبداللہ ولی بخش قادری، ابوبکر، اکرام احمد، جنیدالحق، اقبال مہدی، مسعودالحق، خلیل الرب، ای۔ ایس۔ ریڈی، نیلوفر، صابر، وغیرہ کی یادوں پر مبنی ہے۔ پانچویں باب میں مصنف نے تحریک آزادی کی جدوجہد کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ سیّد مقصود زاہدی کی کتاب ''یادوں کے سائے'' بھی یادوں پر تحریر کی گئی دلکش کتاب ہے یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں کاروان ادب ملتان سے منظر عام پر آئی ہے۔ اس میں مقصود زاہدی نے چند سیاسی اور ادبی شخصیات سے منسلک واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے انتساب سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کتاب ''یادیں'' پر لکھی گئی ہے لہذا اس کا انتساب اہمیت کا حامل ہے کہ ''اپنے مرحوم دوست ڈاکٹر صادق کی یادوں کے نام'' مقصود زاہدی نے اس میں دس معروف و عظیم ادبی و سیاسی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کی ترتیب اس طرح ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، سیّد سجاد حیدر یلدرم، ڈاکٹر عابد حسین، آغا طاہر نبیرہ آزاد، مولوی عبدالسلام نیازی، علامہ نیاز فتح پوری، مجید امجد، ناصر کاظمی اور آغا اعجاز اکرم وغیرہ مشہور و معروف ہستیوں کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے۔

---

[۱] یادوں کے چراغ، ڈاکٹر سلامت اللہ، غالب اکیڈمی دہلی، ص: ۸۳

علاوہ ازیں ''یادوں کے جھروکے'' زہرہ مسحور کی کتاب ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ مسحور صاحب نے اپنی اہلیہ زہرہ کا نام اپنے نام سے جوڑا ہے جب کہ عموماً عورت اپنے شوہر کا نام اپنے نام کے آگے لگاتی ہیں۔ یہ مسحور صاحب کا مجموعہ ہے جس میں نثر و نظم کے علاوہ کئی اور اصناف کو بھی شامل کیا گیا ہے مثلاً نظم، انشائیہ، یادرفتگان، افسانہ، مکتوب نگاری، اور تبصرہ وغیرہ اصناف سے متعلق تحریریں ملتی ہیں۔ جس کا اندازہ اس کتاب کی فہرست دیکھ کر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ''یادرفتگان'' والا حصہ پورا صنف ''یادیں'' پر مشتمل ہے۔ نیز ''یادوں کے چراغ'' عارف نقوی کی کتاب ہے۔ جو ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب میں تین طرح کی تحریریں (یادیں، افسانے اور خاکے) پائی جاتیں ہیں۔ کتاب کے شروع میں عارف نقوی کے تین دوست پروفیسر شارب رودلوی، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند اور صابر ارشاد عثمانی نے عارف نقوی کی شخصیت اور فن پر مضمون قلم بند کیے ہیں جو اس کتاب کے شروع میں شامل کیے گئے ہیں۔ جن کو پڑھ کر عارف کی شخصیت اور ان کی تحریروں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے جیسا کہ شارب رودلوی اپنے مضمون میں عارف صاحب کے افسانوں اور یادوں پر مبنی تحریروں کے متعلق اپنی تنقیدی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''عارف نقوی کی ایک خصوصیت جزئیات نگاری ہے۔ ان کے افسانے ہوں یا یاداشتیں ان میں محلّوں، گلی کوچوں، دوکانوں اور متعلقات کا ذکر اس تفصیل سے آتا ہے کہ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ خود وہاں موجود ہے اور ان چیزوں کو دیکھ رہا ہے۔ اس طرح قاری نہ رہ کر خود اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔'' [۱]

گر چہ اس کتاب میں افسانے، خاکے بھی تحریر کیے گئے ہیں لیکن دراصل یہ کتاب صنف ''یادیں'' پر راقم کی گئی ہے۔ اس حوالے سے عارف نقوی کا خود تحریر کیا ہوا مضمون بعنوان ''میری یادوں کے چراغ'' کا یہ اقتباس اہمیت کے حامل ہے کہ:

> ''اک داغ ہے سینے میں دو اشک ہیں آنکھوں میں مفلس نہ مجھے سمجھو یہ میرا خزانہ ہے اس خزانے میں جو چراغ روشن ہیں وہ اس مجموعہ کے روپ

---

[۱] عارف نقوی، یادوں کے چراغ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۔۲ ۱۱۰۰۰ ص: ۱۵

میں پیش خدمت ہیں ۔پچھلے کچھ برسوں میں ایک ایک کر کے اتنے
دوست، رشتہ دار اور بزرگ ونو جوان مصنف وشاعر اس دنیا کو چھوڑ کر
چلے گئے ہیں کہ بار بار یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اب کس کی باری ہے اور ان
میں میں کس مقام پر کھڑا ہوں ۔عالم شباب وجوانی میں انسان کو وقت کا
اندازہ نہیں ہوتا ہے، مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب ہر گزرتے
ہوئے لمحے کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے کہ ہم زندگی کے تقاضوں کو
کہاں تک پورا کیا ہے۔اور اپنے پیچھے کیا چھوڑ کر جارہے ہیں۔اور اس
لیے چاہتا ہوں کہ میری یادوں کے خزانہ میں جو کچھ محفوظ ہے اس میں
کچھ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا جاؤں۔میں اس مقام پر خاص طور
اپنے عزیز رفقاء پروفیسر شارب رودلوی، ڈاکٹر ودیاّ ساگر آنند، پروفیسر
ڈاکٹر شمیم نکہت ، جناب صابر ارشاد عثمانی ، مدیر پرواز لندن اور دیگر
دوستوں کا مشکور ہوں، جن کے تقاضوں اور ہمت افزائی نے ان یادوں
کو ایک لڑی میں پرونے کی توفیق عطا کی۔''

''یادوں کے چراغ'' ان واردات اور تجربات پر مبنی ہے جو آج بھی
میرے دل میں لکھنؤ کی یادوں کو تڑپاتے ہیں۔قارئین کی چاشنی کے لیے
چند افسانوں کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے تا کہ ہر بات صرف 'میں' تک
محدود نہ رہے۔''[۱]

عارف نے کتاب میں سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، ملک راج آنند، کرشن چندر نرگس دت، ذکی شیرازی وغیرہ شخصیات سے منسلک واقعات بیان کیے ہیں ۔اس کے علاوہ اپنے افسانے بھی شامل کیے ہیں۔جس کا اندازہ کتاب کی فہرست دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے کتاب کی فہرست کی ترتیب حسب ذیل ہے:

---

[۱] عارف نقوی، یادوں کے چراغ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹۔گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۔۲۰۰۰۱۱ص:۳۰

۲۔	اردو زبان کا جاں نثار: عارف نقوی	ڈاکٹر ودیاّ ساگر آنند
۳۔	عارف نقوی: فن اور شخصیت	صابر ارشاد عثمانی
۴۔	میری یادوں کے	چراغ عارف نقوی
۵۔	نقوش	
۶۔	فیض احمد فیض	
۷۔	بنگلہ نمبر ایک	
۸۔	پنجابی ٹولہ	
۹۔	لکھنؤ یونیورسٹی	
۱۰۔	نرگس دت	
۱۱۔	ذکی شیرزی	
۱۲۔	پہلا جوتا	
۱۳۔	رکشے والا	
۱۴۔	کورا کاغذ	
۱۵۔	نوکر	
۱۶۔	تعویذ	
۱۷۔	تحفہ	
۱۸۔	بیرک نمبر آٹھ	
۱۹۔	ایک سے چار	
۲۰۔	بارود اور کونپل	
۲۱۔	فرار	
۲۲۔	زلیخا	
۲۳۔	دنیا کے ٹابو	

۲۴۔ لوسی

۲۵۔ نئے سال کا تحفہ

عارف نقوی کی دوسری تصنیف ''جرمنی میں نصف صدی'' بھی یادوں پر مبنی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کو ۲۰۱۱ء میں خالد علوی نے مرتب کیا۔ اور شروع میں انہوں کتاب کا تعارف بعنوان ''نصف صدی کا قصہ'' سے یوں کروایا ہے کہ:

> ''جرمنی میں نصف صدی' ایک ایسے بین الاقوامی صحافی کی یادداشتیں ہیں، جسے اندرا گاندھی، ڈی کے بروا، خواجہ احمد عباس، ملک راج آنند، کرشنا مینن، ذاکر حسین، فیض احمد فیض، سردار جعفری، سنیل دت، نرگس، کرشن چندر، سجاد ظہیر سے ملاقات کے بے شمار مواقع ملے ہیں۔ ان غیر رسمی ملاقاتوں کی روئیداد اُن شخصیات کے بارے میں نئے ابواب کھولتی ہے۔ سنیل دت اور نرگس سے ان کا رشتہ اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا نام بھی نرگس رکھا تھا'' [۱]

نیز اس کتاب کا انتساب بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا جا ہے کہ یہ کتاب صنف ''یادیں'' پر ہی لکھی گئی ہے ملاحظ ہو:

> ''ان دوستوں اور عزیزوں کے نام جن کی یادیں مجھے روحانی قوت عطا کرتی ہیں۔'' [۲]

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب یادوں پر لکھی گئی ہے اور اس وقت کی عظیم شخصیتوں اور پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگِ عظیم اور بیرونی ملک ادیبوں کی کانفرس وغیرہ کے متعلق واقعات سے واقف کرواتی ہے۔ خودنوشت میں ہم مصنف کی ذات سے مکمل طور پر آگاہ ہوتے ہیں جبکہ یادوں میں مصنف اپنی سے جڑے شخص، جگہ، یا کسی خاص مقام میں سے واقف کرواتا ہے۔

سید حشمت سہیل کی تصنیف ''یادوں کی کہکشاں'' ۲۰۱۷ء میں شارپ کمپیوٹرس، حیدرآباد انڈیا سے منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب بھی صنف ''یادیں'' کے ہی زمرے میں آتی ہے۔ جس کے متعلق خود مصنف لکھتے ہیں کہ:

---

[۱] جرمنی میں نصف صدی، عارف نقوی، مرتب خالد علوی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵، ص:۱۲

[۲] جرمنی میں نصف صدی، عارف نقوی، مرتب خالد علوی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵، ص:۱۲

''دوستوں سے گفتگو کے دران بعض واقعات جو میری زبان سے نکلے تھے ان کو یکجا کر کے کتابی شکل دے دی گئی ہے۔'' [1]

اس کتاب کی خاصیت یہ ہے کہ مصنف کی اہلیہ نے ان کی باتوں کو ریکاڈ کیا ہے جب سید حشمت اپنے دوستوں سے محوِ گفتگو تھے ان کو اطلاع کیے بغیر جیسا کہ ان کی اہلیہ کتاب کے شروع میں ''حرف آغاز'' کے عنوان سے اس کتاب کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

''یہ دلچسپ باتیں کرتے ہیں، یاداشت تو اچھی ہے ہی، جب باتیں چھیڑ دیتے ہیں تو لگتا ہے جیسے بے شمار کتابیں بولنے لگی ہوں۔ شاعری، ادب، قدیم داستانیں، بھوتوں پریتوں کے قصے (یہ ان کا خاص موضوع ہے۔) شکار کے واقعات اور پھر ان کا انداز بیان، کاغذ پر وہ اتار چڑھاؤ آ ہی نہیں سکتا، آنکھیں، چہرہ، ہاتھ اور جسم کی ہر جنبش، ساتھ ہی زبان وبیان کا زیر وبم آپ کو اپنے ساتھ ایک جادوئی فضا میں لے جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الف لیلیٰ کی شہزاد داستانوں سے داستانیں نکال رہی ہے۔ خود انھیں کا کہنا ہے کہ: ''پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار رکھ دے کوئی چائے اور پکوڑے مرے آگے'' یہاں شکاگو میں امین حیدر صاحب اور ان کے بعض دوستوں نے کئی مرتبہ کہا کہ جب یہ باتیں کریں تو ٹیپ ریکاڈ رکھ لینا چاہیے۔ ایک دن گھر میں میں نے یہی کیا، ان کے کچھ دوست بیٹھے ہوئے تھے اور یہ رواں تھے میں نے چپکے سے ان کی کرسی کے پیچھے ٹیپ رکاڈر آن کر دیا۔ ان کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ یہ میں نے کئی بار کیا جب کافی مواد اکٹھا ہو گیا تو ان سنایا، ان کو بہت تعجب آمیز خوشی ہوئی بس پر کیا تھا خود سارے ٹیپ سنے اور ان میں حسب ضرورت درستگی کی۔ جہاں بعض کتابوں سے اقتباسات کی ضرورت تھی وہاں ان کتابوں سے

---

[1] یادوں کی کہکشاں، سیدّ حشمت سہیل، شارپ کمپیوٹرس، حیدر آباد انڈیا، ص:۱۳

نقل کیا اوراس کے بعد میں ''گل افشانی گفتار'' کو کتابی شکل دے دی۔
اب یہ کتاب ''یادوں کی کہکشاں'' آپ کے سامنے ہے۔'' ۱

چوں کہ اس کتاب کا مواد ریکارڈ کر کے تیار کیا گیا ہے۔لہذا مصنف خوداس کتاب کے شروع میں ''اقبالی بیان'' کے عنوان سے کتاب کے حوالے سے راقمطراز ہیں کہ:

> ''دوستوں سے گفتگو کے دوران بعض واقعات جو میری زبان سے نکلے تھے ان کو یکجا کر کے کتابی شکل دے دی گئی ہے۔اپنے طرز کی یہ شاید واحد کتاب ہوگئی۔''کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا'' اور اس طرح ''دیوانی ہنڈیا'' کا جنم ہوا۔شاید بعض دوستوں کو دیوانی ہنڈیا کے متعلق معلوم نہ ہو اس لیے عرض ہے کہ موسم کی تمام دستیاب ترکاریوں کو ایک ساتھ ہنڈیا میں ڈال کر پکایا جاتا ہے اسے دیوانی ہنڈیا کہتے ہیں۔'' ۲

اس میں مصنف نے بعض ایسے واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔ جو مصنف نے کسی سے سنے، پڑھے یا دیکھے ہیں۔اس کتاب کی زبان سیدھی سادی رواں ہے۔مصنف چوں کہ طنز ومزاح نگار ہیں۔اس لیے یہ تحریریں بھی طنز ومزاح سے پُر ہیں۔جو قاری کو نہ صرف مصنف کی زندگی کے چند یادگار لمحوں سے واقف کراتی ہے بلکہ کہیں زیرلب تبسم تو کہیں قہقہہ لگانے پر بھی مجبور کرتی ہے۔سید حشمت سہیل شاعر بھی ہیں ان کا مزاحیہ مجموعہ کلام ''کرن کرن تبسم'' شائع ہو چکا ہے۔ نیز ڈی وی ڈی کی شکل میں بھی چار ایڈیشن نکل چکے ہیں اور یوٹیوب پے بھی موجود ہے۔کتاب کا بعض حصہ خودنوشت اور بعض حصہ یادوں پر مبنی ہے۔جس کا اندازہ فہرست سے بخوبی ہوتا ہے۔اسی مناسبت سے یہاں اس کتاب کی فہرست شامل کی گئی ہے مثلاً:

۱۔ حرف آغاز
۲۔ اقبالی بیان
۳۔ رو میں ہے رخش عمر

---

۱ یادوں کی کہکشاں، سیدّ حشمت سہیل، شارپ کمپیوٹرس، حیدرآباد انڈیا، ص ۱۲/۱۱
۲ یادوں کی کہکشاں، سیدّ حشمت سہیل، شارپ کمپیوٹرس، حیدرآباد انڈیا، ص: ۱۳

۷۰۔ پاکستان کے ایک اخبار کا تراشہ

۷۱۔ عمرے کی ادائیگی

۷۲۔ مدینہ منورہ کی حاضری

۷۳۔ اردو کلچرل سوسائٹی شکاگو

۷۴۔ کرن کرن تبسم کی گل پوشیاں

۷۵۔ سینٹ لوئس۔ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، یوسف مرزا لکھنوی

۷۶۔ ہیوسٹن۔ڈاکٹر سید معصوم ترمذی، ڈاکٹر احمد علی برقی آعظمی

۷۷۔ ڈٹرائیٹ۔ندا فاضلی، ڈاکٹر احمد علی برقی آعظمی

۷۸۔ شکاگو۔علامہ نیاز گلبرگوی، ڈاکٹر عارفہ بخاری

۷۹۔ ڈاکٹر عابداللہ غازی۔اقرا فاؤنڈیشن

۸۰۔ ڈاکٹر صادق نقوی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

۸۱۔ رضیہ فصیح احمد

۸۲۔ ڈاکٹر مجاہد غازی

۸۳۔ امین حیدر۔اردو انسٹی ٹیوٹ

۸۴۔ ڈاکٹر احمد شہزاد خان، ڈیورائے یونیورسٹی، شکاگو

۸۵۔ پروفیسر مسرور قریشی

۸۶۔ منیر صدیقی شرر

۸۷۔ نجم الحسن

۸۸۔ مظہر عالم

۸۹۔ واجد ندیم

۹۰۔ دلیل....سید ثروت ضحیٰ

۹۱۔ شمیم سید (پاکستان نیوز، ہیوسٹن، امریکا)

۹۲۔ سردار علی.....شعر وسخن کینیڈا

۹۳۔ اردو ٹائمز، انٹرویوز، پروفیسر مسرور قریشی

۹۴۔ سید حشمت سہیل سے کچھ باتیں (فرزانہ اعجاز)

۹۵۔ سید حشمت کی کتاب ''یادوں کی کہکشاں'' کی رسمِ اجراء

۹۶۔ ''یادوں کی کہکشاں'' کی رونمائی

۹۷۔ منظوم خراجِ عقیدت۔حامد امروہوی

۹۸۔ ساجد چودھری

۹۹۔ تقریر۔ڈاکٹر محمد صادق نقوی۔عثمانیہ یونیورسٹی

۱۰۰۔ حشمت سہیل صاحب سے گفتگو، پروفیسر ڈاکٹر فرحت عظیم صاحبہ

۱۰۱۔ ''دیوانی ہنڈیا'' از: احتشام ارشد نظامی

۱۰۲۔ اُٹھالائے یادوں کی آدھی نگریا: تحریر: امین حیدر

۱۰۳۔ بھائی اختر تاباں کا ایک خط

۱۰۴۔ حشمت سہیل کی دیوانی ہنڈیا ''یادوں کی کہکشاں'' ڈاکٹر عبدالکریم

۱۰۵۔ آخری صفحہ۔یاسمین سہیل (شکاگو)

پروفیسر محمد عبدالرزاق فاروقی کی کتاب ''یادوں کے جھروکے'' بھی یادوں پر لکھی گئی ایک دلچسپ کتاب ہے۔اس کے علاوہ مصنف کی دوسری کتابیں ''ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات'' ''مشورے'' اور ''اودھ پنج کی ادبی خدمات'' وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔کتاب ''یادوں کے جھروکے'' ۲۰۰۷ء میں اُردو اکیڈیمی، حکومت آندھرا پردیش کی جزوی مالی تعاون سے اطیب اعجاز۔عدیل کمپیوٹر گرافکس، چھتہ بازار، حیدرآباد۔۲ سے منظرِ عام پر آئی ہے۔یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے چوں کہ مصنف تعلیمی وتدریس خدمات سے وابستہ تھے اسی لیے انہوں نے اس کتاب کے ذریعے اردو زبان وادب اور طلباء کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔اور اردو زبان وادب کے چند مجاہدوں کی زندگی کے واقعات کو پیش کر کے طلباء میں ہمت وجوش عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''شخصیتوں کا مطالعہ ان کے عہد کا مطالعہ ہوتا ہے۔ ہر چند میں نے یادوں جھروکے سے چند شخصیتوں کے نظارے دکھائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے عہد کے حالات، واقعات اور حادثات کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے چند ایسی شخصیات کا احاطہ کیا ہے جو عہد آفریں تھے۔ میں نے صرف ان جھلکیوں کو دکھانے کی سعی کی ہے جن کے مطالعے سے آنے والا عہد روشن ہو سکے۔ میرا یہ ایقان ہے کہ انسان انسان ہی سے سیکھتا ہے۔ مثالی شخصیتیں فیض رساں ہوتی ہیں۔'' [۱]

مذکورہ کتاب میں مصنف نے اردو زبان وادب کی اعلیٰ علمی شخصیتوں اور چند دین کی اعلیٰ علمی شخصیتوں کے متعلق واقعات بیان کیے ہیں۔ جن کی ترتیب حسب ذیل ہے۔ ان واقعات کو پڑھ کر طلباء کو تحریک ملتی ہے۔

۱۔ علامہ سید عبدالوہاب بخاری
۲۔ اُردو اساتذہ کا ماحول اور مسائل
۳۔ ابوالبرکات سید محی الدین قادری زورؔ
۴۔ پروفیسر محمد عبدالقادر سروری
۵۔ مولانا سید شیخن احمد شطاری کامل
۶۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ
۷۔ مولانا محمد طیب قاسمی
۸۔ مولوی محمد محبوب علی
۹۔ اُردو تحقیق کے چار ستون
۱۰۔ مالک رام
۱۱۔ قاضی عبدالودود
۱۲۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی

---

[۱] محمد عبدالرزاق فاروقی، یادوں کے جھروکے، اطیبؔ اعجاز۔ عدیل کمپیوٹر گرافکس، چھتہ بازار، حیدرآباد۔۲، ص:۸

۱۳۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی

۱۴۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

۱۵۔ ٹیپو سلطان سے قلم کے سلطان تک۔ پروفیسر بی شیخ علی

۱۶۔ ڈاکٹر حضرت محمد تراب علی فاروقی

اس کتاب میں ایک شخصیت کے علاوہ باقی تمام شخصیات کو مصنف نے اپنے ذہن میں محفوظ یادوں کے حافظے سے واقعات اخذ کر کے لکھے ہیں۔ اس حوالے عبدالرزاق فاروقی راقم طراز ہیں کہ:

> ''میں نے سوائے ایک شخصیت کے تمام ایسے محسنوں اور کرفرماؤں کو اپنی یادوں میں سجایا ہے جو آج اس جہاں ناپائیدار میں نہیں رہے۔ صرف پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ پر میں نے اس وقت لکھا تھا جب ان کا سایہ سلامت تھا لیکن افسوس صد افسوس جب ان یادداشتوں کو اشاعت کے لئے بھیجا جا رہا تھا وہ مختصر سی علالت کے بعد نہایت خاموشی سے حیات کی شاہ راہ سے گزر کر وہاں پہنچ گئیں جہاں سے پھر لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔'' [۱]

یادوں کے رہگزر'' کے۔ ایس۔ شفیق کی کتاب ہے جو کمرشیل بک ڈپو، چار مینار، حیدرآباد سے ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب ۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ عابد حسین، نریندر لوتھرا اور ڈاکٹر جعفر نظام وغیرہ نے کتاب کے شروع میں تعارف و توصیف، تجزیہ و تنقیدی رائے دی ہیں۔ یہ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے اس کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع کے چار ابواب میں مصنف کی آبیتی بیان کی گئی ہے۔ اور بقیہ تین میں انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کے ذریعے اپنے زمانے کی چند اہم شخصیات کے واقعات کو بیان کیا ہے کتاب کی فہرست کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ باب اول۔ مرحوم والدین

۲۔ باب دوم۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم

---

[۱] محمد عبدالرزاق فاروقی، یادوں کے جھروکے، اطیبؔ اعجاز. عدیل کمپیوٹر گرافکس، چھتہ بازار، حیدرآباد۔۲، ص:۹

۳۔ باب سوم۔جامعاتی تعلیم

۴۔ باب چہارم۔ملازمت مختلف مراحل

۵۔ باب پنجم۔عوامی زندگی کے تجربات ومشاہدات

۶۔ باب ششم۔''یادوں کی رہگزر'' نگارشات وتراجم

۷۔ باب ہفتم۔شخصیات

جیسا کہ کتاب کے شروع میں نریندرلوتھراس کتاب کے حوالے سے راقم طراز ہیں کہ:

> ''شفیق صاحب نے ''یادوں کی رہگزر'' میں اپنی زندگی کے حالات بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔کوئی ڈھائی سوصفحات کی اس کتاب میں ۴۲صفحات ہی خالص ''خودنوشت'' کی تعریف میں آتے ہیں۔باقی کے متعدد مضامین میں ان کی آپ بیتی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔اس طرح وہ بالواسطہ سوانح کہے جاسکتے ہیں۔ان میں مصنف موضوعات ،واقعات اور شخصیات پراپنے خیالات اورعقائد کا اظہار کیا ہے۔'' [1]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی صنف ''یادیں'' پرمبنی ہے۔لیکن یہ کتاب منفرد اہمیت کے حامل ہے کیوں کہ مصنف نے بہت ہی دلکش انداز بیان میں مختلف موضوعات، واقعات اور شخصیات پراپنے خیالات کا اظہار مذہبی طرز میں کیا ہے۔خاص طور پر باب ہفتم میں مصنف نے چودہ معروف اورغیر معروف شخصیات کے متعلق واقعات بیان کیے ہیں۔

رفعت سروش کی کتاب ''یادوں کا دریچہ'' بھی صنف یادوں کے ہی زمرے میں آتی ہے۔رفعت سروش ۱۹۲۶ء میں ضلع بجنور کے نگینہ میں پیدا ہوئے۔رفعت سروش نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، باقر مہدی، ساحر لدھیانوی، اور مجروح سلطان پوری کے ساتھ ترقی پسند انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور جلد ہی ترقی پسندوں میں شمار کیے جانے لگے۔انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس میں ملازمت کے دوران اردو ادب میں کئی نئے نئے تجربے کیے۔اور دیکھتے ہی دیکھتے

---

[1] کے۔ایس۔شفیق، یادوں کی رہگزر، کمرشیل بک ڈپو، چارمینار، حیدرآباد۔۲،ص:۸

انھوں نے اردو مجلس سے نشر ہونے والی تخلیقات کو بہت بلند واعلیٰ مرتبہ عطا کیا انھوں نے ریڈیو میں منظوم ڈراموں کی ابتدا کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اردو ادب کے قارئین کے نام کم وبیش ۶۴ کتابیں تصنیف کیں ہیں۔ ''آنسوؤں کے چراغ'' آل انڈیا ریڈیو اردو (تحقیق وتذکرہ)'' ''اثاثہ'' ''ادب شناسی'' ''بمبئی کی بزم آرائیاں'' ''حرف حرف بمبئی'' ''خواب اور تعبیر'' نقش صدا'' ''نقوشِ رفتہ'' ''پھولوں کی وادی'' ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' ''تھکے نہ میرے پاؤں'' ''قلم کے صفیر'' ''پانی پت'' ''فکر وآگہی اور ''یادوں کا دریچہ ان کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔

''یادوں کا دریچہ'' ۲۰۱۰ء میں اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں رفعت سروش نے اپنے عہد کی سولہ عظیم ادیبوں وشاعروں کے بارے میں دلکش واقعات بیان کیے ہیں اس حوالے سے کتاب کے شروع میں ''پیش گفتار'' کے عنوان سے مصنف نے جو گفتگو کی ہے بلا شبہ وہ اہمیت کے حامل ہیں مثلاً:

> ''یہ کتاب کچھ ایسے اہم ہم عصروں ادیبوں اور شاعروں کی یادوں پر مشتمل ہے جو اپنا سفرِ حیات طے کر چکے۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے، ان شخصیات کی خسوصیات اور ان کی زندگی کے کچھ ایسے واقعات جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، معرضِ تحریر میں آگئے ہیں۔ یہ مضامین نہ ان حضرات کے ادب کا جائزہ ہیں، نہ تنقید نہ قصیدخوانی۔ یہ تو وہ عکس ہیں جو ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے میرے ذہن میں مرتسم تھے، ان کو غیر رسمی انداز میں قلم بند کر دیا گیا ہے۔'' [۱]

مذکورہ کتاب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ جن شعراء وادباء کا تذکرہ مصنف نے اس کتاب میں کیا ہے ان کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے چوں کہ تمام تر شخصیات کا تعلق بیسویں صدی کے فتنہ انگیز دور سے تھا۔ اسی لیے مصنف نے ان شخصیات کے واقعات کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے اس حوالے سے رفعت سروش خود راقم طراز ہیں کہ:

---

[۱] رفعت سروش، یادوں کا دریچہ، اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶ ص:۸

''ان تمام مضامیں کی ترتیب میاں ایک مشکل تھی کیونکہ سبھی مشاہیر اور سب کا تعلق بیسویں صدی کت پر آشوب دور سے ہے:

''جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے''

چنانچہ مضامین کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔'' [۱]

ان تمام مباحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ایسی غیر افسانوی تحریریں جو کسی شخص کی زندگی کے کسی مخصوص وقت، واقعہ، جگہ، یا شخص پر مرکوز ہوتی ہیں، اور مصنف کا اُس مقام، جگہ، واقعہ، یا شخص سے جذباتی تعلق ہو اور وہ جو کچھ تحریر کرر ہا ہے وہ سچ پر مبنی ہو تو ایسی تحریر کو صنف ''یادیں'' میں شمار کیا جانا چاہیے۔

گر چہ اردو ادب میں صنف ''یادیں'' پر بہت سی تحریریں ملتی ہیں۔لیکن اب تک اردو ادب میں یادوں کو بحیثیت صنف مقام حاصل نہیں ہوا ہے۔حالانکہ ایسی بہت سی تحریریں ہیں جو ساتویں اور آٹھویں دہائی میں یادوں پر لکھی گئیں ہیں۔ان کے علاوہ ادھر موجودہ دور میں بہت سی کتابیں ایسی لکھیں گئیں ہیں۔جن کو صنف ''یادیں'' میں شمار کیا جانا چاہیے۔جب کہ جابر حسین کی کتاب ''ریت پر خیمہ'' کو ۲۰۰۵ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایواڈ بھی ملا ہے۔لیکن اردو ادب میں صنف ''یادیں'' کی شعریات ابھی تک متعین نہیں کی گئی ہے۔انگریزی ادب میں بیسویں صدی کے اوائل میں بحیثیت صنف ''یادیں'' کو استحکام حاصل ہو چکا ہے۔لیکن اردو زبان ابھی تک اس کی منتظر ہے۔لہٰذا ہماری یہ کوشش ہے کہ اس مطالعے میں اردو ادب کی ایسی تحریریں جن کا تعلق صنف ''یادیں'' سے ہے۔ان کا ذکر کر کے ''یادیں'' کی تعریف اور اردو ادب میں صنف ''یادیں'' کو بحیثیت صنف استحکام حاصل ہونے کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔

اطہر پرویز کی تحریریں صنف ''یادیں'' کے حوالے سے:

ڈاکٹر اطہر پرویز صاحب کی صنف ''یادیں'' پر پہلی کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' ہے جو انہوں نے ۱۹۷۷ء میں لکھی ہے اس کے بعد ان کی دوسری کتاب ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' بھی یادوں کے ہی زمرے میں آتی ہے۔گر چہ یہ کتاب ان کی بڑی بیٹی سیما پرویز نے ۲۰۱۷ء میں مرتب کر کے شائع کروائی۔لیکن پرویز صاحب نے اس کتاب میں شامل مضامین میں سے بیشتر مضامین ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران لکھے ہیں۔

---

[۱] رفعت سروش، یادوں کا دریچہ، اردو اکادمی، دہلی، سی۔پی۔او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶ ص:۸

لہٰذا اردو ادب میں اطہر پرویز غالباً پہلے ادیب ہیں جن کی تحریروں کو اردو میں ''یادیں'' کے طور پر شمار کیا جانا چاہیے۔ گرچہ اس سے قبل جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' کو بھی صنف ''یادیں'' میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں مصنف نے بعض موقعوں پر افسانوی باتوں سے کام لیا ہے جب کہ صنف ''یادیں'' کے تحت لکھی جانے والی تحریر حقائق پر مبنی ہوتی ہیں اسی لیے اطہر پرویز کو ہی اردو ادب میں صنف ''یادیں'' کا اولین مصنف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ان کی دونوں تصانیف کا صنف ''یادیں'' کے حوالے سے جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اطہر پرویز کی کتاب ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' یادوں پر مبنی ایک اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی سے ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دس مضمون شامل ہیں جن کو پہلے خاکوں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ یہ مضامین صنف ''یادیں'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست حسب ذیل ہیں:

۱۔ ادیبوں کی آپ بیتی
۲۔ ایک پُل جو ٹوٹ گیا
۳۔ ایک رہنما، ایک انسان سر عبدالرزاق محمد
۴۔ جانکی اماں
۵۔ شوکت علی خاں
۶۔ چھتاری
۷۔ رشید احمد صدیقی
۸۔ ایک بستی ایک تہذیب
۹۔ قدسیہ آپا
۱۰۔ پوچھتے ہیں وہ کہ

یہ مضامین مصنف نے ذاتی مشاہدے اور تجربے پر لکھے ہیں جو کہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ کتاب میں شامل پہلا مضمون ''ادیبوں کی آپ بیتی'' یا ''جنوں میں جتنی بھی گزری'' گرچہ اس مضمون کو مصنف نے دو عنوان سے

معاون کیا ہے لیکن دوسرا عنوان ''جنوں میں جتنی بھی گزری'' زیادہ موضوع اور مناسب ہے کیوں کہ اس مضمون کا تعلق ان دنوں سے ہے جب اطہر پرویز جیل میں تھے۔ وہ بائیں بازو کی تحریک سے وابستہ رہے ہیں اور کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے باعث انھیں جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ اسی لیے یہ مضمون قید فرنگ کے انہی کوائف وحالات پر مبنی ہے۔ جیسا کہ وہ خود اس مضمون کے شروع میں رقمطراز ہیں کہ:

''یہ ان دنوں کی یادیں ہیں جب راقم الحروف کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا اور کل وقتی طور پر یونین تحریک سے وابستہ تھا'' [1]

دوران قید مصنف کی جن اشخاص سے دوستی ہوئی، ان تمام افراد کا ذکر انہوں نے اس مضمون میں کیا ہے۔ ''یادیں'' ہر شخص کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ جب کوئی شخص ان یادوں کو تحریر کرتا ہے۔ تو ان کا شمار صنف ''یادیں'' میں ہوتا ہے جس میں مصنف اپنی ذات کے حوالے سے ان لوگوں سے واقفیت کرواتا ہے۔ جن سے اس کا کوئی جذباتی تعلق رہا ہو۔ یہ تحریریں فکشن نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ جس کو پڑھ کر مصنف سے جڑے افرد اواشیاء کے بارے میں بھی علم ہو جاتا ہے اور صاحب تحریر سے بھی آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ اس مضمون میں پرویز صاحب نے جیل کی تکالیف اور اپنے رفقاء سے متعلق واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔ جیل کی صعوبتیں اکثر ادیبوں نے برداشت کی ہیں لیکن پرویز صاحب کے یہاں جس خوشگوار انداز میں جیل کا ذکر ملتا ہے۔ اس طرح کسی اور ادیب کے یہاں نہیں ملتا۔ مثلاً:

''جیل کئی اعتبار سے بہت اچھی جگہ ہوتی ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کو انسان کی حیثیت سے دیکھتے اور احترام کرتے ہیں۔'' [2]

پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ جیل میں مختلف خیالات کے لوگ آپس میں مل جل کر بہت پیار سے رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہاں کوئی کسی پر نہ شک کرتا ہے نہ کسی سے کوئی شکایت کرتا ہے۔ جب انہیں گرفتار کیا گیا تو ان کو بھنڈارجیل منتقل کیا گیا وہاں انہیں دوسری پارٹیوں کے کئی لیڈر ملے جن سے ان کی دوستی ہوگئی اس واقعہ کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ:

---

[1] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵، ص:۱۹

[2] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵، ص:۲۲

''پولیس والے مجھے جیلر کے حوالے کر کے چل دیے اور مجھے اے کلاس، میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اور بھی سیاسی قیدی تھے....کانگریسی، سوشلٹ، کمیونسٹ .....ان سب نے بڑی خوش دلی سے استقبال کیا۔ زیادہ تو ایسے لوگ تھے جن سے ذاتی تعلقات تھے بعض سے سیاسی تصادم ہوتے تھے۔............مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان سب کے پاس کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے....انہوں نے کہا تم کو کتابوں کی پریشانی نہ ہوگی۔ مجھے یہ تجربہ پہلے سے بھی تھا کہ جیل میں سے بڑا مسئلہ پڑھنے کا ہوتا ہے۔ یہاں ہم لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ پڑھنے میں اگر کوئی چیز آئے تو اس کے کاغذ بھی پڑھ لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ نوجوان جو کتابوں سے ''الرجک'' ہوتے ہیں وہ بھی جیل چلے جائیں تو انہیں پڑھنے کی اہمیت کا احساس ہو۔ کیونکہ جیل میں وقت کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے یہ اطمنان ضرور ہو گیا تھا کہ اتنے لوگوں میں وقت اچھا گزرے گا اور سچ یہ ہے کہ ان کے ساتھ وقت بہت اچھا گزرا ہم لوگ خاصی بحثیں کرتے، ساتھ کھانا کھاتے اور باوجودیکہ ہم لوگ ایک دوسرے سے خاصے اختلافات رکھتے تھے لیکن یہ اختلافات ہمارے دلوں میں کوئی میل نہ آنے دیتے۔ یہاں پر کوئی کسی کی نیتوں پر شبہ نہیں کرتا تھا۔'' [۱]

پرویز صاحب عوام سے بے انتہا محبت کرتے تھے جیل میں بھی جب انہوں نے شنکر کی داستانِ غم سنی تو ان سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ انہوں نے شنکر کو پڑھنا شروع کیا۔ ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

''شنکر نے جب اپنے غم کا اظہار کیا اور کہا 'ہم جاہل کے جاہل رہے' تو دراصل اس کی مردانہ انا کو ٹھیس پہنچ رہی تھی کہ بیوی پڑھ لکھ جائے گی اور

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص: ۲۲/۲۰

وہ جاہل رہے گا۔ میرے دل میں اس سے غیر معمولی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے کہا شنکر تم پڑھنے کو تیار ہو تو میں تمہیں پڑھاؤں گا۔'' [۱]

پرویز صاحب نے شنکر کے لیے باقاعدہ نصاب تیار کیا۔ اسے ایک جاہل سے تعلیم یافتہ انسان بنایا۔ ان کے دل میں عوام سے محبت و ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اسی لیے جیل میں بھی ان کا یہ معمول تھا کہ شام کے وقت باقی قیدیوں کے واڑ میں جاتے اور سب کی خیریت دریافت کرتے، اگر کسی کو بھی کسی طرح کی پریشانی ہوتی تو فوراً مدد کرتے جیسا کہ سندر جو کہ اپنی بیوی کو قتل کر کے جیل آیا تھا وہ جیل میں کاروبار کرنا چاہتا تھا اس کی بھی مدد کی۔ اور سردار جی جن کے سر ایس۔ ڈی۔ ایم کی بیٹی کو قتل کرنے کا الزام تھا، جب کہ یہ وہی سردار جی تھے جنہوں نے پرویز صاحب پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا، لیکن جب سردار جی جیل میں آئے تو پرویز صاحب نے ان کا بہت خیال رکھا۔ کھانا بھی اپنے پاس ہی کھلایا۔ جیسا کہ وہ ذکر کرتے ہیں کہ:

''جیلر نے ایک گناہ خانہ ان کے لیے بھی صاف کر دیا تھا۔ اب وہاں ہم تین آدمی آس پاس کے کمروں میں رہتے تھے۔ میں نے سندر سا سے کہہ دیا کہ سردار جی ہمارے ساتھ کھانا میں شریک ہوں گے۔ چنانچہ زیادہ کھانا پکنے لگا۔ دو روز تو سردار جی نے الگ کھایا، پھر میرے ساتھ کھانے لگے۔ چند روز میں ہماری دوستی ہوگئی۔ سردار جی واقعی مظلوم معلوم ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ 'انہوں نے واقعی ایس۔ ڈی۔ ایم کو دھمکی دی تھی مگر یہ کام ان کا نہیں تھا' ..... کہنے لگے میں سوچ رہا تھا کہ ایس۔ ڈی۔ ایم کا تبادلہ کرا دوں گا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کوئی اور ان کا ستایا ہوا تھا، اس نے میری بات سن لی اور فائدہ اٹھایا' بہرحال وہ برے پھنسے تھے اور مجھے سردار جی کی بات کا اس لیے بھی یقین آ گیا کہ سردار جی نے بعد میں مجھ سے یہ اعتراف کیا کہ ایک بار مل مالکوں نے مجھے مارنے کی سازش کی تھی اس میں دو ایک بیڑی کے کارخانے مالک

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص: ۲۵

، چیڑہ کے کارخانوں کے مالک اور چاول ملوں کے مالک شامل تھے۔
سردار جی پیش پیش تھے۔''[۱]

جیل میں بھی پرویز صاحب نے بطور لیڈر قیدیوں کی مدد کی۔ اوران کی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اوران کے حق کی آواز بلند کرتے رہے اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں کہ:

''مجھے اب اندازہ ہوا کہ میں قیدیوں میں کتنا پاپولر ہوگیا تھا۔
اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ان کے بہت سے جھگڑے نپٹائے تھے۔
معمولی معمولی سہولتوں کے لیے جیلر اور سپرڈنٹ سے ان کی باتیں منوائی تھیں۔''[۲]

پرویز صاحب کی سزا کی مدت جب پوری ہوگئی اور انہیں جیل سے رہائی ملی۔ تو اس وقت بھی انہیں جیل سے باہر آنے سے زیادہ ان لوگوں سے جدا ہونے کا غم تھا جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میرا جیل سے چھوٹنے کا دن آ گیا تھا جیل میں ہر ایک سے میرے
بہت اچھے تعلقات ہوگئے تھے۔ سب لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے۔
......جس روز میرا جیل میں آخری دن تھا۔.........سب اداس تھے
سندر تو بہت ہی اداس تھا۔ میں اسے انعام دینا چاہتا تھا۔ کہنے لگا بس
مجھے پانچ روپے دے دیجئے گا فلانے وارڈ کے ذریعے میں نے کہا میں
اور بھی دے سکتا ہوں کہنے لگا ''نہیں اس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے گا''[۳]

ایک اور جگہ وہ جیل کے ساتھیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یہ سچ ہے کہ رہائی کہ وجہ سے میں خوش بھی تھا لیکن وہاں کے در و دیوار
اتنے مانوس ہوگئے تھے کہ ان کے چھٹنے کا ملال بھی تھا۔ میں اس ماحول
میں ایک ایک لمحہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کیا تھا۔ یہاں کا ایک ایک ذرہ

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص: ۳۰/۳۱

۲ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص: ۴۰

۳ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵، ص: ۳۷

مجھ سے مانوس تھا پھر وہ لوگ جن سے صبح شام کا واسطہ تھا، وہ بھی میرے
اپنے ہوگئے تھے۔ سب اداس تھے۔ سب مجھے رخصت کررہے تھے۔
انسانوں کا یہ رشتہ کتنا عجیب ہے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو مجرمانہ
حرکتوں کی بنا پر یہاں آئے تھے۔ لیکن نیکی، شرافت، دردمندی، محبت
اور خلوص ان کے چہروں سے نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔'' [1]

الغرض پرویز صاحب ایک ہمدرد اور بے باک سیاسی لیڈر، معلم اور ادیب بھی تھے۔ جو مظلوم عوام کا سہارا اور آواز بنے۔ اسی طرح انہوں نے بحیثیت ادیب اردو ادب کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے نوع بہ نوع موضوعات پر قلم اٹھایا اور اکثر و بیشتر اصناف پر طبع آزمائی کی۔ انہوں نے اردو ادب کی نثری اصناف میں بھی بیش قیمت اضافہ کیا ہے اور ''یادیں'' پر لکھ کر اردو میں صنف ''یادیں'' کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ گرچہ یادوں میں اب بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس صنف کو اردو ادب میں متعارف کروانے والے اطہر پرویز ہی رہے ہیں۔ اور وہی اردو ادب میں پہلے یادگار مصنف کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کا مذکورہ مضمون بھی صنف ''یادیں'' میں ہی شمار کیا جا سکتا ہے۔ چوں کہ اس میں مصنف نے جیل کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی کیفیات بعض جگہوں پر ناگپور کے واقعات وغیرہ کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے جس کے مطالعے سے ہم مصنف کی زندگی کے چند اہم دور کے واقعات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ان کا یہ مضمون یادوں کی اولین تحریر ہے۔

کتاب میں شامل دوسرا مضمون ''ایک پل جو ٹوٹ گیا'' بھی اطہر پرویز کی یادوں کے سلسلے کو آگے بڑھتا ہے۔ شروع میں مصنف نے الہ آباد شہر کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد اپنے ایک دوست محمود احمد ہنر صاحب کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہیں۔ شہر کی مناسبت سے دیکھا جائے تو یہ مضمون بھی مصنف کی بچپن اور جوانی کی یادوں کے متعلق لکھا گیا ہے۔ لیکن احمد ہنر صاحب کا جس طرح سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بھی خاکے کے بجائے یادوں کے سلسلے کو ہی مزید تقویت بخشتا ہے۔ کیوں کہ یہ مضمون خاکے کے سانچے کو مکمل طور پر نہیں بھرتا۔ اسی لیے اسے خاکوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دراصل محمود احمد ہنر نے اردو اور ہندی دونوں

---

[1] چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵، ص: ۴۱

زبانوں کی خدمت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''شاید چالیس سال ہوئے ہوں گے کہ شاہجہاں پور سے محمود احمد ہنؔر یہاں آگئے۔ یہ نوجوان لڑکا وہ تھا جس نے اسی شہر میں ہندی بھی پڑھی اور اردو بھی۔ ہندی والے اسے ہندی کا اور اردو والے اسے اردو کا ادیب کہنے لگے۔ لیکن وہ کسی ایک کا نہیں، دونوں کا تھا مہاتما گاندھی کی نظر پڑی اس کے کھدر کے کپڑوں پر نہیں۔ اس کے صاف ستھرے دل پر اور انہوں نے اسے اٹھالیا۔ یہ نوجوان مہاتما گاندھی کے ساتھ گھومتا رہا۔''[1]

اگر چہ وہ ذاتی طور پر کاہل تھے لیکن دوسروں کی مدد کے لے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ وہ گاندھی جی کے سچے بھگت تھے گاندھی کے انتقال کے بعد محمود احمد ہنر انہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ انہوں بہت سے رسالوں میں کام کیا تھا مثلاً شاہکار، نیا ہند، مایا اور منوہر کہانیاں وغیرہ مزید یہ کہ انہوں نے ''فسانہ'' کے نام سے افسانوی ادب کا ایک رسالہ نکالا تھا۔ انہوں نے پنڈت سندر لال کے ماہنامے ''نیا ہند'' میں بھی کام کیا تھا۔ دراصل یہ اس وقت کا ایک واحد اور خاص رسالہ تھا۔ جس میں اردو وہندی دونوں زبانوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو کے عظیم افسانہ نگاروں مثلاً احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی کہانیوں کو ہندی میں منتقل کیا ہے۔ لیکن انہوں نے کبھی خود کی شہرت نہیں چاہی بلکہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیے۔

''دنیا میں خاموشی سے کام کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ اور شاید یہ دنیا ان کی بدولت ہی چل رہی ہے۔ عمارتیں اپنے کام سنگ بیناد پر قایم رہتی ہیں۔ اور شاید یہ دنیا ان کی بدولت ہی چل رہی ہے۔ عمارتیں اپنے سنگ بنیاد پر قایم رہتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سنگ بنیاد دکھائی نہیں دیتے۔ اور دکھائی اس وقت دیتے ہیں جن عمارت گر جاتی ہے۔ ہاں تو محمود احمد ہنؔر ایسی ہی اینٹوں میں سے تھے جو بڑی عمارتوں کو قائم رہنے

---

[1] چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵، ص: ۴۹

میں مدد دیتے ہیں ۔وہ نیا ہند میں کام کرتے تھے ۔فرصت کے اوقات
میں اردو کی کہانیوں کو ہندی میں منتقل کرتے تھے۔.....جہاں تک مجھے
معلوم ہے اردو ہندی میں اس کام میں پہل محمود احمد ہنؔر نے کی۔'' [۱]

جب پرویز صاحب ناگپور سے سیاست سے کنارکشی اختیار کرکے الہ آباد آ گے تھے۔اس قت ان کے پاس کوئی روزگار نہیں تھا تو احمد ہنؔر صاحب نے ہی ان کی مدد کی تھی اور انہی کے توسط سے پرویز صاحب کو انیس الرحمٰن کے رسالے ''نئی زندگی'' میں ملازمت ملی۔گویا ہر احمد ہنر بہت ہمدرد شخص تھے ہر کسی کی مدد کرتے تھے۔ ان کی ذات کے حوالے سے اطہر پرویز رقمطراز ہیں کہ:

''محمود احمد ہنؔر عبارت تھے شرافت ،سادگی ، بے تکلفی ،محنت ، بے لوث
،خدمت اور خوش طبعی اور انسان دوستی سے۔ایسی خوبیاں جب کبھی آپ کسی
ایک انسان میں دیکھیں تو سمجھ لیں کہ ہنؔر کچھ ایسے ہی ہوں گے۔'' [۲]

احمد ہنؔر صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ مشترکہ تہذیب کو کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے۔انہوں نے اردو ادیبوں کو ہندی ادب میں بھی مقبولیت دلانا میں خاصی محنت کی۔اس طرح سے الہ آباد کی تہذیبی زندگی کو پروان چڑھانے میں ان کا ہاتھ پیش پیش رہا ہے ۔انہیں الہ آباد اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب سے والہانہ محبت تھی۔انہوں نے اس مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھنانے میں خاصا رول ادا کیا ہے اس حوالے سے پرویز صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''آیئے ہم آپ ہندی اور اردو کے ملانے والے پل کی مرمت کرلیں۔
جس میں ہنر کی موت سے کچھ دراڑیں پڑ گئیں ہیں۔ہنر نے اس پل کو
مضبوط کرنے میں اپنے تن من اور دھن کی بازی لگا دی تھی ۔لیکن یہ
بات یاد رکھنے کی ہے کہ تہذیبیں ایسے ہی آگے بڑھتی ہیں۔'' [۳]

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۵۰

[۲] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۵۵

[۳] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۵۶

تیسرا مضمون ''ایک رہنما.....ایک انسان....'' ہے۔ پرویز صاحب نے یہ مضمون سر عبدالرزاق محمد کے متعلق لکھا تھا۔ پرویز صاحب چوں کہ معلم تھے اور اس سلسلے میں وہ کئی بار وہ موریشس بھی گئے اور وہاں اردو زبان و ادب کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہاں انہیں بہت سے عزیز دوست ملے۔مثلاً عنایت حسین عندن، عبدالرحمان عثمان، محمود احمد ہنر اور عبدالرزاق محمد کا شمار بھی پرویز صاحب کے دوستوں میں ہی ہوتا تھا۔ محمد عبدالرزاق ایک بے باک لیڈر اور ہمدرد قوم تھے۔ وہ ۱۹۲۵ء کو موریشس میں آئے اور ۵۳ برسوں تک موریشس کی عوام کی خدمت کی۔ یہ مضمون مصنف کی موریشس کی یادوں پر مبنی ہے۔ محمد عبدالرزاق بھی اطہر پرویز کی طرح بے باک لیڈر تھے۔ انہوں نے اردو ادب کی بے لوث خدمت کی۔ پرویز صاحب کی طرح ہی انہیں اردو زبان سے بہت محبت تھی اور طلباء کے ہمدرد بھی تھے۔ جیسا کہ پرویز صاحب ان کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''جب میں سر عبدالرزاق محمد سے ملا تو مجھے اپنی اس عادت کا عکس ملا۔ سر عبدالرزاق محمد کو جو کہنا ہوتا تھا بے تکلف کہتے تھے۔.........موری شس میں مسلمانوں نے ان کو عزت اور وقار دیا۔.........موری شس کے مسلمانوں نے سر عبدالرزاق کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا، یہ بات میں محاورہ کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ باتیں آنکھوں دیکھی ہیں۔ وہ عوام کے کندھوں پر بیٹھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کی۔ وہ ان کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کا ہر لفظ مسلمانوں قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔[1]

اطہر پرویز نے موریشس میں اردو زبان و ادب کو ترقی دینے کے لیے محمد عبدالرزاق سے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہاں اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد میں لوگ موجود ہیں تو یہاں اردو کا ایک ادراہ قائم ہونا چاہیے۔ اس طرح اردو کے فروغ کے عظیم مقصد کے تحت ''دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ'' کا افتتاح ۱۸ دسمبر

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۶۰/۵۹/۵۸

۱۹۷۰ء کو ہوا۔ اور سر محمد عبدالرزاق ہی اس ادارے کے پہلے سرپرست بنے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''موریشس میں ہر زبان کا ادارہ ہے۔ ہندی، تامل، تیلگو، مراہٹی، لیکن ۱۹۷۰ء سے پہلے اردو کا کوئی نمائندہ ادارہ نہ تھا۔ جب میرے یہاں سے جانے کے تھوڑے دن رہ گئے تو میں نے سر عبدالرزاق سے کہا'' دیکھئے اس جزیرے میں تیلگو بولنے والے بہت تھوڑے ہیں لیکن اپنی زبان اور تہذیب کو فروغ دینے کے لیے'' آندھرا مہا سبھا'' بنالیا ہے۔ اردو بولنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے پھر بھی ان کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔'' [۱]

موریشس میں عبدالرزاق نے بھی اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ ضرورت مند طالب علموں کی بھی مدد کیا کرتے تھے اور ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ اطہر پرویز رقم طراز ہیں کہ:

> ''وہ اردو پڑھنے کے لیے لڑکے لڑکیوں کی مالی امداد کرتے تھے۔ میرے ذمے انہوں نے یہ خدمت سپرد کی تھی کہ جب کوئی امتحان دینا چاہے تو میں اردو کی کتابوں اور دوسرے ضروری اخراجات کے لیے رقم کی سفارش کردوں۔ اور یہ بات راز میں راز رکھوں کہ وہ کسی کی مالی امداد کرتے ہیں۔ یہ رقم وہ اتنے چپکے سے دیتے تھے کہ صرف وہی ہاتھ جانتا تھا جس سے وہ چک پر دستخط کرتے تھے۔'' [۲]

ان کی خدمات کے باعث موریشس کے لوگ انہیں بہت عزت واحترام سے یاد کرتے رہے گے۔ مصنف نے ان کی موت کے منظر کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ'' سر عبدالرزق اپنے عوام کے کندھوں پر چلے جارہے تھے۔ انہیں اب ہاتھوں کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی جن لوگوں کو وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ انہیں بھول گئے ہیں وہ زاروقطار رورہے تھے۔ وزیراعظم سے لے کر عام آدمی تک سب اشکبار تھے۔ شاید محبت کبھی نہیں مرتی یہ کسی مخصوص لمحے میں چنگاری کی طرح دب جاتی ہے اور پھر اچانک شعلہ بن کر بھڑک اٹھتی ہے۔

۱۔ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۶۰

۲۔ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۶۱

الغرض مضمون کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس مضمون کو صنف ''یادیں'' میں ہی شمار کیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں مصنف نے عبدالرزاق، اور اپنی ذات کے تعلق سے اور جگہ جگہ الہ آباد اور موریشس وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر بخوبی احساس ہوتا ہے کہ یہ مضمون بھی صنف ''یادیں'' کے زمرے میں ہی شامل ہوتا ہے۔

چوتھا مضمون ''جانکی اماں'' ہیں دراصل یہ بھی ان کی یادوں کا ایک اہم کردار ہے۔ اطہر پرویز کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور تھا۔ لیکن غدر کے بعد ان کے آباء اجد مستقل طور پر رہائش کے لیے الہ آباد آگے تھے۔ الہ آباد مشترکہ تہذیب کا گہوراہ تھا۔ اس مضمون میں مصنف نے غدر سے پہلے اور بعد کی تہذیب کی نمائندگی کی ہے۔ جانکی اماں کے حوالے سے اس وقت امیر غریب، ذات پات، دھرم مذہب کی کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ پورا معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتا تھا ایک دوسرے کے رسم و رواج میں خوشی خوشی شامل ہوتے تھے۔ اور جو معاشرے کے ضرورت مند لوگ تھے ان کی بھی سب مل کر ہی مدد کرتے تھے۔

جانکی اماں بھی الہ آباد میں پرویز صاحب کے ہی محلے میں رہتی تھی۔ وہ صفدر میاں کی بیوی تھی جن کا انتقال جوانی میں ہی ہو گیا تھا۔ جانکی اماں کی دو بیٹیاں تھیں۔ اور وہ پچیس چھبیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی اگر چہ محلے والوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیں لیکن اس نے نہیں کی۔ اور محنت مزدوری کرنے کر کے اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھرنے کا ادراہ کیا۔ اس واقعے کا ذکر مصنف ان لفظوں میں کیا ہے کہ:

> ''پوری زندگی اپنے دونوں ہاتھوں سے کام کیا۔ لیکن ان کو کسی کے سامنے دراز نہیں کیا اور نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ایک ٹوکرا اٹھالیا اور سودا سلف بیچنا شروع کیا۔ ہوسکتا ہے کسی نے دبی زبان سے کہا بھی ہو کہ مولوی صفدر کی عزت خاک میں مل گئی، لیکن جس عورت نے پردہ چھوڑا تھا، گھر کی ڈیوڑھی سے باہر قدم نکالا تھا، اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس نے چند ہی روز میں یہ ثابت کر دیا کہ عزت سفید کپڑوں میں نہیں، لمبی

چوڑی باتیں بنانے میں نہیں، بڑے بڑے کاروبار کرنے میں نہیں بلکہ
اپنے ہاتھوں سے کنواں کھودنے اوراس سے پانی پینے میں ہے۔'' ۱

جانکی اماں کو پورے محلے کے لوگ مانتے تھےاور وہ ان کی بہت عزت واحترام کرتے تھے۔ محلے کے تمام بچے ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کو گھر سے ہی اس بات کی ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ ان کی عزت کریں۔ مثلاً:

''ہم سب بچپن میں جہاں مولوی اسماعیل کی ریڈریں، بغدادی قاعدہ، کلام پاک، اور گلستان وبوستان سعدی پڑھایا گیا تھا وہاں ہماری گھٹی میں یہ ڈال دیا گیا تھا کہ جانکی اماں سے محبت بھی کریں اوران کی عزت بھی۔'' ۲

جانکی اماں طرح طرح کی چیزیں بیچتی تھی اوراپنے خریداروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اور پوری ایمانداری کے ساتھ اپنا سامان فروخت کرتی تھیں۔ مثلاً:

''ان کے خریداروں کو جس چیز کی ضرورت ہوتی، جانکی اماں کی دکان میں وہی سودا ہوتا۔ کیا چیز تھی جو ان کےٹوکرے میں جگہ نہ پاتی ہو۔ پان، چھالیاں، کتھا، گوشت، انڈا، جلیبی، پاپڑ، کباب، مونگ پھلی، دال سیو، کپڑوں کی چپنیں بیلیں... معمولی روزمرہ کے استعمال کا کپڑا، اور افضل کے پھل پھلاری۔'' ۳

محلے کا ہر گھر جانکی اماں کو اپنے گھر کا فرد سمجھتا تھا۔ گھروں میں بڑے بڑے کاموں کا مشورہ ان سے لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ مصنف لکھتے ہیں کہ:

''جانکی اماں کی حیثیت ہر گھر میں اس کے ایک فرد کی سی تھی۔ اسی لیے

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،اطہر پرویز، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۷۰

۲ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،اطہر پرویز، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۷۰

۳ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،اطہر پرویز، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۷۱

کسی گھر کی کوئی بات ان سے چھپی ہوئی نہ رہتی۔ لڑکے لڑکیوں کی منگنی کرنے سے پہلے گھر کی بیبیاں، ان کی رائے ضرو لیتیں۔ اور جب وہ ہری جھنڈی دکھا دیتیں تو بات آگے بڑھتی۔ یہ لوگ اپنے گھر کی ہر بات ان سے بتانا اپنا فرض سمجھتیں۔ بقول ہماری والدہ کے، دائی کے سامنے کون پیٹ چھپاتا ہے۔ جانکی اماں ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتیں۔'' [۱]

لیکن افسوس تب ہوتا جب جانکی اماں جنھوں نے کبھی خیرات نہ لی محنت سے پیسے کمائے اور اپنی بیٹیوں کی اولاد پر خرچ کیے۔ لیکن وقت کی ستم ظرفی دیکھئے کہ جب وہ عمر داز ہوگئیں اور اپنے ہوش وحواس سے عاری تھیں تو ان کے گھر والوں نے ہی ان سے بھیک مانگوائی۔ جیسا کہ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

'' وہ اپنی پائی پائی لڑکیوں کی اولاد پر خرچ کر دیتیں، اور جب معذور ہوگئیں تو اللہ کا نام لیتیں، اور اللہ ان کو اس کا معاوضہ دیتا۔ ایک روز الہ آباد سے خط آیا کہ جانکی اماں مرگئیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مرتو بہت پہلے گئی تھیں۔ اس سانحے سے پہلے کہ ان کے عزیزوں نے ان کو سڑک کے کنارے بیٹھا دیا تھا.... اس وقت تو محض ان کو دفنانے کی رسم ادا کی گئی۔'' [۲]

گویا جانکی اماں کے حوالے سے مصنف نے اس گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ جو کہ ہزار ہا برسوں سے ہندوستان کی پہچان رہی ہے لیکن اب دھیرے دھیرے ختم ہوتے ہوئے نظر آتی ہے۔ مصنف کی یہ تحریر بھی حقیقت پر ہی مبنی ہے۔

پانچواں مضمون ''شوکت علی خاں'' اس کو خاکے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے مطالعے سے شوکت علی خان کی شخصیت سے بخوبی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کی ذات، مزاج، عادات سے پوری طرح آگاہی ملتی ہے۔ شوکت علی خان رامپور کے رہنے والے تھے اور انہیں رامپور سے والہانہ محبت تھی لیکن

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۷۶

۲ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۸۳

روزگار کے سلسلے میں انہیں اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر دہلی رہنا پڑا تھا جس بات کا انہیں بہت دوکھ تھا۔ دراصل شوکت علی خان جامعہ میں ڈائیور تھے۔ ان کو جامعہ کے ملازمین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جانا ہوتا تھا۔ گویا جو بھی ان کی گاڑی میں بیٹھتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ جیسا کہ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''شوکت علی خاں سے باتیں کر کے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ محض باتیں بھی انسانوں کے زخموں کو مندمل کر سکتی ہے۔ شوکت علی خاں نے باتوں باتوں میں ہمارے کتنے گھاوؤں پر مرہم لگایا تھا۔ اس کا اندازہ ان ہی لوگوں کو ہوسکتا ہے۔.....جو شوکت علی خاں کی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔'' [۱]

اس زمانے میں اکثر ملازمین کی تنخواہیں کم ہوتی تھیں۔ شوکت صاحب سب کے غموں کو دور کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''وہ بڑا عجیب زمانہ تھا۔ تنخواہ کم اور کام زیادہ۔ شوکت علی خاں کی بدولت یہ وقت بڑی اچھی طرح کٹتا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کو خوش رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ہنسی اور قہقہے مفت بٹتے تھے۔ چھوٹے بڑے امیر غریب کسی کا زمانہ امتیاز نہ تھا۔ ہر شخص ان سے مٹھی بھر قہقہے لے لیتا۔ اور انہیں دیکھ کر اپنے دکھ درد اور پریشانیوں کو تھوک دیتا۔ جیسے کوئی کڑوی چیز تھوکتا اور ذرا سی دیر میں منھ کا ذائقہ بدل جاتا۔'' [۲]

گویا مضمون ''شوکت علی خاں'' کو ایک کامیاب اور بھرپور خاکہ کہا جاسکتا ہے۔ گرچہ اس میں بھی مصنف کی یادوں کی ایک ہلکی سے ریل پیل دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن یہ ایسا مضمون ہے جس کو خاکہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۸۹

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۹۴/۹۵

چھٹا مضمون ''چھتاری'' ہے یہ بھی پرویز صاحب کی طلب علمی کی یادوں پر مبنی ہے۔ مضمون کے نام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ چھتاری صاحب کی شخصیت پر لکھا گیا ہے لیکن جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو پرویز صاحب کے طالب علم کے زمانے کی ڈھیروں یادوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ دراصل پرویز صاحب کو علی گڑھ آنے سے پہلے علی گڑھ اور یہاں کی مشہور شخصیات سے محبت ہو گئی تھی۔ الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ کے دوران پرویز صاحب نے میگزین کے جبلی نمبر میں چھتاری صاحب کی تصویر دیکھی تھی۔ تب سے ہی وہ ان کے شیدائی ہو گئے تھے۔ پھر جب انہوں نے انہیں علی گڑھ آ کر دیکھا تو اس محبت میں اور اضافہ ہو گیا۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''الہ آباد میں صدیق احمد صدیق مرحوم ...علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سابق نائب صدر یا سکریڑی ..صدیق صاحب میرے یہاں مقیم تھے یہ میگزین یونین موصوف نے مجھے تحفتًہ دیا تھا۔ اس وقت میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ یہ میرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پہلا تعارف تھا۔ اس میگزین میں متعدد تصویریں تھیں لیکن سب سے نمایاں تصویر نواب صاحب چھتاری ہی کی تھی۔'' [1]

چھتاری صاحب کو بھی علی گڑھ سے والہانہ محبت تھی۔ وہ یو پی کے پہلے گورنر اور پہلے وزیر اعلیٰ تھے۔ اس کے بعد وہ کئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ لیکن ان کو سب سے زیادہ خوشی تب ہوئی۔ جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ جیسا کہ مصنف رقم طراز ہیں کہ:

> '' آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا کر میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔ اس سے پہلے مجھے یو پی کا گورنر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت میں یو پی کی تمام یونیورسٹیوں کا کا چانسلر بن گیا۔ جب میں حیدر آباد کا وزیر اعلیٰ کے منصب سے تھا لیکن مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا میرے لیے عزت بھی ہے اور فخر بھی ہے کہ میں اس اعلیٰ تعلیمی ادارے کا ایک طالب علم بھی رہ چکا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے یونیورسٹی کی

---

[1] چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۹۸

صفائی کا کام بھی دے دیا ہوتا تو میں اسے خوشی سے قبول کرتا اور اس پر
بہت ناز کرتا'' [۱]

علی گڑھ کے طالب علم اور اساتذہ سب ہی ان سے محبت کرتے تھے۔ان کو بہت عزیز رکھتے تھے نواب صاحب یونیورسٹی کے معمولی جلسوں میں بھی بڑی خوشی کے ساتھ شرکت کرتے ۔اس حوالے سے اطہر پرویز رقمطراز ہیں کہ ذاتی طور پر مجھے یہ سعادت حاصل رہی ہے کہ ۲۔اکتوبر ۸۰ءکو وایس چانسلر سید حامد صاحب نے مجھے ہدایت دی کہ میں گاندھی جینتی کے موقع پر یونیورسٹی کے جلسے میں تقریر کروں۔نواب صاحب بھی اس جلسے کی صدارت کررہے تھے مجھے اپنی تقریر تو یاد نہیں۔لیکن نواب صاحب نے اس ضعیف العمری میں بھی ایسی پرروز تقریر کی جو آج بھی ذہن میں تازہ ہے ہال میں سناٹا تھا۔میں نے پہلی بار دیکھا کہ لوگ ہمہ وتن گوش کیسے ہوتے ہیں۔استاد اور طالب علم ایک ہی کیفیت میں مبتلا تھے۔نواب صاحب نے جب یہ شعر پڑھا۔

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کہ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے

الغرض اس مضمون کو پڑھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بھی یادوں کا ایک سلسلہ امڈ آیا ہے جس کے مطالعے سے پرویز صاحب کے علی گڑھ کے طالب علمی کے زمانے کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

کتاب میں شامل ساتواں مضمون ''رشید احمد صدیقی'' ہے پرویز صاحب کو اپنے اساتذہ میں سے رشید احمد صدیقی سے بہت انیست تھی ۔اور رشید صاحب بھی ان کو عزیز رکھتے تھے۔ان کو اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے۔انہوں نے پرویز صاحب کی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کی ہے۔رشید صاحب کو علی گڑھ سے بہت محبت تھی اس بات سے ہر شخص واقف ہے اور ان کی تحریروں سے بھی علی گڑھ کی محبت جھلکتی ہے۔مثلاً

''رشید صاحب علی گڑھ کے عاشق تھے۔علی گڑھ انہیں دل و جان سے
پیارا تھا۔انہوں نے ۳۴ سال کی اس ادارے کی خدمت کی ۔وہ ۱۹۵۸ء
میں اپنے منصب سے سبکدوش ہوئے۔لیکن علی گڑھ ان سے نہ چھوٹا۔علی
گڑھ ان کے لیے ایسا کمبل تھا جسے وہ خود چھوڑ نا نہیں چاہتے تھے۔انہیں

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۰۲

حکومت نے بڑے بڑے اعزازات سے نوازا لیکن وہ علی گڑھ سے باہر قدم نہ نکال سکے۔ساہیتہ اکیڈمی کا انعام لینے کے لیے وہ دہلی نہیں گئے بلکہ ساہیتہ اکیڈمی کو خود اپنے پاؤں سے چل کر علی گڑھ آنا پڑا۔انھوں نے علی گڑھ کی سرزمین کو ملکِ سلیمان پر ترجیح دی۔وہ علی گڑھ کی مٹی سے مرنے کے بعد بھی لپٹے رہنا چاہتے تھے اور بالآخر وہ اسی کا ایک حصہ بن گئے ۔انھوں نے اپنی موت سے پہلے وصیت کی تھی کہ ان کی لاش کو نیا نہیں بلکہ دھلا ہوا کفن دیا جائے کیونکہ یہ حضرت عمر کی روایت کی پیروی تھی۔'' [۱]

ان کی اکثر تحریروں میں علی گڑھ کا ذکر ملتا ہے علی گڑھ ان کے خون میں رچ بس گیا تھا۔انھوں نے ہر پیاسے طالب علم کی مدد کی اور اس کو علم کی دولت سے مالا مال کیا۔انھوں نے اکثر طلباء کو اپنے گھر پر رکنے کے لیے جگہ دی اور ان کی رہنمائی کی ۔اکثر اپنے شاگردوں کی خبر گیری کرتے اور اپنے زمانے کے قصے سناتے ۔جیسا کہ پرویز صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''یہ میرا علی گڑھ کا تعلق چالیس سال کا ہے اس سے پہلے کا علی گڑھ میں نے رشید صاحب کی آنکھوں سے دیکھا اور اسے بعد کا اپنی آنکھوں...'' [۲]

رشید صاحب خود بھی روایت اور تہذیب کے پابند تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی علی گڑھ کی روایات کی پابندی کرنے کی تلقین کرتے تھے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''غرض اس عہد کی کیا کیا باتیں بتاؤں ۔زمانہ گزر گیا ..علی گڑھ کے در و دیوار آشنا ہیں.....اب بھی برے بھلے ہم سب ان ٹریڈیشنوں کو یاد کر لیتے ہیں اور کبھی کبھار ان کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے ۔رشید صاحب کی تحریروں میں ایسی کتنی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔آج بھی لڑکے

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ،اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۰۵

۲ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ،اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۱۰

ہوسٹلوں میں ان کی تلاوت کرتے اور سر دھنتے ہیں....رہائشی ہالوں میں جلسے بھی ہوتے ہیں۔ان روایات کی بازخوانی ہوتی ہے اور حسرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔اور عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے پیش روں کی روایات کو پھر تازہ دم کر دیں کہ علی گڑھ سچ پوچھئے تو ان ہی روایات کا دوسرا نام ہے۔'' [1]

پرویز صاحب رشید صاحب کی یاد میں لکھتے ہیں کہ:

''رشید صاحب نے ادبی محفل میں اپنی زبان سے ہمیشہ ایک فضا قائم کی۔ ان کے فقروں کی گونج یونیورسٹی کی عمارتوں میں آج بھی جذب ہے۔ ان کی کتابیں برابر ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جائیں گی۔ علی گڑھ ہمیشہ ان کا ذکر رہے ہے وہ یقیناً بھیانک ہے۔ہم اردو والوں کو رشید صاحب کے بغیر جینا ہوگا لیکن ان کی تصانیف ہماری رہنمائی کریں گے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ 'موت العالِم موت العالَم' عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔'' [2]

اطہر پرویز کا بچپن الہ آباد میں گزرا۔اسی لیے ان کی یادوں کے زیادہ تر کردار الہ آباد شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔خاص طور پر ان کا مضمون ''ایک بستی ایک تہذیب'' جس میں انہوں تلازمہ خیال کی مدد سے مختلف اشخاص کا ذکر کیا ہے۔اس مضمون میں اس عہد کی تہذیب کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔مثلاً

'' ہندوالے ٹولے میں مینا پور کے پیرزادوں کی بڑی عزت تھی۔ ہندوانے ٹولے کی جوان لڑکیاں حکیم صاحب کے یہاں نبض دکھانے جاتیں۔ ننھے ننھے بہن بھائیوں کو حکیم صاحب سے پھنکوانے کے لیے آتیں۔اور حکیم صاحب ان سے گھر کے لوگوں کی خیریت پوچھتے۔اور

---

[1] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،بہ اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۱۵

[2] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،بہ اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۱۵

> سب کو دعائیں کہلاتے۔ہمیں اس فضا میں کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں کا
> کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔اب کبھی کبھی سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے
> کہ صحیح قومی یک جہتی اسی کو کہتے ہیں۔'' ۱

پرانی تہذیب کا عکس نمایاں ہوتا ہے مولوی صاحب کا دن کا وقت عام طور پر وہیں گزرتا شام کو مینا پور کے اپنے حجرے میں یا پھر اسی بڑے پتھر کے پاس جو یہاں کے بڑے بوڑھوں کی بیٹھک تھی۔

انہوں بعض اشخاص کا ذکر کر کے الہ آباد کی تہذیب وتمدن کی عکاسی کی ہے۔تقسیم ہند سے پہلے ہندو مسلمان بہت پیار محبت سے رہتے تھے۔انہوں نے عید کا منظر،حکیم صاحب کے مطب خانے وغیرہ کا بھر پور ذکر کیا ہے۔لیکن پھر تقسیم نے سب کو توڑ کر رکھ دیا۔اس مضمون کا آخری اقتباس تقسیم کے درد کی بھر پور عکاسی کرتا ہے۔'' آج مینا پور وہ مینا پور نہیں ہے۔۴۷ء کے بعد اجڑا اور پھر بسا۔اب وہاں نہ مولوی حیدر خاں نظر آتے ہیں اور نہ حکیم احسن...کچھ ٹوٹے پھوٹے مکان البتہ ان مکینوں کی یاد دلاتے ہیں اور وہاں زمین پر مٹی کے ابھرے ہوئے تودے جو تودے سے زیادہ قبرستان معلوم ہوتے ہیں...قبرستان ایک تہذیب کا قبرستان....''

اس طرح برسوں سے پھلتی پھولتی گنگا جمنی تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔جس کا شکار سماج کے معصوم لوگ ہوئے۔اور آج تک اس نقصان کی بھرپائی نہیں ہو پائی۔

آٹھواں مضمون ''قدسیہ آپا'' ہے قدسیہ زیدی کرنل بشیر حسین زیدی کی اہلیہ تھی۔جو کہ ایک ادیبہ، ڈرامہ نگار خاتون تھیں۔وہ مدتوں نئی دلی میونسپل کمیٹی کی رکن رہیں تھیں۔اور اس حیثیت سے انہوں نے اس شہر کی اور اس کے باسیوں کی خدمت ہمیشہ کی ہے۔ان کے تعلقات پرویز صاحب سے بہت گہرے تھے پرویز صاحب ان کی شخصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> '' آج قدسی آپا کو رخصت ہوئے کتنے سال ہو گئے۔لیکن ان کی صورت
> ان کے جاننے والوں کی آنکھوں سے کبھی نہیں مٹ سکتی۔وہ جب بھی
> تہذیب،شرافت،نیکی،سچائی،دردمندی اور انسان دوستی کو یاد کریں گے

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ رو،بہ اطہر پرویز،مرتبہ سیما پرویز،براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۱۲۵

،قدسیہ آپا کی شکل آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی۔ یہ تمام صفات علیحدہ
علیحدہ مل جاتی ہیں، لیکن ان کا کسی ایک میں جمع ہو جانا بڑی بات تھی۔
ان کی موت نے بہتوں کو بے آسرا اور یتیم کر دیا۔ ان کی یاد سے آج
تقویت ملتی ہے۔ اگر کسی کی یاد ہی سہارا دیتی ہے تو اس کی بڑائی میں کس
کو شبہ ہو سکتا ہے جب کوئی اچھا کام کرنے کا خیال آتا ہے تو قدسیہ
آپا بہت یاد آتی ہیں۔ جب کوئی بیدست و پا نظر آتا ہے، تو قدسیہ آپا کے
نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ جب کوئی المناک حادثہ پیش آتا ہے تو
نظریں کسی کو خلا میں تلاش کرتی ہیں۔ اس معاشرے میں دوسروں کے
کام آنے والے گنے چنے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بھی ہوتا تو ان اس تک
ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی۔ میں اس لیے انھیں قلندر کہتا ہوں کہ محلوں کی
دیواریں انھیں محصور نہ کر سکیں۔ آزاد روحیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وی کتنی
عظیم تھیں، لیکن انھیں اپنی عظمت کا احساس نہ تھا۔'' [۱]

قدسیہ زیدی کو جو لوگ جانتے تھے وہ انہیں پیار سے قدسیہ آپا بلاتے تھے۔ وہ بہت ذہین اور محنتی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی بہت کام کیا۔ اور بلا تکان انہوں نے زندگی کی جدوجہد کی یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ادیبہ تھیں، ڈرامہ نگار ڈرامہ آرٹیسٹ تھیں اور ایک زمہ دار خاتون تھیں وہ اپنے کام کو عبادت کی طرح پورے تن من دھن سے انجام دیتی تھیں۔ اس حوالے سے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''میں نے بہتوں کو کہتے سنا ہے کہ کام عبادت ہے۔ لیکن قدسیہ آپا کو سچ مچ
عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ بڑے خشوع وخضوع سے عبادت کرتی تھیں۔
ہمہ تن عبادت کرتی تھیں۔ ان کی فطری زندگی سادگی اور شخصی پاکیزگی،
تقدّس پیدا کر دیتی تھی۔ وہ محض کسی کام کو اپنے ذمے نہ لیتی تھیں، انھیں تو
دھین سوار ہو جاتی تھی۔ پھر وہ نہ دن دیکھتی تھیں نہ رات۔ سردی دیکھتی

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو بہ، اطہر پرویز، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۱۴۰

تھی نہ گرمی بس وہ کام میں لگ جاتی تھیں ۔ ہر چیز سے بے خبر اور جب
تک اسے ختم نہ کر لیتی تھیں، چین سے نہ بیٹھتی تھیں۔ کام ان کے سامنے
ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتے۔ لیکن ان کے کام کبھی ختم نہ ہوتے۔'' ۱

آخر میں مصنف نے قدسیہ زیدی کی خدمات کو یاد کر کے اب یہ ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے کہ ہم بھی ان کی طرح کام کریں۔ ان کے نقش قدم پر چل کر دوسروں کے کام آسکیں۔ مضمون کا آخری اقتباس بھی اہمیت کے حامل ہے ملاحظہ ہو۔

'' قدسیہ آپا نے اپنے فرائض بڑی اچھی طرح ادا کیئے۔ انھوں نے
زندگی کو بڑے سلیقے سے برتا اب دیکھنا ہے کہ ہم کس حد تک ان کے
حقوق کو اپنے فرائض میں بدلتے ہیں ۔ اردو زبان و ادب سے محبت
کرنے والوں کو قدسیہ آپا کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس ہے
۔ قدسیہ آپا محض ایک فرد نہیں، ایک تہذیب تھیں ۔ اگر ہم اپنے آپ کو
مہذب کہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اس تہذیب کی قدروں کو پہچاننا
سیکھیں ، کیونکہ قدروں کا احساس اور ان کی شناخت انسان کو اشرف
المخلوقات بناتی ہیں۔'' ۲

کتاب میں شامل آخری مضمون '' پوچھتے ہیں وہ کہ'' ہے جو اطہر پرویز نے علی گڑھ کی مشہور و معروف شخصیت آل احمد سرور کے متعلق لکھا ہے۔ آل احمد سرور مفکر ادیب، تنقید نگار اور اعلیٰ پائے کے استاد بھی تھے۔ اور پرویز صاحب اسکول کے زمانے سے ہی ان کے مداح تھے۔ جب علی گڑھ آئے تو ان کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ بڑی ہی عقیدت و محبت سے سرور صاحب کا ذکر کرتے ہیں کہ:

'' سرور صاحب ۱۹۷۳ء میں ایک طویل خدمت کے بعد سبکدوش ہوئے۔
یونیورسٹی کے استاد اور دانش رو کی ایک شاندار شبیہ۔ تہذیب، شائستگی،
شرافت، مروت، دلداری نے ایک پیکر اختیار کر لیا ہے اور اسے آل احمد

---

۱ چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۱۲۹

۲ چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سمیا پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۱۴۰

سرورؔ بھی کہہ سکتے ہیں ۔اللہ تعالیٰ ان کا سایہ بہت دنوں تک ہمارے سروں پر رکھے۔''[۱]

عہد سرور کے کارناموں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ:

''سرور صاحب نے اپنی صدارت کے دوران شعبہ اردو میں بعض بڑے اہم کام انجام دیئے ۔۱۹۶۶ء میں جدیدیت پر پہلا سیمینار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوا۔اس کے علاوہ بھی متعدد سیمینار ہوئے ۔سرور صاحب کے زمانے میں شعبہ اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اردو ہندی کے ممتاز ادیب برابر علی گڑھ آتے رہے ۔ یہ روایت آج تک قائم ہے۔''[۲]

مضمون کے مطالعے سے کہیں بھی یہ نہیں لگتا کہ یہ خاکہ ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے ایک عالمانہ مضمون کسی اہم نے اہم کے لیے لکھا گیا ہے جس سے ہلکا سا سرور صاحب کا عکس بھی جھلکتا ہے اور اس زمانے کا شعبہ اردو علی گڑھ، مسلم، یونیورسٹی وغیرہ جگہوں کا جلوہ بھی دیکھائی دیتا ہے۔

علی گڑھ سے علی گڑھ تک:

یہ اطہر پرویز کی ''یادیں'' پر مبنی دوسری کتاب ہے۔ جو مقبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے اس وقت تحریر کی جب وہ موریشس میں تھے ۔ان کی طبیعت خراب تھی جیسا کہ وہ خود رقم طراز ہیں کہ:

''میں نے یہ کتاب موریشس کے ایک کلینک میں بستر پر پڑے پڑے نرسوں سے چھپ چھپا کر لکھی ۔دل کا دورہ پڑا ہوا تھا موت کی پرچھائیاں نظر آرہی تھیں۔سوچا چلتے چلاتے ایک آخری کتاب لکھ ڈالوں ۔ظاہر ہے میرے لیے علی گڑھ سے بہتر کوئی اور موضوع نہیں ہوسکتا چنانچہ لکھنا شروع کردیا۔ پہلے تو میرے ذہن میں ایک مضمون کا خاکہ تھا لیکن

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۴۸

۲ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۴۷/ ۱۴۸

پھر یہی ہوا کہ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ۔ بات پھلتے پھلتے ایک کتاب
کی شکل اختیار کر گئی۔'' [۱]

کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' ۱۹۷۷ء میں مکتبہ جامعہ سے منظر عام پر آئی ۔ ان کی یہ کتاب ان کی دوسری تصانیف سے مخصوص اور منفرد قسم کی کتاب ہے ۔ یہ کتاب ۲۳۰صفحات پر مشتمل ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ علی گڑھ پر لکھی گئی ہے ۔ انہوں نے یونیورسٹی سے قریب ایک بازار شمشاد کے نام سے مشہور ہے اس کو موضوع بنا کر اپنے ادراے ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' کی یادوں کو لکھا ہے ۔ یہ مارکیٹ یونیورسٹی سے بہت قریب ہے ۔ یونیورسٹی کے شاگرد، اساتذہ ہر وقت اس مارکیٹ میں نظر آتے ہیں ۔ اور سیاسی، سماجی اور ادبی ہر مسئلے پر یہاں گفتگو ہوتی ہے ۔ لہذا انہوں نے شمشاد مارکیٹ کی تقریباً تمام دکانوں کی تفصیل بہت دلچسپ انداز میں پیش کی ہے جس میں یادوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے ۔ انہوں کئی دکانداروں مثلاً ولی محمد، جبار، نواب صاحب، اسدیار خاں، صابری، میاں خاں، لالہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور اپنے دوستوں مثلاً اختر الایمان، مجاز، خورشید الاسلام، معین احسن جذبی، جاوید کمال حبیب تنویر اور راہی معصوم رضا کے حوالے سے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں، نیز طالب علموں کا بھی ذکر کیا ہے اس کے علاوہ مصنف نے اپنے اساتذہ مثلاً پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، لفٹنٹ حمید الدین خاں، رشید احمد صدیقی کے متعلق بھی دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں ۔ بشیر حسین زیدی جنہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے ۔ وہ اس کتاب کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

''یہ کتاب صرف شمشاد مارکیٹ ہی کی نہیں بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی کی
تہذیبی زندگی کی بھی داستان ہے ۔ اس میں جو کردار ہیں وہ جیتے جاگتے
ہیں ۔ اس میں ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو آج بھی ہمارے درمیان
موجود ہیں ۔'' [۲]

مذکورہ کتاب کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں شامل تمام کردار حقیقی ہیں ۔ اور صنف ''یادیں'' کے لیے شرط ہی یہی ہے کہ جو کچھ تحریر کیا جائے وہ حقیقت پر مبنی ہو اور لکھنے والے کا اس واقعہ، مقام، یا شخص سے کوئی جذباتی تعلق ہو ۔ جیسا کہ مصنف خود لکھتا ہے کہ:

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۷

[۲] چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۶

''یہ کہانی میں نے خود نہیں لکھی ۔ یہ مجھ سے شمشاد نے لکھوائی اس میں
مبالغہ نہیں ہے ۔ میں نے ادب کی تخلیق کے جذبے سے لکھا ہوتا تو مجھے
مبالغہ کی ضرورت ہوتی ۔ افسانویت پیدا کرنے کی خواہش ہوتی ۔ میں
نے ایک بازار اور ایک ادارے سے متعلق چند افراد آپ کے سامنے
کھڑے کردیئے ہیں تو کہیں بٹھا دیئے ہیں ۔'' [1]

اسی لیے ان کی یہ تصنیف ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' کو اردو ادب میں صنف ''یادیں'' پر لکھی گئی پہلی کتاب قرار دیا جاسکتا ہے ۔ گرچہ اس سے قبل جوش ملیح آبادی کی خونوشت ''یادوں کی برات'' اور مسعود مختار کی ''آواز دوست'' میں یادوں کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں ۔ لیکن صحیح معنوں میں صنف ''یادیں'' پر ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' پوری اترتی ہے یہ کتاب یادوں پر زیادہ موضوع ومناسب تصنیف ہے ۔

جس وقت مصنف نے اس کتاب کو تحریر کیا اس وقت وہ خود نہیں جانتے تھے کہ اس کتاب کو ہیئت کے کس خانے میں جگہ دی جائے ۔ کیوں کہ اس وقت صنف ''یادیں'' کا تعارف نہیں ہوا تھا ۔ اس حوالے سے پرویز صاحب خود رقم طراز ہیں کہ:

''ادب کو خوردبین سے دیکھنے والوں کے لیے یہ مسئلہ سامنے آئے گا کہ
اس کو کس خانے میں رکھیں ۔ دراصل یہ تحریر کسی ہیئت کی پابند نہیں ہے ۔
اس میں کردار ضرور ہیں ، واقعات بھی ہیں ۔ شمشاد کے پس منظر میں علی
گڑھ مسلم یونیورسٹی کی زندگی کی عکاسی بھی ملتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود
یہ ناول نہیں ہے یہ یونیورسٹی کا تذکرہ بھی نہیں ہے اور نہ اس کو پڑھ
کر یونیورسٹی کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے ۔ اس میں
کردار محض اتفاقیہ طور پر کسی سے مماثلت نہیں رکھتے بلکہ یہ زندہ کردار
ہیں ان میں سے سب گوشت پوست کے انسان ہیں ۔ ان میں سے
بیشتر آج بھی زندہ ہیں ۔ آپ ان سے چاہیں تو مل بھی سکتے ہیں ۔ اس

---

[1] چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۲۲

لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کتاب کو کس ہیئت کے خانے میں رکھوں۔ اگر ان کرداروں میں آپ کو کوئی خاص بات نظر آئے۔ واقعات میں کوئی نیا پن ہو۔ اندازِ بیان اور اسلوبِ بیان میں کوئی جاذبیت ہو تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ دراصل اس کتاب میں کوئی بات بھی تخیلی نہیں ہے۔ کوئی واقعہ بھی فرضی نہیں ہے۔ زیب داستان کے لیے کہیں کچھ بڑھایا نہیں گیا ہے۔ اس میں بیان میرا ہے باقی سب کچھ دوسروں کا ہے۔'' [۱]

ایک اور جگہ اس طرح سے پرویز صاحب کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

''یہ کہانی میں نے خود نہیں لکھی۔ یہ مجھ سے شمشاد نے لکھوائی اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ میں نے ادب کی تخلیق کے جذبے سے لکھا ہوتا تو مجھے مبالغہ کی ضرورت ہوتی۔ افسانویت پیدا کرنے کی خواہش ہوتی۔ میں نے ایک بازار اور ایک ادارے سے متعلق چند افراد آپ کے سامنے کھڑے کر دیئے ہیں تو کہیں بٹھا دیئے ہیں۔'' [۲]

زیر بحث کتاب کے شروع میں مصنف نے شمشاد مارکیٹ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ پرویز صاحب بیس سال تک شمشاد میں رہے ہیں۔ اسی لیے وہ شمشاد کی ہر ہر چیز سے بخوبی واقف تھے۔ آفتاب احمد خان کے صاحبزادے شمشاد خاں نے یہاں بہت عرصہ پہلے کچھ دکانیں تعمیر کروا کے شمشاد مارکیٹ کی بنیاد رکھی تھی۔ جو اب تک چل رہی ہے اس کے بعد اس مارکیٹ نے بہت ترقی کی، اب یہاں ہر چیز کی دکان آپ کو دیکھنے کو ملے گی۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بازار نہیں ایک گھر ہے تلے اوپر کے بہن بھائی یہاں رہتے ہیں جو لڑتے بھڑتے اور پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ لالہ سے حبیب صاحب کا لاکھ اختلاف ہو لیکن حبیب صاحب یہ ہرگز پسند نہ کریں گے کہ گوکلا

---

۱ چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۲۲

۲ چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۲۳

چوراہے کا نام بدل دیا جائے۔
شمشاد ایک قسم کا ' واہٹ اوے لیڈ لا' ہے ایک سپر مارکٹ ہے۔ جہاں
ہر چیز مل جاتی ہے جس کی یہاں کے رہنے والوں یونیورسٹی کے استادوں
اور طالب علموں کو ضرورت ہوسکتی ہے۔آپ کسی شہر میں جائیں تو آپ کو
مختلف چیزوں کے مختلف بازاروں کے چکر لگانے پڑیں گے کیوں کہ یہ
زمانہ 'اسپشلائزیشن' کا ہے لیکن شمشاد چوں کہ جدید نہیں ہے۔اس لیے
اشیاء خانوں میں نہیں بانٹی جاتیں۔'' [۱]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ کیوں کہ یہ ملک کا وہ واحد ادارہ ہے جہاں ہر طرح کے مسئلے پر بات ہوتی ہے۔ چاہے وہ سیاسی ہو سماجی ہو معاشی ہو یا اقتصادی غرض ہر طرح کے مسئلے پر یہاں آواز اٹھائی جاتی ہے۔ پرویز صاحب اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

''یوں تو یہ ایک یونیورسٹی ہے جہاں بہت سے طالب علم پڑھتے اور
اساتذہ تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں لیکن یہ دراصل اس ادارے سے
متعلق تہذیب کا نام ہے'' [۲]

اس کتاب میں مصنف نے جہاں اردو ادب کی نامور شخصیات مثلاً حبیب تنویر، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، مجاز لکھنوی وغیرہ کا ذکر کیا ہے وہی شمشاد کے عام دکانداروں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مرکزیت شمشاد مارکیٹ کو حاصل ہے۔اسی لیے مصنف نے شمشاد مارکیٹ کو بنیادی موضوع بنایا کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یادوں کو تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''شمشاد کو میں علی گڑھ کی نبض کہتا ہوں اور علی گڑھ کے قلب پر آپ
ڈاکٹری آلہ لگا کر ہندو مسلمانوں کے دل کے مرض کو سمجھ سکتے ہیں۔......
علی گڑھ کسی ایک فرد سے عبارت نہیں یہ مراد ہے ایک مختلف النوع
تہذیب سے'' [۳]

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو بہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۷
[۲] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو بہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۰
[۳] چہرہ بہ چہرہ روبہ رو بہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص:۱۲/۱۳

اس کتاب میں مصنف نے مختلف النوع واقعات کو جگہ دی ہے کہیں مشترکہ تہذیب دیکھائی گئی ہے تو کہیں اساتذہ کی فکر کہیں دوستوں کی محبت غرض ہر طرح کے قصے پڑھنے کو ملتے ہیں۔اصل میں پرویز صاحب مشترکہ تہذیب کے دلدادا تھے۔اور علی گڑھ میں اونچ نیچ ،ذات پات ،امیر غریب ، ہندو مسلم میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ بلکہ سب مل جل کر ایک جھٹ ہو کر رہتے تھے۔مثلاً :

''شمشاد میں ہندو اور مسلمان مِل جُل کر رہتے ہیں۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہیں۔اس کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ اگر آپ رام داس کو کٹھ پلے کے اس پار جانے کے لیے کہیں تو وہ ہرگز تیار نہ ہوگا۔رام داس اپنی ٹوٹی پھوٹی دکان میں مست ہے۔ممکن ہے کٹھ پلے کے اس پار اس کا کاروبار بہت اچھا چلے لیکن وہاں شمشاد کے لوگ کہاں ہوں گے بشیر صاحب کے ساتھ شطرنج کیسے کھیلی جائے گی۔''[۱]

پرویز صاحب نے اس کتاب میں جو واقعات خود سننے اور دیکھیے وہ بھی بیان کیے ہیں۔اس کے علاوہ جو واقعات انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنے ہیں وہ بھی رقم کیے ہیں۔مثلاً :

''میرے رفیق دوست منظر عباس نقوی اپنے امروہے کے ایک دوست ظہیر حسن کا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ وہ ایم اے کی تیاری کر رہے تھے لیکن ان کی مالی حالات اچھے نہ تھے۔یہ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ذاکر صاحب ان دنوں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ایک روز ظہیر حسن ذاکر صاحب کے پاس وائس چانسلر فنڈ سے امداد کی درخواست لے کر پہنچے۔ذاکر اس وقت جلالی موڈ میں تھے برس پڑے آپ حضرات کو لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے وقت ندامت محسوس نہیں ہوتی۔آپ یہ نہیں کرتے ذرا سی محنت کر کے کچھ روپیہ کمائیں اور اس ذلت سے بچیں

---

۱ چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۱۷

سودرسوروپے کے لیے میرے پاس چلے آتے ہیں۔شام کے وقت محنت کیجیے۔اپنے قوتِ بازو سے روپیہ کمائیے اور اپنے ضروری اخراجات پورے کیجیے۔خوانچہ لگائیے۔پان بیچیے الغرض کچھ تو کیجیے۔کام کرنے میں بے عزّتی نہیں ہوتی۔بے عزّتی ہوتی ہے ان ہاتھوں کو دوسروں کے سامنے پھیلانے میں۔ظہیرحسن اس وقت تو چپ چاپ چلے آئے لیکن انھوں نے طے کرلیا کہ اب وہ کسی پاس درخواست لے کر نہ جائیں گے۔جیسے تیسے امتحان ختم ہوگیا۔انھوں نے چھٹیوں میں اسکیم تیار کرلی اور یہیں شمشاد میں لکڑی کی ایک دکان کھڑی کرلی۔یہ دکان آج بھی موجود ہے۔آپ میکڈانلڈ کی طرف سے جائیں تو پہلی دکان جو پان بیڑی سگریٹ کی دکان کے داہنی جانب ہے۔وہی ہے جوظہیرحسن نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔یہ گے لارڈ المعروف 'بہ ولی محمد ہوٹل' کے پاس ہے۔جب دکان تیار ہوگئی توظہیرحسن ذاکرصاحب کے پاس گئے اور روداد سنائی اور یہ درخواست بھی پیش کردی کہ 'میری خواہش ہے کہ اس کا افتتاح آپ کے مبارک ہاتھوں سے ہو' ذاکرصاحب ششدر رہ گئے لیکن انھوں نے ظہیرحسن کی آنکھوں میں مومن کی جھلک دکھائی دی اور انھوں نے یہ درخواست منظور کرلی۔اگلے دن شمشاد کی پہلی دکان تھی جس کا افتتاح یونیورسٹی کے کسی وائس چانسلر نے کیا۔ذاکرصاحب نے ظہیر حسن کو اس دکان میں بٹھایا اور ان کے ہاتھوں سے پان بنوا کر حاضرین کو کھلائے اور اپنی جیب سے اس کی قیمت ادا کی۔اس کے بعد دریافت کیا کہ 'میاں اس میں کل کتنا خرچ آیا ہے'۔ظہیرحسن نے حساب لگا کر بتایا کہ تقریباً سوروپے نکالے اور فرمایا کہ 'بھائی اس کا آدھا حصہ مجھے

دے دو' البتہ ہفتے کے ہفتے مجھے باقاعدہ اس کا حساب دکھاؤ کہ کیا آمدنی ہوئی۔ پائی پائی کا حساب رکھنا۔'' [۱]

علی گڑھ کی روایت رہی ہے کہ یہاں بہت سے اساتذہ اپنے شاگروں کی فیس اپنے تنخواہ سے ادا کرتے تھے۔ گرچہ کرنل بشیر حسین زیدی نے اس پر احتجاج کیا۔ اور استادوں کی ہمدردی میں ایک حکم نامہ جاری کیا کہ آئندہ یونیورسٹی کے استادوں کی ضمانت نہ قبول کی جائے گئی۔ لیکن اساتذہ کو یہ بات اچھی نہ لگی انہوں شکایت کی۔ اور علی گڑھ میں اساتذہ اور شاگردوں کا یہ تعلق اب تک قائم ہے۔ اور آخر میں زیدی صاحب بھی اس جذبے کے قائل ہو گے تھے۔ مثلاً:

'' زیدی صاحب اپنے وائس چانسلر کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے اسٹاف کلب میں اپنی الوداعی تقریر میں فرمایا کی علی گڑھ سے میں جو یادیں لے کر جارہا ہوں ان میں استادوں اور شاگردوں کا یہ رشتہ ہے۔ جو بے حد مضبوط اور عدیم المثال ہے۔ میں جانتا تھا کہ تنخواہیں قلیل ہیں اور یہ سالانہ رقم جو ان کی تنخواہوں سے وضع ہوتی ہے بہت زیادہ ہے لیکن میں اس جذبے کی قدر کرتا ہوں جو روپے پیسے سے بالاتر ہے۔'' [۲]

علی گڑھ ان لڑکوں کا گھر اور شمشادان کا ڈرائنگ روم کم ڈائنگ روم ہے۔

پرویز صاحب نے یونیورسٹی کے استادوں کا خاص طور پر وائس چانسلر صاحبان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ اور ان کے عہد کے کارناموں کا بھی تفصیلاً جائزہ لیا ہے۔ تا کہ معلوم ہو جائے کس وائس چانسلر کے عہد میں کیا کیا اہم کام انجام دئے گئے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے کرنل بشیر حسین زیدی کے بارے میں تفصیلاً لکھا ہے کہ:

''(کرنل بشیر حسین زیدی) کو علی گڑھ والے اپنا ''شاہجہاں'' کہتے ہیں۔ علی گرح کی نشاۃ الثانیہ میں زیدی صاحب کے آنے کے بعد ہی تعمیر کا یاک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے زمانے میں آزاد لائبریری، کینڈی ہاؤس،

---

[۱] چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۱۴/ ۱۵/ ۱۶۔

[۲] چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ، اطہر پرویز، مرتبہ سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی ص: ۳۵

آرٹس فیکلٹی ،وائس چانسلرس لاج ،اسٹاف کلب ، ویمنس کالج کی نئ
عمارت،انجینئرنگ کالج اور پالی ٹکنیکلی نئ عمارتیں،ویمنس پالی ٹکنیک۔
سروجنی نائیڈو ہال،فزکس ڈپارٹمنٹ اور متعدد ہوسٹل تعمیر ہوئے اور میڈیکل
کالج کی تعمیر کا کا بھی شروع ہوگیا تھا۔یہ بات مشہور تھی کہ جس راستے سے
زیدی صاحب کی گاڑی گزر جاتی تھی اگلے روز وہاں پیمائش کا کام شروع
ہوجاتا تھا غرض اس علی گڑھ کی مٹی میں زیدی صاحب اپنی زندگی کت
بہترین لمحات ہی نہیں بلکہ اپنی سب سے قیمتی شے رکھ کر چلے گئے۔''[۱]

پرویز صاحب نے شمشاد کے بعض دکانداروں کا نقش ایسا کھینچا ہے گویا وہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ان دکانداروں کی خوبی اور کمی کے بارے میں بھی بتایا ہے۔جیسے امین دکاندار کے متعلق لکھتے ہیں پہلے یہ خود شمشاد میں دکان چلاتے تھے پھر ان کی طبیعت خراب ہوئی اور بعد میں ان کے بیٹے نے ان کی دوکان کو سنبھالا۔وہ اپنے زمانے میں شمشاد کے خبری تھے ہر ایک خبر ان کے پاس موجود ہوا کرتی تھی۔ان کے متعلق پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''امین صاحب شمشاد کی نبض کو خود پہنچانتے تھے۔وہ شمشاد کا چلتا پھرتا
گزٹ تھے۔ان کی خبر رساں ایجنسی ہر وقت پر پہنچا دیتی تھی چاہے وہ
ہندو پاک جنگ ہو یا فرقہ وارانہ فساد۔ان کے پاس ہر وقت خبر موجود
رہتی تھی۔''[۲]

اسد یار خاں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔یہ ان کے شاگرد بھی تھے اور بعد میں اچھی خاصی بے تکلفی ہوگی تھی۔انہی کے کہنے پر بعد میں پرویز صاحب نے اردو کی مشہور شخصیات منٹو،کرشن چندر اور بیدی کے بعض معروف افسانوں کو مرتب کر کے شائع کروایا۔ان کے متعلق پرویز صاحب اس طرح سے رقم طراز ہیں کہ:

''اسد یار خاں شمشاد کے اچھے بُرے کے برابر کے شریک ہیں۔یہ نہیں
کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھوتھو۔جب بھی کوئی چھوٹا موٹا

۱؎ علی گڑھ سے علی گڑھ تک،ڈ کٹر اطہر پرویز،اردو گھر علی گڑھ،ص:۶۵

۲؎ علی گڑھ سے علی گڑھ تک،ڈ کٹر اطہر پرویز،اردو گھر علی گڑھ،ص:۷۰

جھگڑا ہوتا ہے تو فریقین پولیس کے پاس جانے کے بجائے اسد یار خاں
کے پاس جاتے ہیں۔........جھگڑوں کو بنیادی طور پر چھوڑانا اسد یار خاں
کے ذمے ہے۔ وہ یہ کام کرتے ہیں کبھی دھمکی سے، کبھی محبت سے، وہ
خوب جانتے ہیں کہ کس کے لیے اپنے ترکش سے کون سا تیر نکالنا
چاہیے۔ یونیورسٹی سے ایم کام کر چکے ہیں۔'' [۱]

اسد یار خاں کی دوکان پر شام کو اردو ادب کے اکثر ادیبوں کی رونقیں ہوتیں تھیں۔ میکش بدایونی، محمد فاروق اور محمد اقبال وغیرہ ہر شام شمشاد تشریف لاتے ہیں ۔ یہ بازار دراصل تہذیبوں کا سنگم ہے۔ یہاں ہندو مسلم رسم رواج، روایات اور تہذیبیں مل کر بڑی ہوئی تھیں۔ بشیر صاحب اور کشن سنگھ کی دوستی ہندو مسلم اتحاد کا بہترین نمانہ ہے۔ اسی لیے یہاں بعض لوگ اپنے سرکاری ملازمت چھوڑ کر بھی دوکان چلاتے تھے، بعض ایسے بھی تھے کہ جن کو پتا تھا کہ اگر وہ شمشاد کے سوا کسی اور بازار میں اپنی دوکان لگائے تو وہ زیادہ نفع دے گئی۔ لیکن اس کے باجود کوئی شمشاد کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دکاندار غفور میاں تھے جن کا ذکر پرویز صاحب نے ان لفاظ میں کیا ہے کہ:

''غفور میاں نے کچھ دنوں انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر میں بھی
ملازمت کی۔ لیکن انھوں نے شادی اس وقت کی تھی جب فیملی پلاننگ کا
کوئی چرچا نہ تھا اس لیے انجمن ترقی اردو کی قلیل تنخواہ پر اپنے بال بچوں
کا پیٹ نہ بھر سکتے تھے انھوں نے بہت جلد یہ ملازمت چھوڑ دی۔ یہ
زمانہ خوبوزوں کی فصل کا تھا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ غفور میاں زمین
پر خربوزروں کا ڈھیر لگائے دو آنے سیر دو آنے سیر چلاّ رہے ہیں۔ اس
میں کچھ منافع نے حوصلہ افزائی کی اور باقی کسیر جو اس عمل میں مزا آیا۔
اس سے پوری ہوئی۔ پھر تو بشیر صاحب کی دکان 'فرینڈس بک ہاؤس'
کے سامنے ان خربوزوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ لوگ جوق در جوق آتے

---

[۱] علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ڈاکٹر اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ، ص:۹۱/۹۲

تھے۔غفور میاں میٹھے بول کے عادی ہیں اس اور سونے پر سہاگا کا کام
کیا۔ بشیر صاحب فرینڈس بک ہاؤس کے اندر بیٹھنے کے کے بجائے
کرسی بچھا کر باہر بیٹھنے لگے۔حسبِ اشتہار خربوزے بھی کھاتے تھے۔
اور جب غفور میاں کو کاروبار سے فرصت ملتی تو ان سے باتیں بھی کرتے
تھے۔'' [۱]

بعض دکاندار ایسے بھی تھے کہ جن کا شمشاد میں کاروبار نہیں چلا۔ بلکہ انھیں نقصان اٹھانا پڑا۔لیکن ان کو ایسے کارفرما مل جاتے جیسا کہ ایک واقعہ پرویز صاحب نے زکاء اللہ نام کے ایک دکاندار کا واقعہ پیش کیا ہے کہ انہوں نے کسی شخص کی تصنیف کے ایک ہزار کی تعداد میں چھپوائی۔اور وہ کتاب یونیورسٹی کے نصاب سے برخاست ہوگی۔ پھر انہوں نے اس آدمی سے معاوضے کا تقاضا بھی نہیں کیا۔اور اگر کوئی کہتا کہ میاں 'تم تو اپنی مزدوری لے لیتے تو اس پر وہ جواب دیتے کہ میری تو محنت تھی سو پچاس کا کاغذ اور لیئ تھی اس بے چارے کی تو پوری جمع پونجی لگی ہوئی تھی وہ اتنا بڑا نقصان برداشت کر رہا ہے تو کیا میں اتنا بھی نہیں کرسکتا'' یہ تھیں وہ روایات جن سے شمشاد عبارت تھا اسی لیے یہاں سے کوئی جانا نہیں چاہتا تھا بلکہ یہاں ایک دوسرے سے ہمدردی، ایک دوسرے کے دوکھ میں سب شریک ہوتے تھے۔

شمشاد کی دوسری خوبی یہ تھی کہ یہاں قومی یکجہتی، ہندو مسلم بھائی چارہ، کی ایک نمایاں تصوریر ملتی ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''شمشاد مارکیٹ کے خردیدار طالب علم ہوں یا یونیورسٹی کے کے اسٹاف
کے لوگ، یہ دکانوں کے درو دیوار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ام کا رشتہ تو
انسانوں سے ہے جو ان دکانوں میں بیٹھتے ہیں کیوں کہ اس بازار میں
بعض دکانیں تو ایسی ہیں جو درودیوار سے قطعاً بے نیاز ہیں لیکن ان
دکانوں میں بیٹھنے والے اس بازار کے معزز دکاندار سمجھے جاتے ہیں۔

---

[۱] علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ڈاکٹر اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ،ص:۱۰۰

پرویز صاحب سیکولرزم کے ماننے والے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کوشمشاد کی
زندگی زیادہ متاثر کرتی تھی۔'' [1]

ایک نیاز دکان والا ہے بہت پڑھا لکھا تھا۔جس کو تقریباً چھ زبانیں آتی تھی۔اس کے متعلق پرویز صاحب اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''(نیاز بھائی) یہ بے درو دیوار کی دکان ہے۔لیکن خوب چل رہی ہے۔ کیوں کہ شمشاد میں یہ اکیلی دکان ہے جو انٹرنیشنل ہے۔اس لیے کہ نیاز بھائی اپنے گاہکوں سے ان کی مادری زبانیں گفتگو کرتے ہیں ۔ان کو ہفت زبان کہنا بھی ان کی استعداد کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتا۔ یہ انگریزی ،فرانسیسی ،روسی ،عربی ، فارسی ،تھائی کے علاوہ افریقہ کی متعدد زبانوں سے واقف ہیں غرض جس زبان کا گاہک ہوتا ہے اس سے اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شمشاد انٹرنیشنل شاپنگ سنیٹر ہے ۔مختلف مما لک کے تقریباً ایک ہزار طالب علم ، جو علی گڑھ مسلم یو نیورسٹی میں پڑھتے ہیں،شاپنگ شمشاد میں کرتے ہیں اور نیاز بھائی کے یہاں ان کو سب سے زیادہ تسکین حاصل ہوتی ہے کہ دکاندار اس سے اس کی اپنی زبان میں گفتگو کرتا ہے اس لیے وہ فارن اسٹوڈنٹس میں بے حد مقبول ہیں۔'' [2]

فوق کریمی صاحب کی دکان میں بھی ادیبوں کو آمد ورفت ہمیشہ لگی رہتی تھی۔شاعری کی محفلیں ہوتی چائے کا دور چلتا۔اس سے شمشاد کی زندگی میں مزید رونقیں ہوتیں تھیں۔ادیب ہونے کے ناطے پرویز صاحب نے اپنے من ودل کی کھڑکی کھلی رکھی اور شمشاد کی پوری تاریخ رقم کردی۔پچیس چھبیس سال تو وہ خود شمشاد کے مکین رہے اور اس سے پہلے کے واقعات انہوں نے بزرگوں سے سنے اور پھر تحریر کرکے آگے آنے والی نسل کے لیے محفوظ کردیئے۔

---

[1] علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ڈاکٹر اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ،ص:۱۱۲

[2] علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ڈاکٹر اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ،ص:۱۵۱/۱۵۲

کہیں کہیں ہاسٹل کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلباء کی روایت رہی ہے کہ ان کے حق میں انتظامیہ کوئی فیصلہ نہ دیے یا طلباء کو اپنی کوئی بات انتظامیہ سے منوانی ہو تو وہ دھرنا دیتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کے انتظامیہ سے اپنا کام کروا لیتے ہیں، علی گڑھ کی روایات مثلاً یہاں کے جونیئز کا سنئرز کا عزت دینا، یہاں کا ہر ایک کا دوسرے کے لیے پریشان ہونا، باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا، ان تمام چیزوں کا ذکر پرویز صاحب نے بہت تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں مصنف نے اس بات کا شکوہ بھی کیا ہے کہ یہ چیزیں اب دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ اطہر پرویز کی تحریروں میں تقسیم ہند کا کرب بھی جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس تصنیف میں بھی یہ تقسیم کرب کے دردناک واقعات جا بجا ملتا ہیں۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

> ''کہتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد علی گڑھ کے پڑھے ہوئے کچھ من چلے لوگوں کا خیال پیدا ہوا کہ ایک علی وہاں بھی بنائیں۔ یہ خیال کوئی نیا نہ تھا کیوں کہ جب پاکستان بننے کا مسئلہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اٹھتا تھا تو لوگ یہ سوال مسلم لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں سے پوچھتے تھے کہ علی گڑھ کہاں جائے گا۔ یہ ہندوستان میں رہے گا، یا پاکستان میں جائے گا علی گڑھ کا نام تاج محل کے ساتھ لیا جاتا تھا کیوں کہ لوگوں کا خیال تھا کہ علی گڑھ ایک مقبرہ ہے۔ اور سچ پوچھیے تو علی گڑھ مقبرہ ہی ہے آرزوں اور امنگوں کا...... ہاں تو پاکستان بننے کے بعد یہ خیال ہوا کہ سکریٹریٹ، وائسر یگل لاج، پارلیمنٹ ہاؤس، ریڈیو اسٹیشن وغیرہ کی شاندار عمارتیں تو بن ہی جائیں گی بس روپیہ ہونا چاہیے یونیورسٹی بھی نب جائے گی لیکن علی گڑھ کیسے نبے گا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ خیال عمل کی سرحدوں میں داخل ہو گیا تھا اس جذبے کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں یہ بیل منڈھے چڑھتے نظر نہ آئی۔ اور یہ خیال بھی فضا میں تحلیل ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں شمشاد کا خیال آیا ہوگا۔ بالکل

سر سید ہال جیسی عمارت بھی بن سکتی تھی ، اسٹر یچی ہال بھی بنایا جا سکتا ہے
آسمان منزل اور مسجد بھی بن سکتی تھی ممتاز ہاؤس اور آفتاب ہوسٹل کا بننا
بھی مشکل نہ تھا۔لیکن سوال تو یہ تھا کہ شمشاد کیسے بنتا۔چوراہے میں داخل
ہوتی ہوئی لالہ کی دکان کیسے بنتی چلے آپ نے اینٹوں ، پردوں اور لکڑی
کے تختوں سے کسی طرح کام لے لیا،لیکن یہ بتایئے کہ جبار صاحب ،عطاء
اللہ، رام داس ،حبیب صاحب ،نواب صاحب اور اسد یار خاں کو کہاں
سے لائیں گے۔ وہ دھول اڑتی ہوئی فضا کہاں ملے گی ۔ظاہر ہے کہ یہ
سب کچھ نہ ہوگا تو شمشاد کہاں ہوگا اور شمشاد نہ ہوگا تو پاکستان میں
علی گڑھ کیسے بنے گا۔'' [1]

اس واقعے سے تقسیم کا کرب صاف جھلکتا ہے۔مصنف کا یہ جملہ ''سچ ہے تہذیبوں کے بننے میں بڑی مدت درکار ہوتی ہے۔تہذیبیں بنتے بنتے بنتی ہیں۔''

پرویز صاحب نے شمشاد کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی زندگی اور روایات کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں کے اساتذہ وائس چانسلروں ،طلباء وغیرہ کی زندگی کی ہر ہر پہلو سے قارئین کو باخبر کیا ہے۔ یونیورسٹی کے الیکشن کا زمانہ، یہاں کی روایات یہاں اساتذہ اور طلباء کی نوک جھوک الغرض ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور بہت ہی دلکش واقعات بیان کیے ہیں ۔جن کو پڑھ کر ہم اُس عہد کے علی گڑھ سے بھی آشنا ہوتے ہیں ۔ جو مصنف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہ بھی جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنا وہ بھی رقم کر دیا ہے۔اور مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ان کی طالب علمی ،جیل کے دن ، جامعہ میں ملازمت کے دوران کے واقعات ،الہ آباد کا زمانہ ،علی گڑھ کی ملازمت اور اپنی ادبی مصروفیات اپنے بچوں کے متعلق دوستوں کے متعلق ہر ہر پہلو سے منسلک واقعات موجود ہیں۔

پرویز صاحب کے منفرد اسلوب میں ان کی زبان کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے ۔ فارسی اور اردو ادب سے گہرا لگاؤ ،نپی تلی نثر ، منجھے ہوئے جملے ،احتیاط سے تراشی ہوئی ترکیبیں اور تاریخ وادب کے حوالے،

---

[1] علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ڈاکٹر اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ، ص: ۲۵/۲۶

ان کی تحریر کو ایک امتیازی شان عطا کرتے ہیں۔ وہی شان، جو صاحب طرز اور صاحب اسلوب نثر نگاروں کی پہچان ہوتی ہے، پھر اس پر مستزاد ہے، ان کا مدلل تجزیہ اور بے خوفی سے پیش کرنے کا دوٹوک انداز، جو ان کی تحریر کو دلبری کے ساتھ دلیری بھی دیتا ہے۔ افسوس کہ ہم نے ان کی وہ قدر نہ کی، جو کرنی چاہیے تھی۔

اس طرح سے دیکھا جائے تو ۱۹۷۵ء عیسوی سے ہی اردو ادب میں بعض ایسے تحریریں ملتی ہیں۔ جن میں صنف ''یادیں'' کے عناصر پائے جاتے ہیں جیسا کہ ''سرسیّد ہال ریویو اولڈ بوائز نمبر'' کے کم وبیش سارے ہی مضامین میں یادوں کا پہلوؤ موجود ہے۔ اس کے بعد جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' ۱۹۷۶ء چوں کہ پانچ حصوں میں منقسم ہے جس میں سے شروع کے تین حصے ان کی خودنوشت پر مبنی ہیں اور آخری کے دو حصوں میں انہوں نے اپنے عہد کی چند عظیم ہستیوں کے نجی باب کھولے ہیں۔ اسی اعتبار سے اس میں بھی یادوں پر مبنی تحریریں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ میر ولایت حسین کی تصنیف کردہ کتاب '' آپ بیتی ام۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی کہانی میر ولایت حسین کی زبانی'' بھی علی گڑھ کی یادوں پر مبنی ایک دلکش کتاب ہے۔ نیز مختار مسعود کی '' آواز دوست'' اور اس کے جواب میں لکھی گئی نسیم انصاری کی ''جواب دوست'' یادوں پر تحریر کی گئی عمدہ کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اطہر پرویز کی مشہور کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' اور ان کی دوسری تصنیف ''چہرہ بہ چہرہ روبہ روبہ'' یہ دونوں کتابیں بھی صنف ''یادیں'' پر رقم کی گئی اہم کتابیں ہیں۔ اور سید مسعود الحسن زیدی کی اہم تصنیف ''علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں'' بھی منظر عام پر آئی۔ علاوہ ازیں سید مقصود زاہدی کی کتاب ''یادوں کے سائے'' اور کے۔ ایس شفیق کی اہم کتاب ''یادوں کے راہگزر'' ان کتابوں میں بھی یادوں کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

ادھر موجودہ دور میں بہت زور وشور سے صنف ''یادیں'' پر کتابیں لکھیں گئیں ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر سلامت اللہ کی کتاب ''یادوں کے چراغ'' عارف نقوی کی کتاب ''یادوں کے چراغ'' اور ''جرمنی میں نصف صدی'' سید حشمت سہیل کی کتاب ''یادوں کی کہکشاں'' اور پروفیسر عبدالرزاق فاروقی کی تصنیف ''یادوں کے جھروکے'' اور رفعت سروش کی کتاب ''یادوں کا دریچہ'' وغیرہ کتابیں ایسی ہیں۔ جن میں صنف ''یادیں'' کے عناصر ملتے ہیں اور یہ کتابیں مقبول عام کی سند بھی حاصل کر چکی ہیں جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یادوں پر مبنی کتاب جابر حسین کی ''ریت پر خیمہ'' کو ساہتیہ اکیڈمی ایواڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ تو پھر اب تک اردو ادب

میں صنف ''یادیں'' کی شعریات متعین کیوں نہیں کی گئی ہے۔؟ جب کہ اردو ادب میں صنف ''یادیں'' پر کتابیں اس اتنی مقدار میں موجود ہیں کہ جن کی بناء پر ہم صنف ''یادیں'' کی شعریات متعین کر سکتے ہیں۔ راقمہ کی اس باب میں یہی کوشش کی ہے کہ اب تک اردو ادب میں جو بھی صنف ''یادیں'' پر مبنی کتب لکھیں گئیں ہیں۔ان کا محاکمہ پیش کیا جا سکے تا کہ اردو ادب میں صنف ''یادیں'' کی شعریات متعین کی جانے میں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔لہذا شروع سے اب تک جن کتب میں بھی یادوں کے نقوش پائے جاتے ہیں ان کا مختصراً محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور ڈاکٹر اطہر پرویز کی دو کتابوں ''چہرہ بہ چہر روبہ روبہ'' اور ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' کا خاص طور پر تفصیل سے فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو کہ یادوں پر لکھی گئی ہیں چوں کہ راقمہ کا تحقیقی مقالے کا موضوع ''ڈاکٹر اطہر پرویز کی ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' ہے اسی مناسبت سے ان کی علمی وادبی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

محاکمہ

محاکمہ

ڈاکٹر اطہر پرویز ۱۹۲۵ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا اصل نام محمد عثمان تھا لیکن وہ اپنے قلمی نام اطہر پرویز سے جانے جاتے ہیں۔ اطہر پرویز کی علمی وادبی خدمات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت کئی حیثیتوں کے مالک ہیں یعنی وہ ادیب بھی ہیں اور اس کے ساتھ معلم، محقق، ناقد اور مترجم بھی۔ اس کے علاوہ ان کی شفیق اور دل آویز شخصیت سیاست دان کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی ملک وقوم اور علم وادب کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے عظیم خدمات انجام دی ہیں جو ناقابل فراموش ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور وہیں الہ آباد سے ہی مشن اسکول سے مڈل پاس کیا اس کے بعد الہ آباد کے کرسچین کالج سے ہی انٹرمیڈیٹ ممتاز نمبروں سے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آگئے۔ یہاں فارسی ادب میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا۔ اور بعد میں اردو ادب سے بھی ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ چوں کہ پرویز صاحب طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست سے وابستہ ہوگئے تھے اور ترقی پسندوں کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ لیکن ان کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب وہ ناگپور گئے۔ وہاں مزدور تحریک میں حصہ لیا اور ایک بے باک لیڈر کے طور پر پانچ سال تک نہ صرف یہ کہ بحیثیت سیاسی لیڈر کے شہرت حاصل کی بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری بھی بنائے گئے۔ لیکن اس پانچ سال کی مدت میں انہوں نے بہت مشکل زندگی گزاری۔ کئی بار جیل بھی گئے، کچھ عرصے تک روپوش بھی رہنا پڑا، ان پر جان لیوا حملے بھی کروائے گئے، اور کئی اخباروں نے کھل کر ان کی مخالفت کی ان کے خلاف پوسٹر بھی

نکالے گئے ،غرض جب حالات زیادہ ناساز گار ہو گئے تو انہوں سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر کے جامعہ میلہ اسلامیہ کا رخ کیا۔اور چھ سال تک وہاں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ بچوں کے مشہور رسالہ ''پیام تعلیم'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔اس طرح خود کو سیاست سے الگ کر لیا اور ادبی دنیا میں مصروف ہو گئے اور تاعمر تک درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔

جامعہ ملیہ کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی بحیثیت لکچرر شپ کام کیا۔اور اس دروان کہی بار موریشس بھی گئے وہاں ٹیچرس ٹریننگ کالج میں بحیثیت ایجوکشن آفسران کا تقرر ہوا۔انہوں نے وہاں اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے ایک اردو انسٹی ٹیوٹ ''دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے قائم کروایا۔اور چند کتب استاد اور بچوں کے لیے تحریر کیں۔انہوں نے وہاں ابتدائی اور ثانوی سطح پر تعلیم وتدریس کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ان کے زمانے میں ہی ایک لسانی تحریک کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا اور آج تک اطہر پرویز کو لوگ وہاں بابائے اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔اس کے علاوہ علی گڑھ میں بھی اپنے احباب کے تعاون سے انہوں نے ''ذاکر حسین ماڈل ہائیر سکنڈری اسکول'' کھولا۔جو اب تک ہزروں طلباء علموں کو علم کی روشنی سے پرنور کر رہا ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کا بچوں کے ادب سے بھی پرُانہ رشتہ رہا ہے۔وہ بچوں کے رسالے ''پیام تعلیم'' کے مدیرہ چکے ہیں۔انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں معلوماتی مضامین اور کتابیں لکھیں۔جو قوتاً فوقتاً ''پیام تعلیم'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

انہوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور بچوں کے بہتر اخلاق اور ان کی تربیت کے خیال سے اطہر پرویز نے اخلاقی ،علمی ،ادبی اور معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں جیسے ''تبت کے رسم رواج'' ''کابل'' ''اقوام متحدہ'' ''کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو'' ''فاہیان کا سفر'' ''چائے'' ''ننھے منے پودے'' ''ہنگری کے بچے'' ''انڈونیشیا کی کچھ رسمیں'' ''لکھنے پڑھنے کی کہانی'' اور ''ہندوستان ریلوے کی کہانی''

وغیرہ اہم مضامین ہیں۔اورادب اطفال کی ہرصنف میں بچوں کے لیےان کی تحریریں ملتی ہیں جو بچوں کے پرُ تجسس ذہن کے لیے مفید معلومات فراہم کرتی ہیں۔مثلاً ''مرغی چور'' ''ایک تھے نجومی'' ''ایماندار لکڑ ہارا'' ''شیخ جی نے منت مانی'' ''بے گھڑی کے دن'' ''خالی بلی''''دو دوست'' ''بھید کی بات'' ''تین عالم ایک ملاح'' ''چالاک شہزادہ''''خوابوں کی حقیقت'' ''چینی بچوں کا تھیٹر'' اور نیکی اور سچائی وغیرہ ان کی قابل ذکر کہانیاں ہیں۔جو وقتاً فوقتاً ''پیام تعلیم'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

اس کے علاوہ ''جادو کے کھیل'' مصنوعی چاند'' ''خلا کا سفر'' اور ''گلیلی گلیلیو'' ''پودوں اور جانوروں کی دنیا'' وغیرہ سائنسی موضوعات پر دلچسپ اور کارآمد کتابیں ہیں۔نیز ''نجومی آپا'' بھی ان کی ایک دلچسپ معلوتی کتاب ہے جس میں آسان زبان اور انوکھے انداز میں جغرافیہ کی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

''پودوں اور جانوروں کی دنیا'' یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جو حیاتیات (Biology) سے عام فہم زبان میں متعارف کراتی ہے۔''چارلس ڈارون'' میں ڈارون اوراس کے نظریے سے متعارف کرایا گیا ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز ایک ذرخیز ذہن کے مالک تھے۔انہوں نے ادب اطفال پر خصوصی توجہ صرف کی۔ ان کے دو درجن کتابچے بچوں کے ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔جن میں بچوں کے لیے کہانیاں بھی ہیں، روایتی کہانیوں پر مبنی واقعات وحکایات بھی ہیں، انگریزی اور بعض دوسری زبانوں سے کلاسیکی ادب کے آسان وعام فہم زبان میں ترجمے بھی ہیں۔صحیح معنوں میں بچوں کے ادب پر لکھی ہوئی کتابیں ڈاکٹر اطہر پرویز کی مشاقی اور عام فہم زبان میں اپنی بات پہنچانے کا وسیلہ ثابت ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ادب کے بنیادی مسائل پر ''ادب کا مطالعہ'' کے نام سے کتاب لکھی تو اس کی آسان زبان اور دلنشیں اسلوب نے ان کی اس کتاب کو غیر معمولی طور پر کامیاب بنادیا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوگئے۔

اطہر پرویز نے قدیم کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ قصوں پر مشتمل بھی بعض کتابیں تحریر کیں ہیں۔جو ترقی اردو بورڈ سے شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔اس ضمن میں ''مشینی گھوڑا'' ''نائی اور رنگساز کا قصہ'' اور

''ایک دن کا بادشاہ'' اہم ہیں۔

اطہر پرویز ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے بحیثیت ناقد، مدیر اور مرتب بھی اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ داستان اور حکایت گوئی کے موضوع سے بھی ان کو خاص دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف فسانہ عجائب سے متعلق ایک کتاب ''فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ'' لکھ کر اس کا اظہار کیا۔ بلکہ داستان کے فن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا۔ انہوں نے اردو فکشن کی مشہور شخصیات کرشن چندر، بیدی و منٹو کے نمائندہ افسانوں کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اور ان پر اپنی ناقدانہ صلاحیت و قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اور بحیثیت مرتب بھی انہوں نے اپنے نمایاں نقش ثبت کیے ہیں ان کے منتخب افسانوں کے ذریعہ زندگی کے حقائق کی تفہیم میں کافی مدد ملتی ہے اور ہم زندگی کے نشیب وفراز سے بخوبی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' کے عنوان سے پریم چند سے لے کر سلام بن رزاق تک بیس افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب پیش کیا ہے اس کے علاوہ ''اردو کے تیرہ افسانے'' کے عنوان سے جو انتخاب ہے وہ بھی غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔

اطہر پرویز نے طبع زاد کہانیاں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کی کہانیوں کو بھی اردو کے قالب میں اس خوش اسلوبی سے ڈھالا ہے کہ کہانی پر طبع زاد ہونے کا گماں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایسی رواں دواں زبان اور بے ساختہ طرز بیان اختیار کیا ہے کہ کہیں بھی ترجمے کا احساس تک نہیں ہوتا ان کہانیوں کے وسیلے سے انہوں نے دوسرے ممالک کی تہذیب وتمدن اور معاشرت سے روشناس کرایا ہے۔ یعنی وہ ادب میں بحیثیت مترجم بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ''فاطمہ کی بکری'' ''نیا تیرتھ'' ''ہمارا ہندوستان'' ''ہمارا گھرانہ'' ''دیس دیس کی کہانیوں'' اور ''پنچ تنتر کی کہانیاں'' وغیرہ ان کے قابل ذکر ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہیں۔

اطہر پرویز نے اردو کے کلاسیکی سرمائے ادب کو بچوں کی ضرورت کے پیش نظر آسان وسہل اور عام فہم زبان میں از سر نو ترتیب دیا ہے۔ اور اردو ادب کے نامور ادیبوں وشعراء کے سوانحی حالات اور ان کی نظموں

،کہانیوں کو بچوں کے لیے از سر نو ترتیب دیا ہے تا کہ بچے با آسانی سے ان نظموں کا مطالعہ کر سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں کیوں کہ ان شعراء نے بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ادب اطفال میں اپنی بیش قیمت نظموں کی پیشکش سے بیش بہا اضافہ کیا ہے ان شعرواء کو بچوں کے مستقبل سے غیر معمولی دلچسپی تھی بچوں کی صحیح نہج پر تربیت اور صحیح ذہن سازی ان کا خاص مطمح نظر رہا تھا اس حوالے سے انہوں نے ''بچوں کے نظیر'' ''بچوں کے حالی'' ''بچوں کے اقبال'' ''بچوں کے اسماعیل'' ''بچوں کے چکبست''،''بچوں کی معلومات'' ''اکبر و بیربل کے لطیفے'' اور ''قصہ حاتم طوئی'' وغیرہ قابل اہم ترتیب دی ہوئی کتب ہیں۔

اطہر پرویز صاحب نے اپنی شخصیت کو یہیں تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ تا دم حیات خاکے اور انشائیہ بھی لکھے ہیں۔مثلاً ''باپو کے قدموں میں'' ''حضرت علی کا انصاف'' ''انمول رتن'' ''بچوں کی اقبال'' ''شفیع الدین نیّر'' اور ''جونپور کا قاضی'' وغیرہ قابل ذکر کتابیں ہیں۔ خاکہ اور انشائیے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی ڈرامے بھی لکھے جن میں ''شرابی'' ''چراغ سے چراغ جلتا ہے'' ہولی'' اور ''گلیلی گلیلیو'' اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر ''ڈرامہ ''گلیلی گلیلیو'' میں تو ہم پرستی اور فرسودہ عقائد پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

گلیلی گلیلیو ایک سائنس دان تھا جس نے پرانے نظریے کو دراصل صدیوں سے یہی تصور عام تھا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے لیکن سترھویں صدی میں گلیلیو نے پرانے نظریے کو رد کرتے ہوئے نئے نظریے یہ ثابت کر دیا کہ سورج نہیں بلکہ زمین ہی سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے۔لیکن ان کی یہ نئی تلاش قدامت پسندوں کے لیے یہ عقیدہ شکنی خاصی پریشان کن ثابت ہوئی اور وہ عتاب کا شکار ہوا اور اسے اپنے نظریے کی تبلیغ کرنے سے منع کر دیا گیا۔

اطہر پرویز کی مندرجہ بالا ادبی خدمات کے علاوہ ایک بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو میں کم از کم ودا ایسی کتابیں تصنیف کیں۔جن کی شناخت آج اردو کی نوزائیدہ صنف ''یادیں'' کے طور پر کی جاسکتی ہے

اس طرح سے پرویز صاحب اس صنف کے بنیاد گزاروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔اور اردو ادب کو یادوں کی نئی صنف ''یادیں'' سے بھی روشناس کرایا ہے۔لیکن اب تک چوں کہ اردو ادب کو اس صنف کو مقام حاصل نہیں ہوا۔جب کہ اس صنف پر بہت سی کتابیں وجود میں آ چکی ہیں۔انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر کی یادوں سے متعلق ایک مقبول ترین کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' اور ان کی دوسری کتاب ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' ان یادوں پر مبنی مضامین کا ایک اہم مجموعہ ہے۔جو علی گڑھ،موریشس اور ناگپور سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کی کی تصانیف وتالیفات کے اس جائزے اور محاکمے کے بعد یہ حقیقت کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں رہتی کہ ان کا علمی وادبی سرمایہ ہمارے اردو زبان وادب کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماخذ

نمبر	نام کتاب	مصنف/مرتب	مطبع/ناشر	اشاعت
۱	ادب کا مطالعہ	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۶ء
۲	ادب کسے کہتے ہیں	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۳	اردو کے تیرہ افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۴	استاد کی کتاب (برائے اردو کی دوسری کتاب)	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر علی گڑھ	۱۹۷۳ء
۵	اردو کی نئی کتاب	ڈاکٹر اطہر پرویز	اے ایم یو پبلیکیشن	۱۹۶۷ء
۶	اسکول کی فیس (ایک مزاحیہ ڈرامہ)	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۷	افغانستان	ڈاکٹر اطہر پرویز	یونیسکو اور منسٹری آف ایجوکیشن	۱۹۵۳ء
۸	اکبر اور بیربل کے لطیفے	ڈاکٹر اطہر پرویز		
۹	الف لیلی کی کہانیاں	ڈاکٹر اطہر پرویزن	(تین جلدوں) ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۱۰	انمول رتن	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۱۱	اوڈیسی	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۱۲	ایٹم کیا ہے	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۳ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
۱۳	ایک اچھوت کی کہانی	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	۱۹۶۷ء
۱۴	ایک دن کا بادشاہ	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی اردو بورڑ ،نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۱۵	ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی اردو بورڑ ،نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۱۶	ایوریسٹ کی فتح	ڈاکٹر اطہر پرویز	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۵۳ء
۱۷	باپو کے قدموں میں	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی بورڑ اردو	۱۹۵۹ء
۱۸	بچوں کی معلومات	ڈاکٹر اطہر پرویز	مکتبہ جامعہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۶۰ء
۱۹	بچوں کے اقبال	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۲۰	بچوں کے حالی	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی اردو بورڑ	۱۹۵۹ء
۲۱	بچوں کے نظیر	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۲۲	بدن کی کہانی	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر علی گڑھ	۱۹۶۶ء
۲۳	پنچ تنتر کی کہانیاں	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	۱۹۷۳ء
۲۴	پودوں اور جانوروں کی دنیا	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۲۵	توانائی کا راز	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۲۶	چار درویش	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۲۷	چارلس ڈارون	ڈاکٹر اطہر پرویز	مجلس اشاعت ادب (رجسٹرڈ) دہلی	۱۹۸۱ء
۲۸	چراغ سے چراغ جلتا ہے	اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	
۲۹	چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو	ڈاکٹر اطہر پرویز	براؤن بک پبلی کیشنز ، دہلی	۲۰۱۷ء
۳۰	چین	ڈاکٹر اطہر پرویز	یونیسکو اور منسٹری آف ایجوکیشن	۱۹۵۳ء
۳۱	خلا کا سفر	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر ،علی گڑھ	۱۹۷۱ء

۳۲	دیس دیس کی کہانیاں	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی اردو بورڑ، نئی دہلی	
۳۳	راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۳۴	روس	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۵۳ء
۳۵	روشنی کے مینار	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۳۶	ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء
۳۷	سورج کا گھرانا	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۸ء
۳۸	شرابی	ڈاکٹر اطہر پرویز	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۵۳ء
۳۹	شہر اور گاؤں	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۴۰	علی گڑھ سے علی گڑھ تک	ڈاکٹر اطہر پرویز	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	۱۹۷۷ء
۴۱	فاطمہ کی بکری	ڈاکٹر اطہر پرویز	نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا	۱۹۸۶ء
۴۲	فسانہ عجائب (مرتب)	ڈاکٹر اطہر پرویز	سنگم پبلیشنگ ہاوس، الہ آباد	۱۹۶۹ء
۴۳	قصہ حاتم طائی	ڈاکٹر اطہر پرویز	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۷۳ء
۴۴	کرشن چندر اور ان کے افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۴۵	گلیلی گلیلیو (ڈراما)	ڈاکٹر اطہر پرویز	گھر، اردو علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۴۶	محلے کی ہولی	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
۴۷	مشینی گھوڑا	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی اردو بورڑ، نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۴۸	مصنوعی چاند	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۵۹ء
۴۹	منٹو کے نمائندہ افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۵۰	نجومی آپا	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۵۷ء
۵۱	نیا ادبی نصاب	ڈاکٹر اطہر پرویز	اے ایم یو پبلیکیشن	۱۹۶۷ء
۵۲	نیا تیرتھ	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	۱۹۶۴ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
٥٣	ہمارا ذہن	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	١٩٦٤ء
٥٤	ہمارا گھرانا	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	١٩٦٥ء
٥٥	ہمارا ہندستان	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر علی گڑھ	١٩٦٨ء
٥٦	ہمارے بن ہماری دولت	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	١٩٦٣ء
٥٧	ہمارے پسندیدہ افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	١٩٨٢ء
٥٨	ہندستان ترقی کی شاہراہ پر	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علیگڑھ	١٩٦٣ء
٥٩	ہولی اور چراغ	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر، علی گڑھ	١٩٦٥ء

ثانوی مآخذ

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
١	آپ بیتی یا ام۔اے۔او کالج علی گڑھ کی کہانی میر ولایت حسین کی زبانی	میر ولایت حسین	سید ہادی حسین زیدی۔ حبیب اللہ منزل ڈگی روڈ، علی گڑھ	
٢	آواز دوست	مختار مسعود	شاہ بیگم اور شیخ عطاء اللہ ٹرسٹ	١٩٩٤ء
٣	آزادی کے بعد دہلی میں طنز و مزاح	ڈاکٹر مظفر حنفی	اردو اکادمی، دہلی	١٩٩٠ء
٤	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	اردو گھر، علی گڑھ	١٩٤٨ء
٥	ادب کا مطالعہ	ڈاکٹر اطہر پرویز	اردو گھر علی گڑھ	١٩٦٦ء
٦	ادب و کلچر اور مسائل	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ	١٩٨٨ء
٧	ادب کسے کہتے ہیں	ڈاکٹر اطہر پرویز	ترقی بورڈ، نئی دہلی	١٩٧٦ء
٨	ادب کیا ہے	مصاعد قدوائی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤ، نئی دہلی	١٠٢١ء

۹	ادبی اصناف	گیان چند جین	گجرات اردو اکاڈمی (حکومت گجرات) گاندھی نگر	۱۹۸۹ء
۱۰	اردو ادب اطفال کے معمار	ڈاکٹر خوشحال زیدی	نہرو چلڈرن اکیڈمی	۱۹۹۳ء
۱۱	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر سلیم اختر	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہو	۱۹۹۳ء
۱۲	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	کتابی دنیا دہلی	۲۰۰۴ء
۱۳	اردو ادب آزادی کے بعد	خورشید الاسلام		۱۹۷۳ء
۱۴	اردو ادب کی تاریخ	پروفیسر ضیاء الرحمان صدیقی	لاہوتی پریس، دہلی	۲۰۱۸ء
۱۵	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۹ء
۱۶	اردو ادب میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر صابرہ سعید	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۹ء
۱۷	اردو ادب میں طنز و مزاح	وزیر آغا	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۱ء
۱۸	اردو افسانہ روایت اور مسائل	پروفیسر گوپی چند نارنگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل۔ڈاکٹر نرز احمد علی مارگ، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶	۲۰۰۰ء
۱۹	اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء ۲۰۰۹ء جلد اول	مرزا حامد بیگ	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۱۴ء
۲۰	اردو ادب کی تاریخ ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۰۶ء
۲۱	اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	ادارۂ فروغ اردو لکھنو	۱۹۵۷ء
۲۲	اردو رپورتاژ	ڈاکٹر طلعت گل	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۴ء

۲۳	فسانوی ادب کی نئی قرأت	پروفیسر صغیر افراہیم	مسلم ایجوکشنل بک ہاؤس بنی اسلائیلان، علی گڑھ	۲۰۱۱ء
۲۴	اردو افسانہ ترقی پسند تحریک ست قبل ۱۹۰۱ء تا ۱۹۳۶ء	پروفیسر صغیر افراہیم	ایجوکیشنل بک ہاؤس	۲۰۰۹ء
۲۵	اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	متکبہ جامعہ، نئی دہلی لمیٹڈ	۲۰۱۸ء
۲۶	افسانوی ادب تحقیق و تجزیہ	ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی	نیو پبلیشنگ پریس، دہلی	۱۹۸۳ء
۲۷	اردو میں ادب اطفال ایک جائزہ	پروفیسر اکبر رحمانی	ایجوکیشنل اکادمی، اسلامپور، جلگاؤں	۱۹۹۱ء
۲۸	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سنبل نگار	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۵ء
۲۹	اردو میں ادبی نثر کی تاریخ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)	ڈاکٹر طیبہ خاتون	مرکری پرنٹر چوڑیولان، دہلی	۱۹۸۹ء
۳۰	اردو میں بچوں کا ادب	ڈاکٹر خوشحال زیدی	کلر پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۸۹ء
۳۱	اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	دائرہ ادب پٹنہ	۱۹۸۳ء
۳۲	اردو کے نثری اسالیب	شہاب ظفر اعظمی	بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، تراہا بہرام خاں، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۹۲	۱۹۹۹ء
۳۳	اردو کی نثری داستانیں	گیان چند جین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو	۱۹۸۷ء
۳۴	اردو تدریس فن اور جدید تقاضے	ڈاکٹر کہکشاں ظہور علیگ	جی۔این۔کے پرنٹس، نئی دہلی	۲۰۲۲ء
۳۵	اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۳ء
۳۶	اردو تنقید (منتخب مقالات)	حامدی کاشمیری	سپر پرنٹرز، دہلی، ساہیتہ اکادمی	۱۹۹۷ء

۳۷	اردوخطبات فن، روایت اور تنقیدی مباحث	ڈاکٹر عباس رضا	جی۔این۔کے پبلی کیشنز	۲۰۲۰ء
۳۸	اردوداستان: تحقیق وتنقید	قمرالہدیٰ فریدی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۰ء
۳۹	اردونثر اصناف واسالیب	قمرالہدیٰ فریدی	مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ	۲۰۰۷ء
۴۰	اردوکا افسانوی ادب (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر صغیر افراہیم	مسلم ایجوکیشنل بک پریس، علی گڑھ	۲۰۱۰ء
۴۱	اردواسالب نثر تاریخ اور تجزیہ (گیارویں صدی سے بیسویں صدی تک)	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین	جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی	۱۹۷۷ء
۴۲	اردو کی ادبی تاریخ	فاروق بوچا	دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ ،موریشش	۲۰۱۱ء
۴۳	اردونثر کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۱۴ء
۴۴	اردونثر کا ارتقاء (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک)	ڈاکٹر عابدہ بیگم	ثمر آفسٹ پریس، دریا گنج ،نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲	۱۹۸۸ء
۴۵	اردوافسانہ روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۳ء
۴۶	اردوکا داستانوی ادب	مرتب ڈاکٹر علی جاوید	اردو اکادمی دہلی	۲۰۱۱ء
۴۷	اردوداستانوں کے منفی کردار (آغاز تا ۱۸۱۰ء)	شہناز کوثر	مجلس ترقی ادب لاہور	۲۰۱۲ء

۴۸	اقبال اور بچوں کا ادب	زیب النساء بیگم	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۲۰۰۰ء
۴۹	اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ	ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان	کلاسیکل پرنٹرس، چاوڑی بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶	۱۹۸۶ء
۵۰	اردو میں تنقید	محمد احسن فاروقی	شعبہ انگریزی لکھنو یونیورسٹی	
۵۱	اردو کا ابتدائی زمانہ ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو	شمس الرحمان فاروقی	مکتبہ جامعہ نئی، لمیٹڈ دہلی	۲۰۱۱ء
۵۲	اردو زبان اور فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	دائرہ ادب، بانکی پورہ، پٹنہ	۱۹۷۲ء
۵۳	اردو کی منظوم داستانیں	فرمان فتح پوری	انجمن اردو ترقی پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی	۱۹۷۱ء
۵۴	اردو ساخت کے بنیادی عناصر	نصیر احمد خاں	اردو محل پبلکیشن نئی دہلی	۱۹۹۱ء
۵۶	اسلوب	عابد علی عابد	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۶ء
۵۷	اصناف سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۴ء
۵۸	اردو کی شعری و نثری اصناف (تحقیق و تنقید)	پروفیسر مجید بیداد	لُو لُو پرنٹرس اینڈ گرافکس، حیدرآباد	۲۰۱۴ء
۵۹	انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر محمد یٰسین	ایجوکشنل بک ہاؤس	۲۰۰۹ء
۶۰	انگریزی ترجمہ کا فن	محمد طیب دہلوی	رومانہ پبلکیشنز ۲۲۸۰، گلی قاسم جان بلیمان، دہلی	۲۰۰۲ء
۶۱	ایک بھاشا : دو لکھاوٹ، دو ادب	گیان چند جین	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۲۰۰۷ء
۶۲	انشائیہ کے خدوخال	ڈاکٹر وزیر آغا	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۹۱ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
۶۳	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر	دار الاشاعت مصطفائی، عفیف پرنٹرس، دہلی ۱۱۰۰۰۶	۲۰۱۴ء
۶۴	انشائیہ اور انشائیے	پروفیسر محمد حسنین	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۸
۶۵	اردو میں مضمون نگاری کا ارتقاء	ڈاکٹر سیدہ جعفر	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۷۳ء
۶۷	اردو نثر ایک مطالعہ	قاضی مشتاق احمد	موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲	۲۰۰۵ء
۶۸	بچوں کا ادب اور اخلاق	ڈاکٹر اسرار الحق سبیلی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۵ء
۶۹	بچوں کے ادب میں اقبال کا حصہ	شاہوار بیگم	اردو پبلیشرز ۔لکھنو	۱۹۸۲ء
۷۰	بیانیات	مرتب قاضی افضال حسین	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	۲۰۱۷ء
۷۱	بچوں کے ادب کی خصوصیات	مشیر فاطمہ	انجمن اردو (ہند) علی گڑھ، مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی	
۷۲	بیسویں صدی (نصف اوّل) کے اردو مصنفین سوانح آثار ماخذ	ڈاکٹر سنجیدہ خاتون	بھارت آفسٹ، دہلی	۲۰۰۴ء
۷۳	تاریخ ادب اردو	پروفیسر نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۴ء
۷۴	تحقیق تنقید کے مقامات اتصال			
۷۵	تحقیق کا فن	پروفیسر گیان چند جین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو	۱۹۹۰ء
۷۶	تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	۱۹۸۰ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
٧٨	تنقیدی نظریات حصہ اول	احتشام حسین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو	٢٠٠٩ء
٧٩	تاریخ ادب اردو جلد دوم	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	٢٠١٣ء
٨٠	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسنہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	٢٠٠٧ء
٨١	تاریخ ادب اردو ١٧٠٠ءتک جلد دوم	پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	١٩٩٨ء
٨٢	ترجمہ کا فن اور روایت	ڈاکٹر قمر رئیس	تاج پبلیشنگ ہاؤس ٥٨٩، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی	١٩٧٦ء
٨٣	تحقیق فکری و فنی مباحث مسائل وامکانات	مرتب پروفیسر ڈاکٹر سید جاوید اقبال	ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی	٢٠١٤ء
٨٤	تاریخ و تحقیق	الطاف حسین خان شروانی	نظامی پریس، لکھنو	١٩٨٤ء
٨٥	داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	اے۔بی۔سی۔آفسیٹ پرنٹرز حوض قاضی، دہلی	٢٠٠٧ء
٨٦	داستان تحقیق و تنقید	قمر الہدیٰ فریدی	لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ	
٨٧	داستانوی ادب: اہمیت اور افادیت	ڈاکٹر شمسہ عارف	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	٢٠٠٧ء
٨٨	داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	٢٠٥١ء
٨٩	داستان سے ناول تک (اردو کی نثری داستانیں)	پروفیسر ابن کنول	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی کتابی دنیا دہلی	٢٠٠١ء

۹۰	ریت پر خیمہ	جابر حسین	اردو مرکز، عظیم آباد ایم، آئی ،جی ملوہیا نگر، پٹنہ	۲۰۰۲ء
۹۱	زبان، اسلوب اور اسلوبیات	پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۱۱ء
۹۲	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	ڈاکٹر شارب رودلوی	اتر پردیش اردو اکادمی	۲۰۰۲ء
۹۳	جامعہ کی کہانی	عبد الغفار مدہولی	قومی کونسل بروئے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۴ء
۹۴	جواہرات نثر	سید محمد محمود رضوی	رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش آگرہ نیشنل پریس الہ آباد	۱۹۲۸ء
۹۵	جواب دوست	نسیم انصاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۸ء
۹۶	جرمنی میں نصف صدی	خالد علوی	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۴ء
۹۷	حرف شوق	مختار مسعود	براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۱۷ء
۹۸	رہنمائے نثر	ڈاکٹر خلیل احمد مشیر	سُو دیلیتھو پریس، پٹودی ہاؤس دہلی	۱۹۷۰ء
۹۹	سفینۂ نثر	سید محمد حسنین	شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی، امان وھائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا	۱۹۶۹ء
۱۰۰	سر سید ہال ریویو اولڈ بوائز نمبر	ملک خالد حسین	شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۱۹۷۵ء
۱۱۰۱	شاعری ساحری اور صاحب قرانی، جلد دوم	شمس الرحمان فاروقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۶ء
۱۰۲	قصہ حاتم طائی (آرائش محفل)	مرتب اطہر پرویز	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	

۱۰۳	طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ	خواجہ عبدالغفور	موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا کیٹ مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲	۱۹۸۳ء
۱۰۴	عام لسانیات	پروفیسر گیان چند جین	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۰۷ء
۱۰۵	علی گڑھ کی دیا دیں علی کی باتیں	مسعود الحسن زیدی	آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور	۱۹۷۷ء
۱۰۶	عیار نثر	خواجہ فراست حسین	شائع کنندگان، یونیورسٹی بک ڈپو، آگرہ	
۱۰۷	غیر افسانوی ادب ایک انتخاب	قمر والہدیٰ فریدی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۲۰۰۷ء
۱۰۸	غیر افسانوی اردو نثر	ڈاکٹر عطیہ رئیس	ایم۔آر، پبلی کشنز، نئی دہلی	۲۰۱۵ء
۱۰۹	فسانہ عجائب	رشید حسن خان	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۲۰۱۵ء
۱۱۰	فسانہ عجائب	رشید حسن خان		۱۹۹۲ء
۱۱۱	کچھ نثر میں بھی	آنند نارائین ملاّ	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۷۵ء
۱۱۲	نیا افسانہ	وقار عظیم	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۲۱۰۰۱	۲۰۱۶ء
۱۱۱۳	نیا اردو افسانہ انتخاب، تجزیے اور مباحث	مرتب گوپی چند نارنگ	اردو اکادمی، دہلی، سی۔پی۔او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶	۱۹۸۸ء
۱۱۴	نیا افسانہ مسائل اور میلانات	پروفیسر قمر رئیس	سیما آفسٹ پریس اردو کادمی، دہلی	۱۹۹۲ء

۱۱۵	نثر کی اہمیت (اور دیگر مضامین)	حُسین الحق	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۲۰۱۳ء
۱۱۶	مبادیاتِ تحقیق	عبدالرزاق قریشی	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی	۲۰۱۴ء
۱۱۷	مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات (ان کے سماجی ،سیاسی اور مذہبی افکار کے سیاسی پس منظر میں	محمد عبدالرزاق فاروقی	انجمن حیات نوشاہ پورہ گلبرکہ	۱۹۸۵ء
۱۱۸	دیباچہ انتخاب طلسم ہوش ربا	محمد حسن عسکری		
۱۱۹	ہماری داستانیں	وقار عظیم	اورینٹل کالج، لاہور	۱۹۶۴ء
۱۲۰	ہمارے نثر نگار	سیّد صفی مرتضیٰ	نسیم بک ڈپو، لکھنو	۱۹۷۴ء
۱۲۱	ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء	گوپی چند نارنگ، عبداللطیف اعظمی	ثمر آفسٹ پرنٹرز اردو اکادمی، نئی دہلی	۱۹۹۶ء
۱۲۲	یادوں کے چراغ	ڈاکٹر سلامت اللہ	غالب اکیڈمی دہلی	۲۰۰۹ء
۱۲۳	یادوں کی کہکشاں	سید حشمت سہیل	شارپ کمپیوٹرس، حیدرآباد انڈیا	۲۰۱۷ء
۱۲۴	یادوں کے جھروکے	زہرہ مسحور	صفیہ انوار شاہ گنج، جوبلی پوسٹ، حیدرآباد برانچ حسینی عالم حیدرآباد	۲۰۰۲ء
۱۲۵	یادوں کی رہگزر	کے۔ایس۔ شفیق	کمرشل بک ڈپو، چار مینار، حیدرآباد	۱۹۹۷ء

۱۲۶	یادوں کا دریچہ	رفعت سروش	اردو اکادمی، دہلی، سی۔ او۔ پی۔ بلڈنگ کشمیری گیٹ، دہلی	۲۰۱۰ء
۱۲۷	یادوں کے سائے	سید مقصود زاہدی	کاروان ادب ملتان	۱۹۷۶ء
۱۲۸	یادوں کے جھروکے	محمد عبدالرزاق فاروقی	اردو اکیڈمی عدیل کمپیوٹر گرافکس، چھتہ بازار، حیدرآباد	۲۰۰۷ء
۱۲۹	یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	مشہور آفسٹ پریس کراچی	۱۹۷۰ء

لغات

۱	نور لغات	میر نورالحسن مولوی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۱۹۹۰ء
۲	جامع فیروز اللغات	فیروزالدین مولوی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۷ء

English Books:

- ☆ https://www.ocf.berkely.edu~jfkihlstrom/memoir.htm
- ☆ https://www.supersummary.com
- ☆ https:// www.britannica.com
- ☆ https://www.thoughtco.com
- ☆ https://study.com>academy>lesson
- ☆ https://celadonbooks.com>what-is-...

رسائل وجرائد:

رسالہ	مقام اشاعت	ماہ وسن اشاعت
امروز	علی گڑھ	اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۷ء
امروز سہ ماہی	علی گڑھ	اپریل۔جون ۲۰۲۱
امروز سہ ماہی	علی گڑھ	اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۹ء
امروز	علی گڑھ	جولائی۔ستمبر ۲۰۱۸ء
ادبی میراث	https://www.adbims.com	دسمبر ۵، ۲۰۲۰ء
علی گڑھ میگزین	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۱۹۸۹ء
پیام تعلیم جلد ۳۷ نمبر ۱۳	جامعہ مکتبہ دہلی	اکتوبر ۱۹۴۶ء
پیام تعلیم جلد ۲۲ شمارہ ۷	جامعہ مکتبہ دہلی	جولائی ۱۹۸۵ء
فکروفن سہ ماہی علمی وادبی رسالہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	دسمبر ۲۰۲۰ء

اطہر پرویز کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقالہ

برائے پی ایچ-ڈی

مقالہ نگار

عشرت لطیف

نگراں

ڈاکٹر محمد خالد سیف اللہ

شعبۂ اُردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲ (انڈیا)

۲۰۲۲ء

محاکمہ

محاکمہ

ڈاکٹر اطہر پرویز ۱۹۲۵ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ان کا اصل نام محمد عثمان تھا لیکن وہ اپنے قلمی نام اطہر پرویز سے جانے جاتے ہیں۔اطہر پرویز کی علمی وادبی خدمات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت کئی حیثیتوں کے مالک ہیں یعنی وہ ادیب بھی ہیں اور اس کے ساتھ معلم، محقق، ناقد اور مترجم بھی۔اس کے علاوہ ان کی شفیق اور دل آویز شخصیت سیاست دان کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔انہوں نے اپنی زندگی ملک وقوم اور علم وادب کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے عظیم خدمات انجام دی ہیں جو نا قابل فراموش ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اور وہیں الہ آباد سے ہی مشن اسکول سے مڈل پاس کیا اس کے بعد الہ آباد کے کرسچین کالج سے ہی انٹرمیڈیٹ ممتاز نمبروں سے پاس کیا۔اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے۔یہاں فارسی ادب میں بی۔اے اور ایم۔اے کیا۔اور بعد میں اردو ادب سے بھی ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔چوں کہ پرویز صاحب طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست سے وابستہ ہوگئے تھے اور ترقی پسندوں کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔لیکن ان کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب وہ ناگپور گئے۔وہاں مزدور تحریک میں حصہ لیا اور ایک بے باک لیڈر کے طور پر پانچ سال تک نہ صرف یہ کہ بحیثیت سیاسی لیڈر کے شہرت حاصل کی بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری بھی بنائے گئے۔لیکن اس پانچ سال کی مدت میں انہوں نے بہت مشکل زندگی گزاری۔کئی بار جیل بھی گئے، کچھ عرصے تک روپوش بھی رہنا پڑا، ان پر جان لیوا حملے بھی کروائے گئے، اور کئی اخباروں نے کھل کر ان کی مخالفت کی ان کے خلاف پوسٹر بھی

نکالے گئے ،غرض جب حالات زیادہ ناسازگار ہوگئے تو انہوں سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا رخ کیا۔اور چھ سال تک وہاں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ بچوں کے مشہور رسالہ ''پیام تعلیم'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔اس طرح خود کو سیاست سے الگ کرلیا اور ادبی دنیا میں مصروف ہوگئے اور تاعمر تک درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔

جامعہ ملیہ کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی بحیثیت لکچررشپ کام کیا۔اور اس دروان کہی بار مورسش بھی گئے وہاں ٹیچرس ٹریننگ کالج میں بحیثیت ایجوکشن آفسران کا تقرر ہوا۔انہوں نے وہاں اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے ایک اردو انسٹی ٹیوٹ ''دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے قائم کروایا۔اور چند کتب استاد اور بچوں کے لیے تحریریں۔انہوں نے وہاں ابتدائی اور ثانوی سطح پر تعلیم وتدریس کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ان کے زمانے میں ہی ایک لسانی تحریک کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا اور آج تک اطہر پرویز کو لوگ وہاں بابائے اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔اس کے علاوہ علی گڑھ میں بھی اپنے احباب کے تعاون سے انہوں نے ''ذاکر حسین ماڈل ہائیر سکنڈری اسکول'' کھولا۔جو اب تک ہزروں طلباء علموں کو علم کی روشنی سے پرنور کر رہا ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کا بچوں کے ادب سے بھی پرُانہ رشتہ رہا ہے۔وہ بچوں کے رسالے ''پیام تعلیم'' کے مدیرہ چکے ہیں۔انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں معلوماتی مضامین اور کتابیں لکھیں۔جو قوتاً فوقتاً ''پیام تعلیم'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

انہوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور بچوں کے بہتر اخلاق اور ان کی تربیت کے خیال سے اطہر پرویز نے اخلاقی ،علمی ،ادبی اور معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں جیسے ''تبت کے رسم رواج''
''کابل'' ''اقوام متحدہ'' ''کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو'' ''فاہیان کا سفر'' ''چائے'' ''ننھے منے پودے''
''ہنگری کے بچے'' ''انڈونیشیا کی کچھ رسمیں'' ''لکھنے پڑھنے کی کہانی'' اور ''ہندوستان ریلوے کی کہانی''

وغیرہ اہم مضامین ہیں۔اورادب اطفال کی ہر صنف میں بچوں کے لیے ان کی تحریریں ملتی ہیں جو بچوں کے پُر تجسس ذہن کے لیے مفید معلومات فراہم کرتی ہیں۔مثلاً ''مرغی چور'' ''ایک تھے نجومی'' ''ایماندار لکڑ ہارا'' ''شیخ جی نے منت مانی'' ''بے گھڑی کے دن'' ''خالی بلی''''دودوست'' ''بھید کی بات'' ''تین عالم ایک ملاح'' ''چالاک شہزادہ'''' خوابوں کی حقیقت'' ''چینی بچوں کا تھیٹر''اور نیکی اور سچائی وغیرہ ان کی قابل ذکر کہانیاں ہیں۔جو وقتاً فوقتاً ''پیام تعلیم'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

اس کے علاوہ ''جادو کے کھیل''مصنوعی چاند'' ''خلا کا سفر''اور''گلیلی گلیلیو'' ''پودوں اور جانوروں کی دنیا''وغیرہ سائنسی موضوعات پر دلچسپ اور کارآمد کتابیں ہیں۔نیز''نجومی آپا'' بھی ان کی ایک دلچسپ معلوتی کتاب ہے۔جس میں آسان زبان اورانوکھے انداز میں جغرافیہ کی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

''پودوں اور جانوروں کی دنیا'' یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جو حیاتیات (Biology) سے عام فہم زبان میں متعارف کراتی ہے۔''چارلس ڈارون''میں ڈارون اوراس کے نظریے سے متعارف کرایا گیا ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز ایک ذرخیز ذہن کے مالک تھے۔انہوں نے ادب اطفال پر خصوصی توجہ صرف کی۔ ان کے دو درجن کتابچے بچوں کے ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔جن میں بچوں کے لیے کہانیاں بھی ہیں،روایتی کہانیوں پر مبنی واقعات وحکایات بھی ہیں،انگریزی اور بعض دوسری زبانوں سے کلاسیکی ادب کے آسان وعام فہم زبان میں ترجمے بھی ہیں۔صحیح معنوں میں بچوں کے ادب پر لکھی ہوئی کتابیں ڈاکٹر اطہر پرویز کی مشاقی اور عام فہم زبان میں اپنی بات پہنچانے کا وسیلہ ثابت ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ادب کے بنیادی مسائل پر''ادب کا مطالعہ'' کے نام سے کتاب لکھی تو اس کی آسان زبان اوردلنشیں اسلوب نے ان کی اس کتاب کو غیر معمولی طور پر کامیاب بنادیا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو گئے۔

اطہر پرویز نے قدیم کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ قصوں پر مشتمل بھی بعض کتابیں تحریر کیں ہیں۔جو ترقی اردو بورڈ سے شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔اس ضمن میں''مشینی گھوڑا'' ''نائی اور رنگساز کا قصہ'' اور

''ایک دن کا بادشاہ'' اہم ہیں۔

اطہر پرویز ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے بحثیت ناقد، مدیر اور مرتب بھی اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ داستان اور حکایت گوئی کے موضوع سے بھی ان کو خاص دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف فسانہ عجائب سے متعلق ایک کتاب ''فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ'' لکھ کر اس کا اظہار کیا۔ بلکہ داستان کے فن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا۔ انہوں نے اردو فکشن کی مشہور شخصیات کرشن چندر، بیدی و منٹو کے نمائندہ افسانوں کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اور ان پر اپنی ناقدانہ صلاحیت و قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اور بحثیت مرتب بھی انہوں نے اپنے نمایاں نقش ثبت کیے ہیں ان کے منتخب افسانوں کے ذریعہ زندگی کے حقائق کی تفہیم میں کافی مدد ملتی ہے اور ہم زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' کے عنوان سے پریم چند سے لے کر سلام بن رزاق تک بیس افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب پیش کیا ہے اس کے علاوہ ''اردو کے تیرہ افسانے'' کے عنوان سے جو انتخاب ہے وہ بھی غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔

اطہر پرویز نے طبع زاد کہانیاں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کی کہانیوں کو بھی اردو کے قالب میں اس خوش اسلوبی سے ڈھالا ہے کہ کہانی پر طبع زاد ہونے کا گماں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایسی رواں دواں زبان اور بے ساختہ طرز بیان اختیار کیا ہے کہ کہیں بھی ترجمے کا احساس تک نہیں ہوتا ان کہانیوں کے وسیلے سے انہوں نے دوسرے ممالک کی تہذیب و تمدن اور معاشرت سے روشناس کرایا ہے۔ یعنی وہ ادب میں بحثیت مترجم بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ''فاطمہ کی بکری'' ''نیا تیرتھ'' ''ہمارا ہندوستان'' ''ہمارا گھرانہ'' ''دیس دیس کی کہانیوں'' اور ''پنچ تنتر کی کہانیاں'' وغیرہ ان کے قابل ذکر ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہیں۔

اطہر پرویز نے اردو کے کلاسیکی سرمائے ادب کو بچوں کی ضرورت کے پیش نظر آسان و سہل اور عام فہم زبان میں از سر نو ترتیب دیا ہے۔ اور اردو ادب کے نامور ادیبوں و شعراء کے سوانحی حالات اور ان کی نظموں

،کہانیوں کو بچوں کے لیے از سرِ نو ترتیب دیا ہے تا کہ بچے با آسانی سے ان نظموں کا مطالعہ کر سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں کیوں کہ ان شعراء نے بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ادب اطفال میں اپنی بیش قیمت نظموں کی پیشکش سے بیش بہا اضافہ کیا ہے ان شعرواء کو بچوں کے مستقبل سے غیر معمولی دلچسپی تھی بچوں کی صحیح نہج پر تربیت اور صحیح ذہن سازی ان کا خاص مطمح نظر رہا تھا اس حوالے سے انہوں نے ''بچوں کے نظیر'' ''بچوں کے حالی'' ''بچوں کے اقبال'' ''بچوں کے اسماعیل'' ''بچوں کے چکبست''،''بچوں کی معلومات'' ''اکبر و بیربل کے لطیفے'' اور ''قصہ حاتم طوئی'' وغیرہ قابل اہم ترتیب دی ہوئی کتب ہیں۔

اطہر پرویز صاحب نے اپنی شخصیت کو یہیں تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ تادم حیات خاکے اور انشائیہ بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ''باپو کے قدموں میں'' ''حضرت علی کا انصاف'' ''انمول رتن'' ''بچوں کی اقبال'' ''شفیع الدین نیّر'' اور ''جونپور کا قاضی'' وغیرہ قابل ذکر کتابیں ہیں۔ خاکہ اور انشائیے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی ڈرامے بھی لکھے جن میں ''شرابی'' ''چراغ سے چراغ جلتا ہے'' ہولی'' اور ''گلیلی گلیلیو'' اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر ''ڈرامہ ''گلیلی گلیلیو'' میں توہم پرستی اور فرسودہ عقائد پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

گلیلی گلیلیو ایک سائنس دان تھا جس نے پرانے نظریے کو دراصل صدیوں سے یہی تصور عام تھا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے لیکن سترھویں صدی میں گلیلیو نے پرانے نظریے کو رد کرتے ہوئے نئے نظریے یہ ثابت کر دیا کہ سورج نہیں بلکہ زمین ہی سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے۔ لیکن ان کی یہ نئی تلاش قدامت پسندوں کے لیے یہ عقیدہ شکنی خاصی پریشان کن ثابت ہوئی اور وہ عتاب کا شکار ہوا اور اسے اپنے نظریے کی تبلیغ کرنے سے منع کر دیا گیا۔

اطہر پرویز کی مندرجہ بالا ادبی خدمات کے علاوہ ایک بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو میں کم از کم وہ ایسی کتابیں تصنیف کیں۔ جن کی شناخت آج اردو کی نوزائیدہ صنف ''یادیں'' کے طور پر کی جاسکتی ہے

اس طرح سے پرویز صاحب اس صنف کے بنیاد گزاروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ اور اردو ادب کو یادوں کی نئی صنف ''یادیں'' سے بھی روشناس کرایا ہے۔ لیکن اب تک چوں کہ اردو ادب کو اس صنف کو مقام حاصل نہیں ہوا۔ جب کہ اس صنف پر بہت سی کتابیں وجود میں آچکی ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر کی یادوں سے متعلق ایک مقبول ترین کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' اور ان کی دوسری کتاب ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' ان یادوں پر مبنی مضامین کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ جو علی گڑھ، موریشس اور ناگپور سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز کی کی تصانیف وتالیفات کے اس جائزے اور محاکمے کے بعد یہ حقیقت کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں رہتی کہ ان کا علمی وادبی سرمایہ ہمارے اردو زبان وادب کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔